

۱
اردو غزل

مع
انتخاب

از
ڈاکٹر یوسف حسین خاں
صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ سرکار عالی
حیدر آباد (دکن)

مطبعہ
اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد

انتساب

میں ان اوراق کو امام غزل مولانا فیض الحسن حسرت موہانی
کی خدمت گرامی میں بطور نذر عقیدت پیش کرنے
کی عزت حاصل کرتا ہوں۔

یوسف حسین خاں

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۶۴	سید محمد میر اثر	۲۵۰	اردو غزل
۲۶۵	شیخ غلام ہمدانی معصی	۲۲۹	انتخاب غزلیات
۲۸۲	خواجہ میر حسن، حسن	۲۳۰	ولی اور نگ آبادی
۲۸۳	جعفر علی حسرت	۲۳۲	سراج اور نگ آبادی
۲۸۳	شیخ قلندر بخش جرأت	۲۳۳	شاہ مبارک آبرو
۲۹۰	میراث، اللہ خاں انشا	۲۳۴	مرزا جان جاناں مظہر دہلوی
۲۹۱	شیخ ابراہیم ذوقی	۲۳۵	شاہ حاتم
۲۹۴	اسد اللہ خاں غالب	۲۳۶	میر عبدالحی تابان
۳۱۳	بہادر شاہ ظفر	۲۳۶	محمد امان منشا
۳۱۴	میر مہدی مجروح	۲۳۶	میر محمدی بیدار دہلوی
۳۱۶	نعتی صدر الدین آزر دہ	۲۳۸	میر تقی میر
۳۱۷	مومن خاں مومن	۲۶۰	مرزا محمد رفیع سودا
۳۲۵	نسیم دہلوی	۲۶۵	خواجہ میر درد
۳۲۷	آتش لکھنوی	۲۶۹	سید محمد میر سوز
۳۳۰	شیخ امام بخش ناسخ	۲۷۱	شیخ قیام الدین قائم
۳۳۲	برق لکھنوی	۲۷۲	انعام اللہ خاں یقین
۳۳۳	جلال لکھنوی	۲۷۳	خواجہ احسن اللہ بیان

۳۵۳	داغ دہلوی	۳۳۵	صبا لکھنوی
۳۶۲	میر مظفر علی خان آسیر لکھنوی	۳۳۶	ماہ لکھنوی
۳۶۴	غشی میر احمد آسیر مینائی	۳۳۷	تسلیم لکھنوی
۳۶۵	خواجہ الطاف حسین حالی	۳۳۸	صفیر بکرای
۳۶۶	سید علی محمد شاد عظیم آبادی	۳۳۹	مرزا رحیم الدین جیا
۳۶۹	رضا علی وحشت	۳۴۰	خواجہ محمد وزیر وزیر
۳۸۰	درداؤ کر حسین نواب لکھنوی	۳۴۱	ضیائی بیگم ضیائی
۳۸۳	حافظ جلیل حسن جلیل مانگڑی	۳۴۲	مشر شکوہ آبادی
۳۹۲	شوکت علی خان قافی	۳۴۳	نواب مصطفیٰ خان شیفتہ
۴۰۱	سید فضل الرحمن حسرت موہانی	۳۴۴	مائل دہلوی
۴۱۹	جگر مراد آبادی	۳۴۵	زکی دہلوی
۴۲۶	اصغر گوندوی	۳۴۶	میر حسین تسکین
۴۳۴	اقبال	۳۴۷	سید ظہیر الدین ظہیر
۴۳۶	زراق گورکھپوری	۳۴۸	عبد العظیم آسی
۴۴۱	جوش ملیح آبادی	۳۴۹	یاس شاگرد مومن
۴۴۳	زیر خود دہلوی	۳۵۰	وحشت شاگرد مومن
۴۴۴	مرزا حفیظ علی خاں اثر	۳۵۱	نظام شاہ نظام رامپوری
۴۴۵	آرزو لکھنوی	۳۵۲	محمد رفیع علی خان ناتھ رامپوری
۴۴۶	آدی مچھلی شہری	۳۵۳	گت ناخ رامپوری
۴۴۷	سعید احسن جذبی	۳۵۴	امانت لکھنوی
۴۴۸	مرزا عیسیٰ لکھنوی	۳۵۵	رنید لکھنوی
۴۴۹		۳۵۶	شکی دہلوی

دیباچہ

۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں مولوی مرزا فرحت افشار بیگ مرحوم کی غزلیں پیش کرنے والے اردو مجلس (حیدرآباد دکن) کے جلسوں میں اردو غزل پر تین مضمون علیحدہ علیحدہ پڑھے تھے۔ بعد میں ان تینوں مضمونوں کو ایک جگہ مرتب کر لیا اور ان میں ترمیم و اضافہ بھی کیا گیا۔ اس کے ساتھ قدامت کے زمانے سے لے کر عہد حاضر تک کے مشہور غزل گو شاعروں کے کلام کا انتخاب کیا تاکہ جو خیالات پیش کئے گئے ہیں ان کی مزید وضاحت ہر دور کے شاعروں کے کلام سے ہو جائے۔

اردو غزل پر جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ عام ڈگر سے ذرا الگ ہٹ کر ہے۔ اگرچہ یہ ابتدائی کوشش ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر دوسرے حضرات نے جو اس کام کے لئے مجھ سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں ان اصولوں پر اپنی تحقیق جاری رکھی جو پیش کئے گئے ہیں تو ہمارے تنقیدی ادب میں قابل قدر اضافہ ہوگا۔

اس کتاب کا مسودہ میرے پاس تقریباً دو سال سے تیار تھا لیکن شمالی ہند اور پھر دکن میں ان دنوں میں جو حالات پیش آئے ان کے باعث طباعت کی نوبت نہ آ سکی۔ لیکن اب مولوی عبدالوہاب صاحب مالک اعظم انسٹیٹیوٹ کی غیر معمولی دلچسپی اور علم دوستی ان اوراق کی طباعت کا موجب ہو رہی ہے جس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں فقط

یوسف حسین خان

حیدرآباد (دکن)

یکم دسمبر ۱۹۳۸ء



اُرُو غزل

از

ڈاکٹر یوسف حسین خاں - خیدرآباد (دکن)

گزشتہ دو سو برس میں میر صاحب کے زمانے سے لے کر حسرت و جگر کے موجودہ دور تک اُرُو غزل کے اسلوب میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن اس کی بنیادی حقیقت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔ اس سے صاف طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ صنف سخن اپنی اصلی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف حالات سے مطابقت کی صلاحیت رکھتی ہے جو اس کے جان دار ہونے کی دلیل ہے۔ ہر غزل گو شاعر کے کلام میں ہمیں ایک قسم کی مخصوص فضا ملتی ہے جو اس شاعر کی داخلی کیفیات اور ان تمدنی احوال کا بھج ہوئی ہے جن میں اس نے نشوونما پائی ہے۔ حسرت و جگر کے ہاں حسن و عشق کے معاملات کا اظہار اُس سے ایک حد تک مختلف ہے جو ہمیں میر و غالب و مومن کے ہاں ملتا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو دنیا کی ہر چیز ادلتی بدلتی رہتی ہے۔ آج ہمارا لباس، ہماری معاشرت، اور طرز فکر و احساس وہ ہیں جو اگلے زمانے کے لوگوں کا تھا۔ ہمارے موجودہ دور کا غزل گو شاعر بعض اوقات حسن و عشق کو تجربیدی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے جس کی مثال اُرُو کے ابتدائی یا درمیانی دور کے شاعروں کے یہاں نہیں ملتی۔ وہ اب احساس

جہاں کو حیثیت و کائنات کے سمجھنے کے لئے بطور قدر استعمال کرتا ہے جس سے اس کے پیشرو بڑی حد تک نابالغ تھے اور اگر واقف تھے تو باطل مبہم طور پر۔

پہلی نظر میں معلوم ہوتا ہے کہ غزل گو شاعر آج سے دو سو برس پہلے جس مخموم اور افسردہ آواز سے حسن و عشق کی داستان بیان کر رہے تھے اسی کی تقلید اب بھی ہو رہی ہے۔ گویا آرٹ کی تخلیقی آزادی سلب ہو چکی۔ وہی چبے چبانے والے ہیں جنہیں برابر چبایا جا رہا ہے۔ چاہے ان میں کچھ مزہ طے یا نہ ملے۔ وہی شہد و شراب، زلف و گیسوئے و میخانہ اور شمع و پروانہ کی داستان ہے جو ذرا سے لفظوں کی الب پھیر کے ساتھ صدیوں سے بیان ہوتی رہی ہے اور آج بھی بیان کی جا رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ غزل کے رموز و علامات میں کوئی فرق نہیں آیا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان کی توجیہ بھی وہی ہے جو صدیوں پہلے تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان رموز و علامات کی توجیہ زندگی کے ساتھ ساتھ اس مرحلے میں بہت کچھ بدلتی رہی ہے۔ شاعری نے دنیا میں ہر جگہ لوگوں کے بدلتے ہوئے شعور و احساس کا ساتھ دیا ہے تاکہ وہ فہمی زندگی سے بے تعلق نہ ہو جائے۔ غزل کا آرٹ بھی کوئی آرٹ نہیں کہ جہاں تھا وہیں رہے۔ زندگی کی طرح وہ حرکت اور نمو میں رہا ہوا ہے۔ اسی واسطے اس کی معنی آفرینیوں کی کوئی حد نہیں علم و حکمت کی ترقی کے ساتھ چوں جوں ذہن کی جلا بڑھے گی اس کا اثر ضرور ہے کہ ہمارے احساس و تخیل پر پڑے۔ جب احساس و تخیل متاثر ہوں گے تو غزل کے حرکات بھی بدلیں گے اور اس کے رموز و علامات کی توجیہ بھی بدلے گی اور اس طرح نئے نئے خیالی اور جذباتی حقایق کی باز آفرینی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ گزشتہ دو سو سال کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ غزل کے بظاہر بندھے ہوئے محاوروں اور اشاروں میں معانی کی کس قدر وسعتیں پنہاں ہیں۔ ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ غزل نگاروں کے پُرانے تجربوں کی نئی نگاہیں آئندہ بھی تخلیق ہوتی نہیں گی اور اس طرح ہمارے ادبی شعور کی نشوونما چاری رہے گی۔
 میں یہ مانتا ہوں کہ اس وقت ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں غزل کو وہ حسن قبول حاصل نہیں رہا جو نظم کو حاصل ہے۔ جدید سفری تعلیم کے اثر سے ہمارے یہاں نظم نگاری کو رواج ہوا اور پچھلے پچاس سال میں اس میں قابل قدر اضافے ہوتے رہے ہیں۔ حالی اور اقبال نے اس کو اپنے اصلاحی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ دونوں کو اپنی قوم کو پیغام دینا تھا جس کے لئے یقیناً نظم کا وسیلہ زیادہ موثر اور مفید تھا۔ قوموں کو جو درس مل دیا جاتا ہے وہ اشاروں انہیوں میں نہیں دیا جاسکتا۔ وہ وضاحت اور تفصیل اور تکرار چاہتا ہے۔ چنانچہ یہ کام غزل کے مقابل میں نظم ہی کے ذریعے سے اچھی طرح انجام پاسکتا تھا۔ میں اس موقع پر دیدہ و دانستہ اس جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ہمارے ادب میں غزل کو ترجیح دی جانی چاہیے یا نظم کو۔ دراصل دونوں اپنا اپنا مقام اور اپنا اپنا حق رکھتی ہیں جس سے انہیں محروم نہیں کرنا چاہیے۔ جس وقت سے مولانا حالی نے ”مقدمہ شعر و شاعری“ میں غزل پر نکتہ چینی کی اس وقت سے آج تک برابر وہی پُرانے اور فرسودہ دلائل غزل کے خلاف لائے جا رہے ہیں ان سب دلائل کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ غزل زندگی کے نئے تقاضوں کی حریف نہیں ہو سکتی اس واسطے کہ اس صنف سخن میں خیال کو اظہار کی پوری آزادی نہیں ملتی۔ اس کی ریزہ کاری کلام کے منطقی تسلسل کو برقرار نہیں رکھ سکتی جس کا نتیجہ خیالات کا انتشار ہے۔ غرض کہ غزل اب اعتبار اور قدر کی چیز نہیں رہی لہذا اس کا ختم ہو جانا ہی اچھا ہے۔

مولانا حالی نے غزل پر جو نکتہ چینی کی وہ اصلاحی محرکات کے تحت تھی کہ ادبی مقاصد کے تحت۔ انہیں غزل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ یہ حسن و عشق کے معاملات کی شاعری ہے۔ عشق عقل اور اخلاق کو خراب کرنے والی چیز

ہے۔ اس سے جتنا بھی اجتناب کیا جائے اتنا ہی قومی مصلحت کی ترقی کا موجب ہو گا کہ یہ بیکاری کا مشغلہ ہے۔ لیکن یہ نقطہ نظر سطحی ہے۔ مولانا حالی کی نیک نیتی اور اچھے اخلاص میں شبہ نہیں۔ لیکن اس ضمن میں ان کا مشورہ قابل قبول نہیں۔ یہ بات ہمارے ادبی مزاج کی صحت پر دلائل کرتی ہے کہ مولانا حالی کے مشورہ کو قبول نہیں کیا گیا۔ اگر قبول کیا جاتا تو ہماری زبان حسرت اور جگر اور خانی اور صحت کی زمرہ بنجیوں سے محروم رہتی جو ایک ناقابل تلافی نقصان ہوتا۔ ۷

در اصل معاملہ اتنا آسان اور سادہ نہیں جتنا کہ غزل کے معترضین نے سمجھ رکھا ہے غزل کی جڑ میں ہماری تہذیبی اور اخلاقی زندگی کی گہرائیوں میں پیوست ہیں۔ انھیں اکھاڑ پھینکا سہل نہیں۔ مولانا حالی اردو زبان و ادب کی اور عام طور پر مسلمانوں کی قومی زندگی کی اصلاح چاہتے تھے۔ اصلاحی جوش میں انہوں نے غزل کے نقابوں جن جن کو دکھائے اور قومی اخلاق کو سدھارنے کے لئے سادہ اور عام ہم نظمیں لکھیں اور دوسروں کو لکھنے کی دعوت دی۔ پھر ان کے پیش نظر غزلوں میں بھی خاص طور پر وہ تھیں جن سے فحش اور رکاکت کی ترویج کا اندیشہ تھا۔ لیکن کیا سب غزلیں ایسی ہوتی ہیں؟

عیب مئے جملہ بگفتی ہنرشس نیر بگو

نفی حکمت کن اذ بہر دل مائے چند (حافظ)

اگر مولانا حالی آج زندہ ہوتے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ

مولانا حالی کی رباعی ملاحظہ ہو۔

پے عشق طیب دل کے بیماروں کا یا خود ہے یہ گھر ہزار آزاروں کا

ہم کچھ نہیں جانتے پراتی ہے خبر اک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا

اس رباعی میں مولانا روم کے اس شعر کی ترویج کی گئی ہے۔

شاوہ باش اے عشق خوش بود اے ما اے طیب جملہ علت ہائے ما

پچھلے چند سالوں میں فحش کی ترویج اور اس کی قدر افزائی شر اور نظم کے توسط سے زیادہ ہوئی ہے۔ غزل کے ذریعے مولانا حالی کی رائے کو آج ویلے کے طور پر پیش کرنا درست نہیں۔ وہ محض عارضی اور ہنگامی حالات کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے غزل کے جو نقائص بتائے ہیں ان میں سے بعض کو غزل کے حامی تسلیم کرتے ہیں۔ وہ غزل جو محض قافیہ بندی کے لیے ہو جو فخر نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہ غزل صرف اعلیٰ درجہ ہی کی ہونی چاہیے۔ نظم اوسط درجے کی گوارہ کرنی جاسکتی ہے لیکن غزل نہیں کی جاسکتی۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ "بندش بہ غایت بند و پستش بہ غایت پست" غزل پر ہو ہو عداوت آتا ہے۔ غزل ہمیشہ بند ہی ہوگی، اگر واقعی وہ تفرل کے آداب کی حامل ہے۔ اوسط درجے یا ادنیٰ درجے کی غزل مکر وہ چیز ہے جس سے گھن آتی ہے، ادبی لطف حاصل ہونا تو کجا۔ اس کی غلط تعبیر و توجیہ کا اندیشہ رہتا ہے جو ممکن ہے بعض طبائع پر برا اثر ڈالے۔ غزل کے پست ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ شرو سخن سے دلچسپی رکھنے والے پہلے پہل اسی کو اپنا تختہ مشق بناتے ہیں۔ عروض کی چند کتابیں پڑھیں اور اپنے آپ کو غزل کہنے کا اہل سمجھنے لگے کچھ عرصہ قبل کی بات ہے کہ غزل گو ہونا علم مجلسی کا جز تصور کیا جاتا تھا۔ اصلاً لفظی اور ضلع جگت ذہانت کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ امراء کے طبقہ میں خاص طور پر اس کا رواج تھا۔ جس طرح گھر کے انتظام کے لئے ایک داروغہ رکھا جاتا تھا اسی طرح غزلی کی اصلاح کے لئے ایک استاد رہتے تھے جو اکثر کوئی پٹے والوں پر رگ ہوتے تھے جنھیں اصلاح شعر کے معاوضہ میں کھانا اور کپڑا میسر آ جاتا تھا۔ غدر سے پہلے اور غدر کے کچھ عرصہ بعد تک غزل لکھنے والے امیر زادے اور ان کی غزلوں پر اصلاح دیتے والے استاد شمالی ہند کے ہر شہر اور قصبے میں موجود نظر آتے تھے۔ ان سب بے فکروں کے لئے شعر و سخن بیکاری اور خوش وقتی کے مشغلہ سے زیادہ وقت نہ رکھتا تھا۔ یہ زمانہ ہماری اجتماعی اور جذباتی زندگی کی انتہائی بے مقصدی اور انتشار کا

نہا نہ تھا جس سے ریاست و معیشت کی طرح ادب بھی متاثر ہوا۔ کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ اسے کدھر جانا ہے اور کس کے ساتھ جانا ہے؟ ہماری قوم کی حالت غالب کے تھکے بارے مسافر کی سی تھی جس کی زبانی اس نے یہ شعر کہلوا دیا۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہسبر کو میں

اس آڑے وقت میں ہماری خوش قسمتی تھی کہ سرسید اور مولانا حالی جیسے رہبر ملے۔ ان کے دلوں میں درو اور نیتوں میں خلوص تھا۔ مولانا حالی نے ادبی اصلاح کا ثیر اٹھایا۔ یہ ان کا انتہائی اشار تھا کہ باوجود اعلیٰ درجہ کے تغزل کی صلاحیت کے انھوں نے نظم کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ ان کے تغزل کا اندازہ چند شعروں سے ہو سکتا ہے۔

کس طرح اگلی لگاؤ کو بناؤ سمجھوں
خط میں لکھا ہے وہ القاب جو عنوان میں نہیں

بے قراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ جبر میں نہیں

دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف پوچھ
ایسے الجھاؤ تری کا کل بیجاں میں نہیں

ہے جستجو کہ حوس ہے خوب ترک کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو سیش عشق
رکھی ہے آج لذت زخمِ جگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترک عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

یہ آخری شعر مولانا حالی کے حقیقی اندرونی احساس کی نمازی کرتا ہے۔

انھوں نے ترک عشق کی جو دعا کی وہ اویری دل سے تھی۔ اسی لئے بے اثر رہی۔ عشقیہ شاعری کی ترقی رکھنے والی نہ تھی نہ رکی۔ چنانچہ آج اس صنف سخن کا ملک زبردست علم دار آزار عقل اور مداوائے عشق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مطلق پس و پیش نہیں کرتا۔

ارباب ہوش جتنے ہیں بیاضعل ہیں۔

ان کے لئے ضرور مداوائے عشق ہے (حسرت)

مولنا خاں اور ان کے بعد اقبال نے اردو نظم نگاری کو اس اعلیٰ مرتبہ پر پہنچایا جس پر ہم اب اس کو دیکھ رہے ہیں لیکن غزل بھی اس عرصے میں ہنسی نہیں رہی۔ غالب کے بعد داغ، امیر، شاد، حسرت، فانی، نسف اور جگر نے اپنے اپنے انداز میں اسے سنورا اور نکھارا اور اس کے مقام کو بلند کر دیا۔

ہمارے زمانے کے ترقی پسند نوجوانوں کو غزل کے مقابلے میں نظم اس لئے بھی پسند ہے کہ اس کا لکھنا نسبتاً آسان ہے۔ غزل جتنی ریاضت چاہتی ہے وہ ان کے بس کی بات نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس طبقہ میں غزل کی پابندیاں اور آداب مقبول نہیں اس لئے کہ انھیں برتنے کا ان لوگوں میں جیسا چاہئے ویسا سلیقہ اور ذوق نہیں۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اپنے ادب اور اپنی ذہنی روایات سے ناواقف ہیں۔ وہ مغربی ادب کی ریش میں آدا اور عاری نظم کو اردو میں بھی رواج دینا چاہتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ ہر زبان کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ ہر صنف سخن کو ہر زبان میں نہیں برتنا جاسکتا اور نہیں برتنا چاہئے تخلیقی ادب ذوقی چیز ہے۔ جہاں ذوق مجروح ہو گا وہاں تخلیقی ادب تخلیقی نہیں رہے گا بلکہ کسی دوسرے کی نقالی ہوگی جس سے ادب کی سیرت مسخ ہو جائے گی۔ اندیشہ ہے کہ ترقی پسند ادیبوں کی یہ ناپختگی اور بے راہ روی ان کی رفتار ترقی کے لئے زنجیر پائے بن جائے اور ان کے تخلیقی مساعی بے اثر ہو کر نہ رہ جائیں جو کسی تحریک کے لئے سب سے بڑی افتاد ہے۔

نظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ادب کے اثر سے ہمارے یہاں جو نئے رجحانات پیدا ہو رہے ہیں وہ غزل کے لئے ناموافق ہیں۔ لیکن میرا خیال

ہے کہ اس صورت حال کے خلاف جلد رد عمل رونا ہونا اور ہمارا ادبی ذوق ہمیں بہت دنوں تک ادھر ادھر بھٹکنے نہیں دے گا۔ جس طرح مغربی تعلیم کے اس ملک میں رائج ہونے پر مشرقی علوم و فنون ناقداری کے نذر ہو گئے لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان کے صیغ مقام کو تسلیم کیا گیا۔ اسی طرح مغربی ادب کے زیر اثر ممکن ہے غزل نگاری کو عارضی طور پر روز بد دیکھنا پڑے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ غزل اس جو کھم کو جھیل جائے گی۔ اس میں اتنی قوت حیات موجود ہے کہ تھوڑا بہت ظاہری روپ بدل کر پھر اپنی گدی پر براجمان ہو جائے۔ ناکام اور ناول کی طرح نظم بھی عوامی ضروریات پوری کرتی رہے گی اور اس طرح ہمارے ادب میں نظم اور غزل دونوں کو اپنا اپنا مقام مل جائیگا لیکن عوامی ضروریات کو پورا کرنا کے لئے نظم کو غزل سے موسیقیت کا رس مستعار لینا ہوگا۔ ورنہ خود اس کی قبولیت خطرہ میں پڑ جائے گی۔ ہم زندگی کی تاریکیوں سے موسیقی کے ذریعہ ہی گریز کر سکتے ہیں۔ اور شعر تو بغیر موسیقی کے بقول غالب ”مینائے بے شراب و دل بے سوائے گل“ سے زیادہ وقت نہیں رکھ سکتا۔ غرض کہ مجھے غزل کا مستقبل اس کے امکانات کی وجہ سے روشن نظر آتا اس لئے کہ اس صنف سخن سے ہمارے بعض اہم اور دور رس ادبی اور جذباتی تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہے غزل ہمارے ادبی مزاج میں اتنی دخیل ہو چکی ہے کہ اس کے قطعی طور پر بے تعلق ہو جانا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو پچھلے پچیس تیس سال میں غزل نے نظم پر اور نظم نے غزل پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ غزل کی ریزہ کاری اگرچہ حقیقت میں کوئی عیب نہیں لیکن پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مہد جدید کی زندگی کا رجحان کلام میں تسلسل کا متوجہ رہتا ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ غزل میں تسلسل پیدا کیا جائے گا اور منفرد اشعار کے پس منظر میں وحدت احساس کی کار فرمائیاں بڑھتی جائیں گی اور اس کے ساتھ ساتھ نظم بھی اپنے

اندر رمز و کنایہ اور موسیقیت کے ذریعہ تغزل کی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے گی اور اس طرح دونوں اصناف ایک دوسرے سے قریب آجائیں گی۔ مثال کے طور پر اس زمانے کے اردو کے دو سب سے بڑے شاعروں کے کلام کو دیکھئے جن میں سے ایک نظم کا اردو سر غزل کا بادشاہ ہے۔ ان سے میری مراد اقبال اور حسرت ہیں۔ اقبال کی نظم میں تغزل کی خوبی اور حسرت کی غزل میں نظم کا معنوی تسلسل صاف طور پر نظر آتا ہے۔ چند مثالوں سے میں اس کی وضاحت کروں۔

اقبال کی ایک ابتدائی غزل نما نظم لیجئے۔ ہر لفظ تغزل میں رچا ہوا ہے۔ کبھی اے حقیقت منظر نظر آجاس مجازیں کہ نزاروں سجدے تڑپے ہیں میری حسین بایں تو بچا بچا کے نہ رکھ اے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ سار میں نہ کہیں جہاں میں اٹلی جو اماں ملی تو کہا ملی مے جرم خانہ خراب کو ترے خوب بندہ نوازیں نہ وہ عشق میں ہیں گرمیاں نہ وہ جن میں میں خیل نہ وہ غنوی میں تڑپے ہیں نہ وہ خمبہ نہ لکڑیاں جوں ہر سجدہ ہو کبھی تویں سے آنے لگی صدا ترا دل تہے صنم آستان مجھے کیا ملے لکھا نازیں اقبال کی آخری زمانے کی ایک دوسری غزل نما نظم بھی ملاحظہ ہو۔ رمز و

ایما کی طلسمی کیفیات کا کمال دکھایا ہے۔

مجھے یاد کیا نہیں ہے مے دل کا وہ زمانہ وہ ادب گہ محبت ! وہ نگہ کا تادیانہ بتان عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسہ میں نہ ادائے کافرانہ ! نہ تراشش آذرانہ رنگ تاک منتظر ہے تری باتیں کرم کی کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مے مغانہ میرے ہم صیغہ سے بھی اثر بہار سمجھے انھیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ حسرت کی عاشقانہ اور شاعرانہ زندگی کی ابتدائی کوشش ملاحظہ ہو۔

اس نظم کا غزل میں جرات کے انداز کی تقلید کی گئی ہے۔ آپ چاہیں تو اس کو عشقیہ محاکات کہہ سکتے ہیں جس میں عہد ہوس کے افسانے کو من و عن ہمارے سامنے دہرایا ہے اور مزے لے لے کر دہرایا ہے۔

ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے
 تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگنا یاد ہے
 اور ترا غرنے سے وہ آنکھیں اڑنا یاد ہے
 اور ترادانتوں میں وہ آنکھی دہانا یاد ہے
 اور دوپٹے سے تیرا وہ منہ چھپانا یاد ہے
 اور ترا ٹھکرا کے سر وہ مسکرانا یاد ہے
 حال دل باتوں ہی باتوں میں خٹانا یاد ہے
 سچ کہو کچھ تم کو بھی وہ کارخانایا یاد ہے
 وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے
 وہ ترا کوٹھے پر ننگے پاؤں آنا یاد ہے
 اپنا جانا یاد ہے ترا بلانا یاد ہے
 ذکر دشمن کا وہ باتوں میں اڑنا یاد ہے
 جب مائینا تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے
 مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے
 اور میرا وہ پھیڑنا وہ گدگدانا یاد ہے
 آج تک عہد ہوس کا وہ فسانا یاد ہے
 یہ غزل ۱۹۱۶ء میں لکھی گئی تھی۔

چمکے چمکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
 باہزاران اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق
 بار بار اٹھنا اسی جانب بنگاہ شوق کا
 تجھ سے کچھ ملنے ہی وہ بیباک بھانا یاد ہے
 کھینچ لینا وہ میرا پردے کا کونا دفعتاً
 جان کر سوتا تجھے وہ قصد پا بوسی میرا
 تجھ کو جب تہنا کبھی پانا تو ازراہ لحاظ
 جب سوا میرے تہا کوئی دیوانہ نہ تھا
 غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
 آگیا گر وصل کی شب بھی کہیں ذکر فراق
 دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لئے
 آج تک نظروں میں ہے وہ صحبت ازونیا
 میٹھی میٹھی چھیڑ کر باتیں زالی پیار کی
 دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سونا زے
 چوری چوری ہم سے تم آکر ملے تھے جن جگہ
 شوق میں ہندی کے وہ بیدرت پابونا تیرا
 باوجود ادوائے اتفا حسرت مجھے

حسرت کی ایک حال ہی کی غزل ملاحظہ کیجئے جس میں اعلیٰ تنزل کے ساتھ
 نظم کے سارے انداز موجود ہیں۔ یہ غزل جزیرہ قبرص (سائپرس) کی ایک
 خاتون کو دیکھ کر جو جہاد پر حسرت کے ہم سفر تھیں لکھی گئی ہے۔

رعنائی میں حصہ ہے جو قبرص کی پری کا
 رفتار قیامت یونہی کیا کہ تھی بھلاں یہ
 نظارہ ہے سمندر اسی جلوہ گری کا
 اک طرہ ہے فتنہ تری نازک کمری کا

پوشاک میں کیا کیا بھری نقش ہیں دلکش
 باعث نہ یہی شوق کی ہوں جامہ درسی کا
 لاریب کہ اس حسن ستمگار کی سرخی
 موجب ہے مے زہد کی عصیان نظری کا
 باوصف تلاش انکی خبر کچھ بھی نہ پا کر
 کیا کہیے جو ہے حال میری بے خبری کا
 جب سے یہ سنا ہے کہ وہ ساکن ہیں بس کے
 عالم ہے عجب شوق کی آشفقہ سری کا
 ساتھ ان کے جو ہم آئے تھے بیڑتِ حیرت
 یہ روگ نتیجہ ہے اسی ہمسفری کا
 یہ غزل ۱۹۳۹ء میں لکھی گئی تھی جبکہ حسرت مشرق وسطیٰ کے ملکوں
 سے ہوتے ہوئے پہلی مرتبہ یورپ گئے تھے۔ لوگ کہتے ہیں بڑھاپے کے کلام
 میں شوخی باقی نہیں رہتی۔ یہ غزل اس خیال کی تردید کرتی ہے۔ قیس چالیس
 سال قبل عشق و محبت کی جو چنگاری حسرت کے دل میں روشن تھی آج بھی معلوم
 ہوتا ہے وہ ویسی کی ویسی دھک رہی ہے۔ رنگ اور نسل کے اعتبارات جو
 شلخص و فاشاک ہیں اس کے آگے ایک دم کو نہیں ٹھہر سکتے۔ وہ فرق امتیاز
 کرتی ہے لیکن اپنے بنائے ہوئے معیاروں سے۔ اس کی انسانی دستوں کی
 کوئی انتہا نہیں۔ یہی جذبہ محبت موسیقی میں حل ہو کر تخلیق حسن کا موثر ذریعہ بن
 جاتا ہے اور یہی تغزل کی جان ہے۔

اگر آپ تغزل کا تجزیہ کرنے بیٹھیں تو بعض باتیں صاف طور پر نمایاں نظر
 آئیں گی جن کی وجہ سے دوسرے اصناف شعر سے اسے الگ کرتا ہوگا۔ غزل کی
 ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حد درجہ کی درون بینی پائی جاتی ہے۔
 غزل گو شاعر کچھ کہتا ہے اپنے آپ میں ڈوب کر کہتا ہے۔ اس کا حیات و
 کائنات کا نقطہ نظر خالص موضوعی اور داخلی ہوتا ہے۔ وہ اپنے دل کی
 دنیا کی سیر میں ایسا منہمک ہوتا ہے کہ اسے اوپر نظر اٹھانے اور خارجی عالم
 کا مشاہدہ کرنے کی فرصت اور ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی ذات میں سب
 کچھ پاتا ہے۔ اس کا تخیل اپنی گلی کاریوں سے اس کے دل کو ایسے ایسے
 حسین پیکروں سے آباد کر دیتا ہے کہ پھر اس کو ادھر ادھر جھانکنے کا محفل کی

ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اگر کبھی وہ خارجی عالم کو دیکھتا ہے تو اس طرح نہیں دیکھتا جیسے دوسرے دیکھتے ہیں بلکہ اپنے مخصوص نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ اس کے وجود کا ثبوت انسانی شعور میں تلاش کرتا ہے اور اپنی ذات کو اس کے علم کا ماخذ اور ہتھیار تصور کرتا ہے۔ غزل گو شاعر کے نزدیک تخیل ہی اصل حقیقت ہے جس کی مدد سے اس کے دل کی دنیا میں ہمیشہ رونق اور چہل پہل رہتی ہے۔ اس کی درون بینی کا یہ اقتضا ہوتا ہے کہ وہ اپنے دل سے آپ گفتگو کرے اور جو تاثرات مختلف اوقات میں اس کے دل پر گزریں انہیں شعر و نغمہ کا رنگین لباس پہنا دے۔ تخیل اور جذبہ جب موسیقی کی رنگین قبا زیب تک کر کے جلوہ گر ہوتے ہیں تو شاعر کی روح اپنے تخیلی پیکروں سے ہم آغوش ہو کر رقص کرنے لگتی ہے۔ خیال موسیقی میں ایسا حل ہو جاتا ہے کہ اس کو اس سے جدا کرنا محال ہو جاتا ہے۔ شاعر اپنے اندرونی تجربے کو لفظوں کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے جو بس ایک حد تک اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ ان کی منطقی ترتیب جذبہ کے اظہار کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ ہماری زبان چاہے وہ کتنی ہی بھی ہوئی اور ترقی یافتہ کیوں نہ ہو جائے اس میں یہ صلاحیت کبھی بھی نہیں آسکتی کہ ان نغموں کو ظاہر کرے جو دل کی وادیوں میں گونجتے ہیں غزل گو شاعر رمز و علامتوں کی مدد سے اس کوتاہی کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اپنے آپ میں ایسا ڈوبا رہتا ہے کہ اس کو یہ بھی پروا نہیں ہوتی کہ دوسرے اس کے مافی الضمیر کو سمجھتے ہیں یا نہیں۔ وہ جو کہتا ہے دوسروں کے لئے نہیں کہتا بلکہ اپنے من کی موج کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ غالب کو اس کی مطلق پروا نہ تھی کہ دوسرے اس کے شعروں کو بے معنی سمجھتے تھے۔ خود اس کے دل میں ان کے معنی تھے اور اس سے زیادہ اسے کیا جا سکتا۔ نہ سائیش کی سناٹا صلہ کی پروا مگر نہیں ہے مے اشعار میں معنی نہ تھی دوسری جگہ کہا ہے کہ دنیا والے میرے کلام کو بھلا کیا سمجھیں گے اور

میرے دل کے جذباتی تجربوں میں کیسے شریک ہو گئیں گے۔ مجھے اگر اپنے کلام کی تنقیدی بہت داد مل سکتی ہے تو وہ روح القدس (جبریلؑ) سے مل سکتی ہے۔ وہ بھی اگرچہ میرے ہم زبان نہیں لیکن عالم اسرار کے رازدار کی حیثیت سے وہ تھامذہ رحمن کی قدر افزائی کر سکتے ہیں۔

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی روح القدس اگرچہ مرا ہمزبان نہیں شعر اور خاص کر غزل کا شعر چنانچہ اندرونی تجربہ کا اظہار ہے اس لئے ضرور ہے کہ وہ فطرت میں کسی نہ کسی قسم کا اضافہ کرے اور اگر وہ ایسا کرنے میں قاصر ہے تو تجربہ کا اچھوتا پن مشتبہ رہے گا تخلیقی تخیل کی بدولت غزل کے شعر میں تجربہ حیات کے کسی خاص لمحہ کا اظہار ضروری ہے جو شعور اور محنت شعور کے تانے بانے کی طاوٹ سے بنتا ہے۔ زندگی کے اندرونی تجربے اور اس کی متعلقہ کیفیات کو توسیعی میں سمجھ کر تاثرات مخمّر انداز میں بیان کرنا غزل کے شاعر کا مقصد ہوتا ہے۔ دل کے اندرونی تجربوں میں تخیل اور جذبہ کی ایسی آمیزش ہوتی ہے کہ وجدان ہی ان کیفیات سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے اور انہیں کا اظہار شعر غزل میں ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو دائمی طور پر زندگی کے طلسماتی عنصر کی تلاش رہتی ہے۔ فطرت کے طلسم دل کے طلسم کے آگے پہنچ ہیں۔ انسانی دل سب سے بڑا طلسمات کا مخزن ہے اس کے اندر عجیب عالم پیدا ہیں۔ غزل گو شاعر اپنے لہزہ کے شے صوفیوں سے انسانی دل کے طلسماتی پیکروں کو ان کو ابدی زندگی سے بیدار کرتا ہے۔ جب ذہن لہزہ کے طوفان کو تباہ میں لاتا اور اس کو خاص اصولی اور خاص اصول کا پابند کرتا ہے تو غزل کے شعر کی تخلیق ہوتی ہے۔ اسی واسطے غزل گو شاعر کے تجربوں میں طلسم وجدیہ آغوش و آغوش نظر آتے ہیں۔

غزل گو شاعر کی درون جینی کے اصلی عناصر تخیل اور جذبہ ہیں تخیل میں یہ قوت ہے کہ وہ طلسمی اور غیر مرئی حقائق کو یا یوں کہئے کہ ان حقائق کو جو حواس کی کوتاہی اور نارسائی کی وجہ سے پوری طرح محسوس نہیں ہوتے جیتی جاگتی شکل

اور پیچیدہ حقیقت ہے اور وہ ایسے اسباب پر منحصر ہوتا ہے جن پر عقل کو قابو نہیں ہوتا۔ اس کی تخلیقی اور اختراعی قوت معمولی اور ظاہری واقعات میں ایسے ایسے نکتے اور یاریکیاں تلاش کر لیتی ہے کہ عقل حیران و ششدر رہ جاتی ہے۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیے

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے (غالب)

رمز و ابہام کے طلسم سے غزل کے شعر میں تھوڑی بہت پیچیدگی لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہے جو اس صنف سخن کا عیب نہیں بلکہ خوبی ہے۔ زندگی خود بڑی پیچیدہ حقیقت ہے۔ اس کے اندرونی تجربوں کے اظہار میں اگر پیچیدگی آجائے تو یہ بات خلاف فطرت نہ ہوگی۔ اعلیٰ پایہ کے غزل نگار کی حیثیت سے میر صاحب نے اس حقیقت کو محسوس کیا تھا۔ ان کے ہاں زبان کی سادگی کے باوجود رمز کا اشکالی موجود ہے۔ فرماتے ہیں۔

دلف سا پیچیدار ہے ہر شعر ہے سخن میر کا عجب ڈھب کا
دوسری جگہ کہتے ہیں۔

میر صاحب کا ہر سخن ہے رمز بے حقیقت ہے شیخ کیا جانے

ایک آفت زمان ہے یہ میر عشق پیشہ پروے میں سارے مطلب اپنے ادا کرے

میر صاحب اپنی کنایہ نگاری کی اس طرح توجیہ کرتے ہیں۔

دہر کا ہو گنگ کہ شکوہ چرخ اس ستم گر ہی سے کنایت ہے

تخیل اپنی توجیہ اور تعبیر خود اپنے انداز میں کرتا ہے اس کے علاوہ اسے اور کوئی انداز پسند نہیں۔ وہ ان باتوں کو بھی جو عقلی طور پر پہلے سے ثابت ہیں اپنے طور پر اور اپنے رنگ میں بالکل دوسری طرح سے ثابت کرتا ہے۔

کی فلسفیانہ اور سائنٹیفک تعبیر و تعریف سنی ہوگی۔ ایک غزل گو شاعر اس کی توجیہ یوں کرتا ہے۔

اک لفظ محبت کا ادنیٰ یہ فائدہ ہے
سختے تو دلِ عاشق بیٹھے تو زمانہ ہے (جگر)

زمانہ کا تجربہ ہمیں اپنی باطنی زندگی میں ہوتا ہے اور انسانی خودی یا دل حقیقتِ اشیاء کی پیائش کا پیمانہ اور حیدرِ عظمیٰ ہے۔ گویا زمانہ کا تختِ دل کی کیفیت سے جدا نہیں۔ شاعر اپنے وجدانی ذوق کے ذریعے اس حقیقت کا راز ہم پر کس لطافت کے ساتھ منکشف کر دیتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس نے کیسے سیدھے سادے طریقہ پر کر دیا۔ نہ کسی فلسفیانہ موشگافی کی حاجت ہوئی اور نہ وہ منطقی استدلال کی بھول بھلیاں میں خود پھنسا اور نہ دوسروں کو پھنسایا۔ شاعر نے جو رمزی کیفیت پیدا کی وہ اس کے باطنی تخیل کا نتیجہ ہے نہ کہ حسی تجربہ کا۔ حسی تجربہ اس کے نزدیک محض چند علامتیں ہیں جنہیں وہ اپنے تخیل سے اندرونی تجربے میں تحلیل کر لیتا ہے۔ اس طرح منطقی استدلال سے تجربے کی دنیا میں جو سفر کی طواست لاحق ہوتی اس سے بچ کر وہ تخیل کی ایک ہی زقند میں منزل پر پہنچ گیا۔ پھر لطافت یہ ہے کہ سادے سفر میں نزاکت اور لطافت اس کے دامن سے وابستہ رہی۔ اس طرح اپنے دل کو تخیلی پیکروں سے آباد کر کے غزل گو شاعر حسنِ ازل کا جلوہ خود ہی نہیں دیکھتا بلکہ دوسروں کو بھی اس کی ایک ہلکا سی جھلک دکھا دیتا ہے۔ وہ اپنی تخیل نگاری کو حقیقت نگاری سمجھ کر محبور ہوتا ہے اس واسطے کہ تخیل ہی اس کے نزدیک اصل حقیقت ہے۔ خارجی فطرت کے حقائق سادہ حقائق سے زیادہ وقع نہیں۔ دیکھنے والے کی شعوی نظر ان سادہ اور بے رنگ حقائق کو رنگین بنا دیتی ہے۔

ہستی جسے کہتے ہیں اک سادہ حقیقت ہے رنگین نگاہوں نے رنگین بنا ڈالی (جگر)

انسان فطرت کی قدر کر سکتا ہے لیکن اس سے دلی محبت نہیں کر سکتا۔ فطرت کا جدید
 مغربی نقطہ ہمارے غزل گو شعرائے کئے ناقابل فہم ہے۔ فطرت کی توجیہ انسانی وجود
 سے علیحدہ ایک قسم کا رومانی خیال ہے جو خارجی حقیقت میں کمال پیدا کرنا چاہتا ہے
 غزل گو شاعر فطرت کے احساس سے محروم نہیں بلکہ وہ اس کو عادت دیکھنے اور
 برتنے کا عادی ہے۔ اس کے نزدیک فطرت کی اہمیت بس اتنی ہے کہ وہ انسانی عمل
 کا پس منظر ہیا کرتی ہے اس لئے وہ خود مرکز توجہ نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے فطرت کا
 ذکر اس کے ہاں غمنی طور پر آجاتا ہے۔ غزل میں فطرت بھی موضوع نہیں بن سکتی
 موضوع کا پس منظر ہو سکتی ہے۔ فطرت کے منازد دراصل نظم کا موضوع ہیں جو بیانیہ
 شاعری ہے۔ غزل انسانی دل کے لطیف جذبات و کیفیات کے لئے مخصوص
 ہے۔ ان کے اظہار میں تخیل کی باطنی توجیہ و تعبیر درکار ہے۔ تخیل ہی جذبہ کار ہوا
 ہے۔ غرض کہ یوں کہیے کہ غزل جذبہ کا بیان ہے تخیل کی زبانی نظم کہنے والا
 یہ پیچیدہ حقایق کو سادہ بنانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ خیال و تصور کو بکھرے بکھرے
 ٹکڑوں کی تفصیل بیان کرے۔ غزل گو شاعر جانتا ہے کہ احساس و تاثیر کی دنیا
 میں کھیاالی طور پر تجزیہ اور تحلیل ممکن نہیں۔ اس لئے وہ پیچیدہ حقائق کو پیچیدہ رہنے
 دیتا ہے اور ان کے اندرونی تجربوں کے لئے بجائے تشریح و تفصیل کے اجمال
 و ابہام کی زبان استعمال کرتا ہے۔ دوسرے فظوں میں یوں کہئے کہ وہ مخاطب اور
 حقایق کے اچھاؤ کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور اس سے بیگانہ ہو کر ستانہ وار
 آگے بڑھتا ہے۔ اس کا مقصد حقایق کی پیچیدگیوں کو سلجھانا نہیں بلکہ ان کا
 لطیف تاثر و احساس پیدا کرنا جو رمز و اشتباہ کا رنگ لئے ہوئے ہوتا ہے۔
 اسی لئے وہ اس کی پروا نہیں کرتا کہ اس کے بیان میں استدلال کی کوئی کڑی
 جھوٹی یا نہیں۔ پھوٹ گئی تو پھوٹ جائے۔ وہ اپنے آپ کو عقل سے زیادہ
 تاثر کا تابع فرمان خیال کرتا ہے۔ جذبات کی فرمان برداری اس کا طرہ امتیاز
 ہے۔ لطف یہ ہے کہ غزل گو شاعر کو اگھ بھرا، اگھ بھرا، ماتر جنہ منطق، استدلال،

۵۔ سہل اور اس کی سب لڑائیاں بھی موجود نہیں ہوتیں اس سہم اور وسیع حقیقت تک ہماری رہنمائی کر جاتی ہیں جس کی خصوصیت کا پتہ اس جذبہ ہی سے چل سکتا ہے جو انسانی دل میں اس کے اثر سے پیدا ہوتا ہے۔ غزل کے بعض اشعار گو سُن کر ایسے احساسات و جذبات پیدا ہوتے ہیں جو منطقی تعقل سے کہیں زیادہ گہرے اور پراسرار طریقے پر ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ یہ ربط منطقی تصورات کے ربط سے بالکل علیحدہ نوعیت رکھتا ہے اور باوجود غزل کی ظاہری ریڑھ کاڑھا کے ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عقل و ادراک کی تہ کے نیچے تحت شعور اور وجدان کی دنیا میں ان جذبات کا کارخانہ علیحدہ چل رہا ہے اور اس کے اعتبار کی نوعیت ہی بالکل الگ ہے اور اس کے انتظام کی باگ ڈور عقل کے ہاتھ میں نہیں۔ غالباً یہ جذبات زندگی کی اصل سے بہ مقابلہ عقل کہیں زیادہ قریب ہیں اور زندگی کی بصیرت انہیں سمجھے بغیر ہمیشہ اوصوری رہے گی منطق ان کی نسبت کچھ نہیں جانتی اور ہمیں کچھ نہیں بتا سکتی۔ وہ ہمارے وجود کی گہرائیوں میں سے سرگوشیاں کرتے ہیں جنہیں ہمارا دل سنتا اور سمجھتا ہے۔

۶۔ غزل گو شاعر کی درون بینی میں زبردست تخلیقی قوت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اسے اپنے اندر جو عالم نظر آتے ہیں وہ خارجی عالم کی رنگارنگی سے بے وہ چین اور گلستان کے استعاروں سے یاد کرتا ہے کہیں زیادہ دلکش اور حسین ہوتے ہیں۔ اس کو سرو و سمن کی سیر کی حاجت نہیں ہوتی اس واسطے کہ اس کے دل کی طلسمی دنیا میں یہ سب کچھ تخیل و جذبہ کے فیض سے پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے۔ بقول بیدل

ستم است اگر ہوست کشد کہ یہ سیر سرو و سمن در آ
تو ز غنچہ کم نہ میدہ در دل کشا بہ عین در آ (۱۵)

۱۵۔ غالباً یہ خیال بیدل نے حافظ سے لیا ہے جس کا شعر ہے:
حیفم آید کہ خراجی بہ تماشا سے چین کہ تو خوشتر ز گل و تازہ سرازیر بینی
دوسری جگہ کہ ہے:
سرو و سمن عشق دار و دل دروند حافظ کہ نہ خاطر تماشا نہ ہوائے باغ دارد

پئے نامہ ہائے فحشتہ بو پیند ز حمت جستجو
 بہ خیال حلقہ زلف او گرھے خور و برختن درآ
 اسی خیال کو ایک دوسری غزل میں بیدل نے اس طرح پیش کیا ہے۔
 بیدلاں چند خیال نگل و شمشاد کنند
 خوں شوند اینہمہ کز خمد و چمن ایجا و کنند

یہ مضمون اردو کے غزل گو شاعروں کے یہاں کثرت سے ملتا ہے۔
 ہمارے شاعروں کی درون بیتی اس مضمون میں ایسی ایسی نکتہ آفرینیاں نکرتی ہے
 کہ ان کا جواب نہیں۔ یہ مضمون شروع سے آخر تک انسان کی اندرونی زندگی کا
 لطیف استعارہ ہے جسے طرح طرح سے بیان کیا ہے۔ جس طرح دل تخیل کا اندرونی عالم ہے،
 اسی طرح گل و گلشن سے تخیل کا خارجی عالم مراد ہے۔
 یہاں چند مثالیں لکھتا ہوں۔

بیر صاحب فرماتے ہیں۔
 کم نہیں ہے دل پر داغ بھی لے مرغ ایر گل میں کیا ہے جو ہوا ہے تو طلب کار چمن
 اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے اس رمز کو و لیکن معدود جانتے ہیں

جگر کے شعر ہیں۔
 کہاں کے سرو و صنوبر کہاں کے لالہ و گل نگاہ ہی میں جو کیفیت بہار نہ ہو
 عشق میں کیا لالہ و گل کیا چمن کیساتف میں ہی خود اپنا گلستان میں ہی خود اپنا قفس
 فیض ہونے عشق سے لے دل ہر ایا داغ ہوا جو بہار اب مجھ میں ہے سارے گلستان میں نہیں

صیاد میرے دم سے ہیں سائے یہ چھپے جب میں نہیں تو رونق گلزار بھی نہیں

سمجھائے کون سیل غفلت شعار کو مدد دکر لیا ہے چمن تک بہار کو

بھرے ہوئے ہیں نگاہوں میں حسن کے حلے یہ کیا مجال جہاں میں ہوں اور بہار نہ ہو

دست جنون عشق کی گلکاریاں نہ پوچھ ڈوبا ہوا ہوں سر سے قدم تک بہاریں

حسن کی شائیں تھیں جتنی رب نمایاں ہو گئیں جو ترے رخ سے پھیں رنگ گھستان ہو گئیں

کہاں تک ہیں یہ رنگ و بو کی بہاریں تجھے دیکھ کر دیکھنا چاہتا ہوں

جلوہ جو ان کے رخ کا مے چشم تر میں ہے شادابی بہار کا عالم نظر میں ہے

اپنے سینے کے داغ میں لالہ کا رنگ دیکھنا اور چاک جیب سے بہار کی کیفیت کا اندازہ لگانا دروں بینی کا کمال ہے۔ اسیر لکھنوی کا شعر ہے۔

ہر داغ سینہ لالہ گلزار فیض سے

پاتے ہیں چاک جیب میں اندازہ بہار

پھر جس طرح بہار کے نقین میں شاعر اپنے دل کو مرکزِ حوالہ قرار دیتا ہے اسی طرح وہ غزلان کی بھی توجیہ کرتا ہے۔

غزلان نہ تھی چنستان دہریں کوئی

خود اپنا ضعف نظر پرودہ بہار چوا (جگر)

اگر دل کی بستی آباد نہ رہے تو بہار میں کوئی لطف باقی نہ رہے۔

لطف بہار مجھ نہیں کرے وہی بہار دل کیا اجرِ خیال زمانہ اجڑ گیا
(آرزو لکھوی)

ہنتر کے یہاں بھی درون مینی کے عناصر ملتے ہیں جن میں شاعر اپنی ذات اور اپنے
اندرونی تجربوں کو مرکزی حیثیت دیتا ہے۔ شعر ہیں۔

میرے ذائق شوق کا اس میں ہجر و ہنگ میں خود کو دیکھتا ہوں کہ مقصود یہ یاد کو
اس میں وہی ہے یا مرا حسن خیال ہے دیکھوں اُنھما کے پر وہ ایوان آرزو
کبھی شاعر کی دروں بینی اپنے تمہیل اور جذبہ کی تشفی کا سامان اس کی
ذات میں تلاش کرتی ہے جو اس کے دل میں براجمان ہے۔ یعنی اس کا محبوب۔
اب وہ کائنات کو غیر خود کے حوالے سے دیکھتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔
یہ بھی ایک طرح کی درون بینی ہے۔ اس کا اقتضا ہے کہ وہ اپنی جذباتی کیفیات
خارجی کائنات پر طاری کر دے اور اس کی سن مانی تو جبر پیش کرے۔ موسم بہار
کیا ہے؟ وہ کسی کے خرام جلوہ کے نقش قدم سے عبارت ہے اور بس۔

خرام جلوہ کے نقش قدم تھے لالہ و گل
کچھ اور اس کے سوا موسم بہار نہ تھا (آسی غازی پوری)
کبھی محبوب کے ساتھ سین اور دست پر نگار کو دیکھ کر شاخ گل مثل شمع جلنے لگتی
ہے اور گل پروانہ بن جاتا ہے۔

دیکھ اس کے ساتھ سین و دست پر نگار شاخ گل حلقی تھی مثل شمع گل روانہ تھا
(غالب تنویر)

گل و نسرين و سن کی عزت ناشتی کی نگاہ میں اس وقت بڑھتی ہے جب
اُس کا محبوب سیر و گلگشت کی غرض سے چین کی جانب خرام ناز فرماتا ہے۔

بڑھ جائے گی عزت گل و نسرين و سن کی
لالی ہے چین میں انھیں نقشہ یر چین کی (حسرت)
چین میں غنچہ گل کر گل کیوں بنتا ہے؟ اس سوال کا جواب اور اس مسئلہ

ہی ساعرانہ تعبیر ووجہ سے۔ ساعر کا جوب ملتے سے بنی طرف جالٹا۔
اس کے انداز وادائیں کو ایسے بھلے معلوم ہوئے کہ وہ آغوش کھول کر اس سے
بغل گیر ہونے کا متمنی ہو گیا۔ غالب کا شعر ہے۔

گلشن کو ادائیں سیری از بسکہ خوش آئی ہے
ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے
اس مضمون کو آتش نے یوں ادا کیا ہے۔

گئے جس بزم میں روشن چراغِ حسن سے کڑی
بہار تازہ آئی تم اگر گلزار میں آئے
ناسخِ خزان کی توجہ اسی انداز میں کرتا ہے۔

اس رشک گل کے جاتے ہی بس آگئی خواں
ہر گل بھی ساتھ ہو کے چین سے بھل گیا

جب محبوب چین میں آتا ہے تو فطرتِ نامیہ شوق بیکہ کے ہاتھوں مجبور و بے بس ہو کر
گل کو اس کے گوشہ دوستار تک پہنچانے کے لئے بنے تاب ہو جاتی ہے۔

دیکھ کر تجھ کو چین بسکہ منو کرتا ہے
خود بخود پیو پیو پختے ہے گل گوشہ دوستا کے پاں (غالب)

میر صاحب نے قسیم سحری کے اترانے کی زلفِ محبوب سے توجہ کی ہے۔
لگ بھگ ہی گو کی مگر بھری زلف سے آنے میں باد صبح کو یاں اک دماغ ہے
صبا کی بد دماغی پر اس مضمون کا دوسرا شعر ہے۔

شاید اس زلف سے لگی ہے میر باؤ سے اک دماغ نکلے ہے
بہار میں جو رنگینوں کا جوش ہے اس کی دین بکتہ رس شاعر کی آنکھ کسی
کے خون تنہا کو شریک دیکھ لیتی ہے۔ ورنہ اگر ایسا نہ ہوتا تو رنگ بہار میں ایسا
بھمارا اور چمکایا نہ آتا۔

ایسا کہاں بہار میں رنگینوں کا جوش شامل کسی کا خون تنا ضرور تھا (جگر)

نہیں کہ عشق نہیں ہے گل و بسن مجھے دلِ فربہ لئے جاتا ہے چمن سے مجھے (رضاعی و سنت)
بعض اوقات جدائی کی حالت میں مرغِ چمن کی زمرہ سنجیوں سے لطف کے بجائے کوفت
ہوتی ہے اور سننے والے کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے اس لئے کہ ان میں زبردست
ایمانی کیفیت ہے جو یادوں کو تازہ کرتی ہے۔

از بس جنونِ جدائی گلِ پیرامن سے ہے
دلِ چاک چاک نغمہٗ مرغِ چمن سے ہے (ہون)

اسی مریخ کی نسبت میر صاحب فرماتے ہیں :-
محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا
اگر ایک دفعہ عاشقِ چمن سے بیزار ہو کر اٹھ جائے تو پھر اس کی کوئی دلکشی اس کو اپنی
جانب متوجہ نہیں کر سکتی۔ میر صاحب نے عاشق کی نازک دماغی کی تصویر اس شعر
میں کھینچی ہے :-

آٹھا جو بلغ سے میں بے دماغ تو نہ پھرا ہزار مرغِ گلستاں مجھے پکار ہے
میر صاحب کے دوسرے شعر ملاحظہ ہوں :-
کلِ دلِ آزدہ گلستاں سے گزر ہم نے کیا گل لگے کہنے کہو منہ نہ اُدھر ہم نے کیا

اب کی ہزار رنگ گلستاں میں آئے گل پر اُس بغیر اپنے تو جی کو نہ بھائے گل

گلشنِ بھرا ہے لالہ و گل سے اگرچہ سب پر اُس بغیر اپنے تو بھائیں لگی ہے آگ

مجھ کو دماغ و صفتِ گل و یاسمن نہیں میں جوں نسیمِ بادِ فروشِ چمن نہیں

جوں ہم مجھ اگلا اگلا اگلا اگلا دماغ کا شے انا بھی ایک وفا کرتا

م بن بن سے مل ہیں چڑ سے نظر دھو یہ لیا روس ہے اوپے ماک دھرو

گل پھول سے کب اس بن لگتی ہیں اپنی آنکھیں لائی بہار ہم کو دور آوری چین میں

اچھی لگے ہے تجھ بن لگاشت باغ کس کو صحبت رکھے گلوں سے اتنا دماغ کس کو

اسی مضمون کا جرات کا شعر ہے :-

یاد کس گل کی تھی یارب مے تن من سے لگی آگ سی دل میں جو سیر گل و گلشن سے لگی
کبھی عاشق چین سے کترا کر گزر جاتا ہے کہ کہیں اس کے حال دار کو دیکھ کر
ہر گل تر ایک چشم خونچکان نہ بن جائے۔

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر

۱ ہر گل تر ایک چشم خونچکان ہو جائے گا (غالب)

غم فراق کی حالت میں عاشق کو گل کی بے عمل معنی بُری لگتی ہے اور گلشن سے
اس کی طبیعت گھبراتی ہے۔

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو مجھے دماغ نہیں خندہ ہایجا کا (غالب)
شاعر کے لئے بہار میں ایک طرح کی ایمانی قوت ہوتی ہے۔ اس سے اس کی یادیں
تازہ ہوتی ہیں۔

جلوہ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد جو شش فصل بہاری اشتیاق انگیز ہے
ابر شفق آلودہ کو دیکھ کر شاعر کو یہ یاد آیا کہ کسی کی فرقت میں چین ایسا معلوم ہوتا
تھا جیسے اس پر آگ برس رہی ہو۔

مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ یاد آیا

(غالب) کہ فرقت میں تری آتش برتی تھی گلستاں پر

اسی مضمون کو قافی نے یوں ادا کیا ہے :-

۲۹
بدلا ہوا مختار نگ گلوں کا ترے بغیر کچھ خاک سی اُڑی ہوئی سا چمن میں تھی
اصغر کا شعر ہے :-

نگاہ شوق کو یار اے سیر دید نہ ہو جو ساتھ ساتھ تجلی حسن یار نہ ہو
چمن میں باد بہاری کے قدم بے جس طرح نئی زندگی جنم لیتی ہے اسی طرح
مایوس اور شکستہ دل میں کرم یار کی یاد سے تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔

دل پر شوق میں آئی کرم یار کی یاد
کہ چمن میں قدم باد بہاری آیا (حسرت)
ہماری شاعری میں اس کی مثالیں بڑی کثرت سے ملتی ہیں کہ شاعر
گلشنِ فطرت کی نیرنگیوں کا تماشا اپنے اندرونی احوال و محرکات کے حوالے
سے کرتا ہے اور ان کی شاعرانہ توجیہ پیش کرتا ہے۔ اردو کے مختلف دوروں کے
شعرا کے کلام سے چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔
دلی کا شعر ہے :-

جاتا ہوں باغِ یاد میں اس چشم کی دلی شاید کہ برے اس کی ہونگس کی باں میں
میر صاحب کے دیوان میں گل و گلشن کے اصطلاحی استعاروں کی سینکڑوں
مثالیں موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں فارسی اور اردو کے کسی شاعر کے دیوان میں اتنی
مثالیں نہیں ملیں گی۔ یہاں صرف چند پیش کی جاتی ہیں۔
صوفی شاعر خاک میں مل گئے تو نے گلشن میں کیوں خرام بکھا

اس چہرہ کی خوبی سے عیش گل کو جتایا یہ کون شگوفہ سا چمن زار میں لایا

گل کام آدے ہے ترے منہ کے ناز کے صحبت رکھے جو تجھ سے یہ اس کا دہن نہیں

ہر نقشہ ماسے شہِ خزاں شک نہ ہو کہ گورثِ محمود سرتا جگہ ہند

ای۔ دو دہریں ہے ہر بہار اب	سرمایہ چریں
سرو گل اچھے ہیں دونوں مونی بن گزرا کی لیک	چاہے رُو اس کا سارو ہو قامت و ساق ہر
اگر چہ گل بھی نمود اس کے رنگ کرتا ہے	ولیک چاہئے ہے منہ بھی ناز کرنے کو
آفتہ میرے خون سے لے کاش جا کے پہنچے	کوئی پر شکستہ ٹک گلستاں تلک تو
پائے گل اس چین میں چھوڑا گیا نہ ہم سے	سر پر ہمارے ابھی تہمت ہے بے پری کی
گل دیکھ کر چین میں تجھ کو کھلا ہی چاہے	یعنی ہزار جی سے تسربان ہو رہا ہے
گل کھلے صدر رنگ تو کیا بے پری سے اے نسیم	مدتیں گزریں کہ وہ گلزار کا جاتا گیا
گلگشت کی ہوس تھی سو تو بغیر آئے	آئے جو ہم چین میں ہو کر اسیر آئے
کیا جانیں وہ مرغان گرفتار چین کو	جن تک کہ بعد ناز نسیم سحر آئے
سروت و بالا ہوتا ہے درہم برہم شاخ گل	ناز سے قد کش ہو کے چین میں ایکنیلا تلم لے ہو
سیر گلزار مبارک ہو صبا کو ہم تو	ایک پرواز نہ کی تھی کہ گرفتار آئے
گل نے ہزار رنگ سخن و ابکیا ولے	دل سے گھٹیں نہ باتیں تری پیاری پیاری

۱۱۰۱۔ میرزا سائیں سے ساتھ یا سے دیکھا واحد رنگ ہے سارے پن لے بیچ

بیچ پوچھو تو کیا ہے گا اس کا سا دھن غنچہ تسکین کے لئے ہم نے ایک بات بنائی ہے

برسوں سے گل چمن میں نکلتے ہیں رنگ رنگ دیکھا تھا خانہ باغ میں پھرتے اے کہیں نکلا نہیں ہے ایک رخ یا رسا ہنوز گل حیرتی ہے صورت دیوارسا ہنوز

کھلتا کم کم کلی نے سیکھا ہے اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

چشم جہاں تک جاتی تھی گل دیکھے تھے منہ و زور پھول چمن کے کس کے منہ سے ایسی غلبت کتنے

پھر اس سے طرح کچھ جو دھوے کی سی ڈالی ہے کیا تازہ کوئی گل نے اب شاخ نکالی ہے

چمن میں گل نے جو گل دھوئے جمال کیا جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا چمن کو یمن قدم نے ترے نہال کیا

مصطفیٰ کے شعر ہیں :-

لے مانتا بھی اپنے محبوب کے ترسا سے گلشن فطرت کی دھار جی کا مشاہدہ ہر تاج ہے چہ اشعار
ما خلد ہوں :-

بہئے زلف و رخت می روند وی آیتند صبا بغالیہ سائی و گل بمسعودہ عمری
فرخندہ لڑک تو چمن را حیات وہ جد بنفشہ تو صبا را عمرہ کشا لے
مرغول سبیل اذوم کوئے تو خوش نسیم زلف صبا ز خاک جناب تو شک سائے

دیکھا ہے تجھے جلوہ کناں جبے چمن میں ^{۳۲} ہر گل کا اڑاتی ہے نسیم سحری رنگ
 کھول دیتا ہے توجہ جا کے چمن میں لہریں پا بہ زنجیر نسیم سحری نکلے ہے

غائب کے یہاں یہ مضمون طرح طرح سے ملتا ہے۔ مثلاً اپنی وارفتگی اور حیرانی کو
 فطرت پر اس طرح طاری کرتے ہیں :-
 آئینہ خانہ ہے صحن چمنستان یکتا بسکہ ہیں بخود وازقہ وچران گل و صبح
 گل اور صبح دونوں فطرت کے کس قدر لطیف منظر ہیں۔ ان دونوں کی حیرانی اور ظلم
 میں کس قدر شغریت ہے۔ پھر ان کی حیرانی انھیں کی ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ
 پورے چمن پر چھا جاتی ہے اور اسے آئینہ خانہ بنا دیتی ہے۔ حیرانی کی مناسبت سے
 چمن کا آئینہ خانہ بن جانا شعری رمزیت کا کمال ہے۔
 ایک اور جگہ کہتے ہیں :-

چشم بے خون دل و دل تہی از جوش نگاہ زباں عرض فنون جوس گل تا چند (منضمیہ)
 یعنی اگر آنکھ خون دل سے نا آشنا ہے اور دل جوش نگاہ سے بے گمان ہے تو ہنس گل
 کی فنون کا رویوں کا ذکر بے معنی ہے۔ یا یوں کہیے کہ تماشا نے گل و گلشن اس وقت جو
 جواز رکھتے ہیں جبکہ آنکھ خون دل سے اور دل جوش نگاہ سے آشنا ہو۔

اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے کہ لالہ زار کا ہر ورق،
 ورق انتخاب ہے۔ اس کی سیر اسی کو زیب دیتی ہے جو صاحب دل و نظر ہے۔
 ہر کس و نا کس کا یہ منصب نہیں کہ سیر گلشن کی آرزو کرے۔

بے چشم دل نہ کر ہو کس سیر لالہ زار یعنی یہ ہر ورق اورق لالہ زار کا (منضمیہ)
 گلستان کی تمام نعمتیں سخیوں کی قیہ غائب اس طرح کرتے ہیں۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستان محل گیا بلبلیں سن کر مے نالے غزل خواں ہو گئیں
 شاد و کراہے، انا اور حمزہ کے نظر فریب ہونے کا احساس ہے لیکن زندگی

سے شکایت ہے کہ بہت کم ہے۔ فرصت نظر جتنی ہونی چاہیے اتنی نہیں۔
میں چشم واکشاہ وگلشن نظر فریب لیکن جھٹ کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں
اسی مضمون کو اس طرح بھی ادا کیا ہے:

آغوش گل کشادہ برائے وداع ہے اسے عندلیب جل کے چلے دن بہار کے
شاعر کے نزدیک گلوں کی برگ ریزی ایک طرح کی ذرا نشانی ہے جو محبوب کی
گل ادا می بلج کے طور پر چین سے وصول کرتی ہے۔

برگ ریزی ہائے گل ہے وضع زرافشانہی باج یمنی ہے گلستان سے گل ادا می تری (منوچہ)
گلشن میں محبوب کی بے جا بیوں کو عاشق پسند نہیں کرتا اور اپنے ہند بر رشک
کو احساس حیا سے تعبیر کرتا ہے۔ نہکت گل سے عاشق کو نرم آنا عجیب غریب نزاکت
خیال پر دلالت کرتا ہے۔ مستحق کی بے جا بی سے پہلے نہکت گل کی بے جا بی پر وہ
حرف گیر ہوتا تھا لیکن اب اسے خاموش ہونا پڑا۔

کرتا ہے بسکہ باغ میں توبے جا بیا آنے لگی ہے نہکت گل سے جیا بچھے
کبھی محبوب کی سیر گلشن کی یہ توجیہ کی جاتی ہے کہ وہ اس بہانے سے
اپنے زخمیوں کو دیکھنا چاہتا ہے۔

انہیں منظور اپنے زخمیوں کو دیکھ آتا تھا
گئے تھے سیر گل کو دیکھنا تھوڑی بہانے کی

شاعر جب زندگی کو سمجھنے کے لئے اپنے محبوب یا غیر خود کو مرکز حوالہ قرار دیتا ہے
تو اس طرح قطع نظر ہوتا ہے۔

فسردگی میں ہے فیاذ بے دلاں تجھ سے چراغ صبح وگل موسم خزاں تجھ سے
یمن یمن گل آئینہ و دستار ہوس امید محو تماشا لے لے گلستان تجھ سے
اتند با موسم گل دا طلسم کج قفس خرام تجھ سے صبا تجھ سے گلستان تجھ سے
(سید احمد رضا)

اور جب اپنی ذات کے توسط سے کائنات کی بزم تماشا کو سمجھنا چاہتا ہے تو کہتا ہے

درسِ عنبران تماشا پہ تغافلِ خوشتر ہے نگہ رشتہ شیرازہ مژگان مجھ سے
اثر آبلہ سے چادہ صحرائے جنوں صورت رشتہ گوہر ہے چراغاں مجھ سے
ہنگم گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد ہے چراغانِ خس و خاشاکِ گلستان مجھ سے
پھر اپنی ذات اور محبوب دونوں کی اہمیت اس شعر میں واضح کی ہے۔

گردشِ ساغر صد جلوہ رنگین مجھ سے آئینہ داری یک دیدہ حیران مجھ سے
غالب نے ایک اور جگہ ذاتِ باری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا ہے
کہ شعلہ ایمان کی آتش افروزی تیرے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو
نہیں کہ انسان کی اہمیت کسی طرح کم ہو جاتی ہے۔ زندگی کی رونق انسان ہی کی
ذات سے وابستہ ہے اس لئے کہ تمدن کا خالق وہی ہے۔

آتش افروزی یک شعلہ ایمان تجھ سے
چشمک آرائی صد شہر چراغاں مجھ سے

بعد میں اقبال نے اس تصور کو اپنے خاص انداز میں پیش کیا اور کائنات کے نظام
میں انسان کی اہمیت واضح کی۔ انسانی فضیلت کا مضمون اقبال کے کلام میں
قدم قدم پر ملتا ہے۔ لیکن اس تصور سے غالب بھی نا آشنا نہیں ہے۔ اس کا شہرہ
نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم نے یا مجھ سے مری بہت عالی نے مجھے
غالب نے ایک پوری غزل ہوس گل کے اسرار و طلسم پر لکھی ہے۔ گل
یہاں شاعر کے تخیل کا خارجی نمونہ ہے۔ کہتے ہیں۔

بے کس قدر ہلاک فریب و فائے گل بلبیل کے کاروبار یہ ہیں خندہ ہائے گل
بیل کے اس بھوکہ پر کہ گل کا رنگ و بوقائم رہنے والا ہے گل نہیں رہے ہیں۔
بیل کی دیوانی حرکتوں پر گل کی جی ہنستے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ کہتے جاتے
ہیں کہ جس چیز کا نام عشق ہے وہ اہل میں دماغ کا خلل ہے۔

بیل کے کاروبار پر بے خندہ ہائے گل کہتے ہیں جس کو عشقِ خلل ہے دماغ کا
گل والی غزل شے دوسرے شعر ملاحظہ ہوں۔

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار میرا رقیب سے نفس عطرائے گل
گل کی خوشبو سے عاشق کی رقابت عجیب و غریب مضمون ہے یہ رقابت
اس لئے ہے کہ بہار نے یہ خوشبو محبوب کی خاطر پیدا کی اور اس کو محبوب سے
قرب و اتصال نصیب ہوگا۔ چنانچہ گل کی ہر ادا ناگوار ہے۔ ایک تو اس
کی خوشبو سے رقابت کی وجہ سے ناگوار ہے اور دوسری وجہ اس شعر میں بتائی ہے
سطوت سے تیرے جلوہ حسن غیور کی خون ہے میری نگاہ میں رنگ ادا لے گل
محبوب کا حسن غیور اپنی ماضیت کو عار سمجھتا ہے اور اسے یہ بات پسند نہیں
کہ مجھے کسی اور کی اداسی معلوم ہو۔ چنانچہ گل کی رنگینی اور اس کی اداسی میری
نظر میں خون معلوم ہوتی ہیں۔

اب محبوب کو کائنات کا مرکز حوالہ قرار دے کر گلوں کے شگفتہ ہونے کی
اس طرح توجیہ کرتے ہیں۔

یہ ہے ہی جلوہ کا بے وہ دھوکا کہ آج تک بے اختیار دوڑے ہے گل دستفائے گل
یعنی گل جو ایک دوسرے کے بعد چمن میں برابر کھلتے رہتے ہیں تو اصل
میں یہ تیرے جلوہ کا ذوق دیدار ہے جو انھیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔
مقطع ہے۔

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو جس کا خیال ہے گل جیب قبائے گل
یعنی مجھے اس سے ہم آغوشی کی آرزو ہے جس کے خیال کو گل نے
اپنی جیب قبائے زینت بنایا ہے۔ اس طرح میرا محبوب صرف میری محبوب
نہیں ہے بلکہ کائنات کے لطیف ترین مظاہر بھی اس کے حلقہ بگوش
ہیں۔ اس سے اپنی اور محبوب دونوں کی بڑائی ثابت ہوتی ہے۔

گلشنِ فطرت کا مشاہدہ ہمارے دوسرے شاعروں نے بھی اپنی اپنی بابت
کے موافق کیا اور اس کے نظامِ عام میں اپنی اور کبھی اپنے محبوب کی اہمیت
واضح کی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ذوق کا شعر ہے۔

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چین میں اک ذوق اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

ظفر کچے ہیں۔

نہ ہوں سیرِ چین کی نہ گلِ ترکی ہوا سر عاشق میں ہے اس سروِ من برکی ہوا

دامن کا عکس کس کے پڑا ہے کہ آج تک

پھیلا رہا ہے سرو لب جو بسا رہا تھے
(جلی علی شاہ)

اے عنذلیب تجھ کو بے راحت چین میں کیا

اس رشکِ گل کا جلوہ ہے سروِ من میں کیا
(زکی دہلوی)

کھولے ہوئے رہتے ہیں گل ویا سمن آغوش

بننا ہے غرضِ شوق میں تیرے چین آغوش
(زکی دہلوی)

رواقِ محفل جو وہ رندِ شہِ رابی ہو گیا

پھول سا عربین گیا غنچہ نگلابی ہو گیا
(امیر لکھنوی)

بہارِ گل کیا ہے اسکو بھونکو چین میں چل کر یہ دیکھو

کوشمِ رخسار پر تہا رے جلے گی میلِ تنگ بوکر
(داغ)

ٹھہر گئے وہ جہاں سرو باغ تھے گویا

اگر چلے تو نیم بسا رہو گئے چلے
(داغ)

چپک چپک کے کہیں گل بنا کہیں لالہ

چمن میں رنگ نہ لایا مرا لہو کیا کیا
(شریف لکھنوی)

گل ہیں پڑ مردہ تو غنچہ بھی گرفتہ دل ہے

جاتے ہی یار کے رونق گئی گلزاروں کی
(رشد)

اس روش سے وہ چلے گلشن میں

بچھ گئے پھول صبا لڑ گئی
(امیر بنانی)

گھوٹی کو دیکھ کے سودائے زلف یار ہوا
بہار آئی تو سر پر جنون سوار ہوا

(است بناری)

عجب ادا سے چین میں بیدار آتی ہے
گلی گلی سے مجھے بوسے بیدار آتی ہے

(جلیل)

خاک چمن میں شبنم و گل کا عجب ہے رنگ
ساغر کسی سے جھوٹ پڑا ہے شراب کا

(جلیل)

آج ہے وہ بہار کا موسم
پھول توڑوں تو ہاتھ جا دم آئے

(جلیل)

پریاں ہیں سب یہ غنچہ و گل اتنے صبح
کچھ اٹھ چکی ہیں کچھ ہیں ابھی خواب ناز میں

(جلیل)

موسم گل میں حسینوں کا موقع ہے چمن
جو کلی کھلتی ہے تصویر نظر آتی ہے

(جلیل)

چمن میں ہر طرف بونے محبت مچھوڑ آتی ہے
گھوٹی پر پڑ گیا شاید پیمانہ بوسے جانان کا

(اشرف)

زنجبیری سرشک محبت کے حسن سے
دامان عاشقان ہے گلستان عاشقان

(حسرت)

تیرے دئے دل آرا کے تصویر کا عظم تھا
کہ چشم شوق میں اک حسن کا گھوڑا پیدائے

(حسرت)

چمن میں باد بہاری بھی گل کی آنکھوں سے
چلی کہ دیکھے تھا شاہ تری سواری کا

(حسرت)

غالب کے اہل گلشن فطرت کی رنگارنگی کے مشاہدے کے ساتھ ایک اور
نیا خیال بھی ملتا ہے جو اقبال سے پہلے شاید غالب ہی نے بیان کیا ہے۔ غالب

نے بھی فطرت کا مشاہدہ اپنے اندرونی احوال و محرکات کے حوالے سے کیا ہے۔

اس نے صرف مشاہدہ ہی نہیں کیا بلکہ خارجی فطرت کا صرف شعور و تعارف کو ظہور دیا

ہے کہ وہ انسانی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ اس نے تماشا بنائے گلشن کے ساتھ

تمائے چیدن کی کسک محسوس کی۔ انسانی خواہشات سے مظاہر فطرت کا جب ربط

قائم ہو جاتا ہے تو ان کے مہل انہار میں ترتیب و معنی پیدا ہوتے ہیں۔ غالب کے نزدیک

گلشن بہار خود نمائے چیدن کی متقاضی ہوتی ہے اس لئے چیدن نہ ہے سدا اگر گلشن ہے

ناجائز ہے تو غلط۔ غالب بہار گلشن کو پیدا کرتے والے کو اس طرح خطاب کرتا ہے۔

تاشائے گلشن تنائے چین۔ ہمارا فرینا بگنہ گار ہیں ہم
غالب کے اس شعر میں اقبال کے تصورات کی حرکت اور قوت نہایت لطیف
انداز میں نظر آتی ہے۔ کون کہتا ہے کہ حکیمانہ موضوع شعریت کو مجروح کرتے ہیں
اس شعر میں حکمت کو نغمہ کے ساتھ بڑی خوبی سے ہم آہنگ کر دیا گیا ہے۔ تعجب
اس امر پر ہے کہ غالب کے انتخاب میں یہ شعر چھوٹ گیا۔ اس غزل کے دو اور
شعر نہایت بلند ہیں۔ کہتے ہیں :-

ز فوق گریاں نہ پروائے داماں بنگاہ آشنائے گل و خار ہیں ہم
اسد بشکوہ کفر و دعائے ناسپاسی ہجوم تناسے لاچار ہیں ہم
آپ نے مندرجہ صدر مثالوں سے دیکھ لیا ہوگا کہ کس طرح تخیل کی گلکاری
سے غزل گو شاعر کی دہون بینی انسانی جذبات کے طلسم کو فطرت پرطاری کرنے کی کوشش
کرتی ہے اور کائنات مدرکہ میں اس کو بس وہی نظر آتا ہے جس کو اس کا اندرونی احساس
دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے۔ تخیل و جذبہ دونوں منظر الوہیت ہیں اور اس لئے تقدس کے
حامل۔ یہ زندہ اور موثر حقائق ہیں جو خارجی کائنات کے حوادث کو اپنی گرفت میں
لینے اور ان پر اپنا رنگ طاری کرنے کی پوری قدرت رکھتے ہیں۔ انھیں کے
اشارہ چشم و ابرو پر انسانی دنیا کی ساری حرکت اور رقص منجی ہے۔ اگر یہ نہیں تو
پھر کچھ بھی نہیں۔ زندگی کا کیف و سرور دل زندہ کار میں منت ہے :-

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے کہ زندگانی عبارت ہے تیسرے جینے سے
تخیل اور جذبہ کی آمیزش اور ہم آہنگی اپنے تخلیقی جوش میں ان ابدی
الہام کو ہم پر منکشف کر دیتی ہے جن تک پہنچنے کے لئے تعقل کے پر جلتے ہیں
ان کے باوجود پیر موار ہو کر انسان ابدیت کی واویلوں کی سیر کر سکتا ہے۔ وہاں
اسے جو طلسم اور تماشے نظر آتے ہیں انھیں رمز و ایما ہی کے ذریعہ بیان
کرنا ممکن ہے۔ دراصل غزل کی رمز نگاری کی بھی یہی وجہ ہے کہ رمز و کنایہ کو
منطقی تسلسل بیان کی حاجت نہیں ہوتی۔ چنانچہ جہاں بھی شدت احساس کی

کار فرمائی ہوگی وہاں کلام میں عدم تسلسل پیدا ہونا لازمی ہے۔ یہ سامع کے تخیل کا فرض ہے کہ وہ عبارت کے خلا کو اپنی ذہنی کاوش سے پُر کرے۔ دنیا کی اکثر الہامی کتابوں میں آپ ہی خصوصیت پائیں گے منطقی تسلسل خارجی واقعات اور حقایق کو بیان کرنے کے لئے ضروری ہے منطق عقل کی زبان ہے۔ وجدان کی زبان رمز و کنایہ ہے جو منطقی استدلال و تسلسل سے بے نیاز ہے اور اسی وجہ سے اس کے جذب و تاثیر کی کوئی انتہا نہیں۔

یہ درست ہے کہ جذبہ کارمزی بیان صرف غزل کے لئے مخصوص نہیں۔ اعلیٰ پایہ کی نظم میں بھی یہ ممکن ہے لیکن شاد و نادر نظم میں عمرانی اور فطری حقایق کے خارجی احوال کے علاوہ اندرونی کیفیات بیان کی جاسکتی ہیں۔ اور خاص حالات میں سامع کے دل میں انبساط و انقباض اور جوش و نفرت و محبت کے جذبات برانگیختہ کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن نظم کی ٹیکنک کا اقتضایہ ہے کہ مطالب واضح طور پر اور تفصیل کے ساتھ بیان کئے جائیں۔ ابہام اور اجمال نظم کے لئے سازگار نہیں۔ اور غزل کی یہی دونوں چیزیں جان ہیں۔ رمز و کنایہ میں اگر تفصیل آگئی تو وہ بے مزہ ہو جائیں گے۔ پھر اس کے علاوہ چونکہ غزل میں واردات حسن و عشق کو بیان کیا جاتا ہے جو نہایت گہری اور پراسرار ہوتی ہیں اور تفصیل کی تحمل نہیں ہو سکتی اس لئے رمز و کنایہ کے بغیر چارہ نہیں۔ قلبی واردات ہمیشہ ابہام اور اجمال کی تقاضی ہوتی ہیں۔ شہج درد اشتیاق اور ذکر جمال اجمال چاہتا ہے، کنایہ چاہتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ جو بات کہی جائے مبہم طور پر کہی جائے۔ دل کو کنایہ اور اجمال پسند ہے اور دماغ کو تشریح و وضاحت۔ استعارہ اور رمز و کنایہ کی ایمانی قوت سے شاعر کے محدود مشاہد میں بے پائی پیدا ہو جاتی ہے۔ غزل کے شعر کا مطلب ایسا معنی خیز ہونا چاہیے کہ تحریک ذہنی اس کے اندر مختلف جذباتی اور تخیلی کیفیات پوشیدہ دیکھے جن سے تحت شعور کی بہت سی بھولی بسری یادیں تازہ ہو جائیں اور تازہ ہوتی

ہیں۔ غالب نے اپنے کلام کی جہاں خصوصیات بتائی ہیں ان میں اجمال، ابہام اور کنایہ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ انھیں پر تاثیر کا دار و مدار ہے۔ ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کی نغراءِ ادب کے متعلق کتنی گہری اور وسیع تھی۔ وہ کہتا ہے :-

فکر میری گہرا اندوز اشارات کثیر کلک میری رقم آموز عبارات قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدیق و توجیح میرے اجمال پر کرتی ہے تراوش تفصیل
یہ اشعار اگرچہ ایک قصیدہ میں کہے گئے ہیں لیکن ان میں تفریل کی روح بیان کر دی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غالب کے قصائد میں بھی غزل کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ اس کے قصائد دوسروں کے قصائد کی طرح محض بیانیہ نہیں ہوتے بلکہ ان میں استعارہ اور رمز و ایما کی جھلکیاں قدم قدم پر نظر آتی ہیں۔ رمز و ایما کی اہمیت کے متعلق غالب کے کلام میں اور بھی اشارے ملتے ہیں۔ وہ لیلائے سخن کو محل نشین راز ہی رکھنا چاہتا ہے :-

شوخ، اظہار کو جزوِ وحشت بنوں اسد
بسکہ لیلائے سخن محل نشین راز ہے (نسخہ حمیدیا)
سخن عشق کی سوختہ نفسی اس کے دل کی اندرونی بہار کی آئینہ دار ہے جسے وہ رمز و چمن ایما کی خوشنما ترکیب سے ظاہر کرتا ہے :-

بانغ خاموشی، دل سے سخن عشق اسد
نفس سوختہ رمز چمن ایما کی ہے (نسخہ حمیدیا)
یہ یعنی ہے کہ غزل گو شاعر اپنے کلام میں جو لفظ برتا ہے ان سے ظاہری معنوں کے علاوہ بھی اس کا کچھ مقصود ہوتا ہے۔ لفظوں کو وہ علامتوں کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ بظاہر جتنا وہ کہتا ہے اس سے کہیں زیادہ حقیقت میں کہہ جاتا ہے۔

مقصود ہے نام و غمزہ و لے گفتگو میں کام چلتا نہیں ہے دشمنہ و خنجر کہے بغیر

ہرچند ہوش بدہ حق کی گفت گہ^{۴۱} بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کے پھر
غالب نے فارسی میں اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے -
رمز بشناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد
محرم آن است کہ رہ جز بہ اشارت نرود

دوسری جگہ کہتے ہیں :-

فرقیست نہ اندک زدلم تا بدل تو

معذوری اگر حرف مرا زود نیابی

غزل گو شاعر رمز و کنایہ کی ایمانی قوت سے لفظوں میں وہ تاثیر پیدا کرنا چاہتا
ہے جو موسیقی میں بولوں سے پیدا کی جاتی ہے جو صوتی رموز ہیں۔ وہ چیزوں کے
نام نہیں لیتا اور نہ واقعات کو مفصل بیان کرتا ہے بلکہ ان کی طرف خفیف سا
اشارہ کر دیتا ہے۔ درد کے اس شعر کی ایمانی کیفیت ملاحظہ ہو۔

ان لبوں نے نہ کی میسمائی ہم نے سو سو طرح سے مردیکھا

سودا کے اس شعر کی ایمانی قوت کی کوئی حد نہیں۔

کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو بھیے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں
خفہ کا شعر ہے :-

لے جنون ہاتھ سے تھے نہ رہا آخر کار چاک دامن میں اور چاک گریبان میں فرق

غالب اور مومن کے ہاں رمز و کنایہ کو بڑی خوبی اور نزاکت سے برتا
گیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ طلب ہیں جن پر ہماری زبان اور ادب جتنا ناز
کریں بجا ہے۔

غالب

درد منت کش دوانہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برانہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا آپ آتے تھے مگر کوئی غمان گیر بھی تھا
قید میں ہے تے وحشی کو وہی زلف کی یاد ہاں کچھ اک بیخ گراں بارلی رنجیر بھی تھا

پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا دل جگر تشنہ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے مہود پھر ترا وقت سفر یاد آیا
سادگی ہائے متنا یعنی پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا
پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال دل گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی کی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکین میں اسد سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا
غائب کی غزلیں کی غزلیں کنایوں سے بھری پڑی ہیں۔ پھر یہ کنائے محض
کنائے نہیں بلکہ لطف شعری میں سموئے ہوئے ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اس
کے کلام کا بیشتر حصہ رمز و کنایہ کی کیفیت میں رچا ہوا ہے۔ پورا دیوان
دیکھ جائیے کوئی غزل ایسی نہیں ملے گی جو لطف سے خالی اور محض بیانیہ
ہو۔ بیانیہ غزلیں بھی جن میں تسلسل ملتا ہے، زیادہ تر استعارہ کی زبان میں
کہی گئی ہیں۔ ان غزلوں کا تسلسل رمز و کنایہ کا تسلسل ہے نہ کہ منطقی تسلسل۔
اس کی بزم خیال کی رنگارنگی ملاحظہ فرمائیے۔ یہاں صرف دو غزل لیں
ملاحظہ طلب ہیں۔

ظلمت کردہ میں میرے شب غم کا جوش ہے اک شمع ہے دلیل سحر و غوش ہے
نے مژدہ وصال نہ نفقہ رہ جمال مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے
مئے کیا ہے جن خود آرا کو بے حجاب اے شوق یاں اجازت بتلک و ہوش ہے
گوھر کو عقد گردن خواب میں دیکھنا کیا اوج پرتا رہ گوھر فروغش ہے
دیدار بادہ، حوصلہ ساقی نگاہ مست بزم خیال میکدہ بے خروش ہے

قطعہ

لے تازہ وارد اں بساط بھائے دل
دیکھو مجھے جو دیدہٴ عبرت نگاہ ہو
ساقی یہ حلہ دشمن ایمان و آگہی
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط
لطف خرام ساقی و ذوق صدے چنگ
یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

زہنہار اگر نہیں ہوس ناؤ نوش ہے
میری سنو جو گوش نصیحت نبوش ہے
مطرب ہو نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے
دامان باغبان و کف گل فروش ہے
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خاموش ہے
غالب صریح خامہ نوائے سروش ہے

پھر کچھ اک دل کو بیتیاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن
قتلہ مقصد نگاہ نیاز
چشم و لال جنس رسوائی
وہی صد رنگ نالہ فرسائی
دل ہوائے خرام ناز سے پھر
جلوہ پھر عرض ناز کرتا ہے
پھر اسی بی وفا پہ مرتے ہیں
پھر کھلا ہے در عدالت ناز
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
پھر دیا پارہ جگر نے سوال
پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب
دل و شرکان کا جو مقدمہ تھا

سینہ جو یائے زخم کاری ہے
آمد فصل لالہ کاری ہے
پھر وہی پردہ عمارتی ہے
دل خریدار ذوق خواری ہے
وہی صد گوشت اشکباری ہے
عشرتستان بے قراری ہے
زور بازار جان پیاری ہے
پھر وہی زندگی ہماری ہے
گرم بازار فوجداری ہے
زلزلت کی پھر سرشت داری ہے
ایک فریاد آہ و داری ہے
اشک باری کا حکم جاری ہے
آج پھر اس کی رو بجاری ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالبؒ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے
 ان دونوں غزلوں میں جو تسلسل ہے وہ رمز اور استعارہ کا تسلسل
 ہے مگر ضمنی طرز پر مضمون کا تسلسل بھی آگیا۔ غزل کی اصلی خوبی مضمون کا
 تسلسل نہیں۔ شاعر کو اختیار ہے کہ اگر اسے باقی نہ رکھنا چاہے تو ہر شعر
 میں علیحدہ رمز کی کیفیت پیش کرے۔ اس کے ہر شعر کو بجائے خود مکمل حقیقت
 حاصل ہوگی اور وہ اندرونی تجربہ کے ہر لمحہ کی طرح کافی بالذات ہوگا۔
 اس طرح غزل گو شاعر رمز میں کچھ چھپاتا ہے اور کنایہ سے کچھ بتاتا ہے لیکن اس
 طرح کہ اشاروں کو سمجھنے والے ہی کچھ سمجھ سکتے ہیں۔

مومن خاں کے کلام میں بھی رمز و کنایہ کثرت سے استعمال ہوا ہے اور
 چونکہ وہ کنایہ کے ساتھ بہت کچھ مطالب اور ان کی منطقی گڑیاں حذف
 کر جاتے ہیں اس لئے مسامح کو ٹھٹک کر ذرا سوچنا پڑتا ہے کہ وہ کیا کہہ گئے۔
 ان کے کلام میں خالص کنایہ کی مثالیں کثرت سے ہیں۔ جیسی اردو کے نثری اور
 شاعر کے یہاں نہیں۔ مثلاً

دشنام یاد طبع حزیں پر گراں نہیں لے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

فعلہ دل کو ناز تا لبش ہے اپنا جلوہ ذرا دکھا دینا

دیدہ حیران نے تماشا کیا دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

یہ مذر استخوان جذب دل کیسا گل آیا میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا گل آیا

کچھ نفس میں ان دلوں نگہائے جی آشیان اپنا ہوا بر باد کیا
 دل ربانی زلف جانوں کی نہیں بیچ و تاب طرہ ششما دکیا

۴۵ ان نصیبوں پر کیا خستہ شناس آسمان بھی ہے ستم ایسا دیکھا

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
چارہ دل سوا اے صبر نہیں سوہتا رے سوا نہیں ہوتا

پوچھنا حال یار ہے منظور میں تے ناصح کا مدعا جانا
شکوہ کرتا ہے بے نیازی کا تو نے موتمن بتوں کو کیا جانا

امتحان کے لئے جفا کب تک التفات ستم ناکب تک

مانگا کریں گے اب سے دعا بھاریکی آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گزرے صیاد کی نگاہ سوئے آشاں نہیں
لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شب فرق ملج ہی کئے آؤ گرا فسانہ خواں نہیں

نہ جائے کیوں دل مرغ چین کہ سیکھ گئی بہار وضع ترے سکر کے آنے کی
خیال زلف میں خود رنگی نے قبر کیا امید تھی مجھے کیا کیا بلا کے آنے کی

عبر و حشت اثر نہ ہو جائے کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے
کثرت سجدہ سے وہ نقش قدم کہیں یا مال سر نہ ہو جائے
میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

معانی کی ایمانی رمزیت اردو کے سب بڑے شاعروں کی کلام میں ملتی ہے
چند اور مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے موت آئی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے
 اتنی بھی بُری ہے بے قراری اب آپ سے اُنس کم کریں گے (آتش)
 کج ادائی یہ سب ہیں تک تھی اب زمانہ کو انقلاب کہاں (شفق)
 صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک دور نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی (بحرِ قح)
 تم دکھاتے تو ہو امیر کا دل اور جو وہ کوئی آہ کر بیٹھے (گستاخِ رامپوری)
 اب جنوں سے بھی توقع نہیں آزادی چاک دامان بھی بانداڑہ دامان بکلا (امیرِ مینائی)
 کیوں جنوں پھر نہ بیاہاں میں بہا آئی ہو بڑھ چلا ہے میرے دہن سے گریاں میرا (فانی)
 بہت نجل ہے تیرے درد سے دعا میری یہ خوف ہے کہ نہ سن لے کہیں خدا میری (فانی)
 زندانیوں کو آکے نہ چھیڑ کرے بہت جان بہارِ زر گس رسوا کہیں جسے (خیرت)
 مرگ عاشق تو کچھ نہیں سکیں اک میحانِ نفس کی بات گئی (صغیر)
 گلشن بہار پر تھا نشیمن بنالیا میں کیوں ہوا اسیر مرا کیا قصور تھا (جگر)
 انسانی شعور اور تحمتِ شعور میں بہت کچھ ہے جسے لفظوں میں صراحت (ثاقب لکھنوی)

ظاہر نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ اس کے کوئی خارجی معین خطوط نہیں ہوتے بلکہ ایک مبہم سا احساس ہوتا ہے۔ اس قسم کے شعوری یا تحت شعوری تاثرات و احساسات کو صرف رمز و ایما ہی کے ذریعہ سے بیان کرنا ممکن ہے۔ چنانچہ غزل کے ہر عمدہ شعر میں ایک عنصر ایسا ہوتا ہے جو معنی سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس سے جو مسرت یا تاثر حاصل ہوتا ہے اس کی وہی نوعیت ہوتی ہے جو نغمہ و موسیقی سے حاصل ہوتی ہے۔ تغزل موسیقی سے بہت قریب ہے اور اسی میں اس کی پائنداری اور قوت کا راز مخفی ہے۔ لیکن شعر اور موسیقی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ شعر الفاظ کا جامہ زیب تن کرتا ہے جن کے کچھ نہ کچھ معنی ہوتے ہیں اور وہ عمرانی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے ذریعے سے صرف ان تصورات کا اظہار ممکن ہے جن میں دوسرے شرکت کر سکیں۔ ہر لفظ حقیقت میں ایک تصور ہے جو اپنے اندر بعض مخصوص تاریخی اور تمدنی لوازمات پوشیدہ رکھتا ہے۔ لیکن موسیقی لفظوں سے بے نیاز ہو کر رمز و علامت سے جمالیاتی اثر آفرینی کرتی ہے۔ شعر میں وزن اور بحر اور قافیہ اس کی ایمانی کوتاہی کو بڑی حد تک دور کر دیتے ہیں۔ اور خود لفظ اپنی مکانی اور عمرانی نوعیت کے باوجود زبردست ایمانی قوت رکھتے ہیں۔ بشرطیکہ انھیں ٹھیک طور پر استعمال کیا جائے۔ بعض بحریں ایسی پھرتی ہوئی اور قافیے بولتے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ بجائے خود شعر کے معنی سے زیادہ جاذب قلب و نظر ہوتے ہیں۔ سنتے ہی ان سے احساس متاثر ہوتا ہے۔ بعد میں دماغ معنی پر غور کرتا ہے۔ معنی اور لفظ دونوں سے زیادہ اہم خود شعر ہے جو اگرچہ بادی النظر میں لفظ اور معنی دونوں کے مجموعہ سے عبارت ہوتا ہے لیکن حقیقت میں دونوں سے الگ اپنا آزاد طلسمی وجود رکھتا ہے۔ شعر صرف احساس و خیالات کو منتقل کرنے کا نام نہیں بلکہ وہ اس سے کچھ زیادہ بھی ہے وہ لوگ جو شعر کے مقصد کو سمجھنے کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ انھیں

اس کا موقعہ نہیں ملتا کہ وہ یہ سمجھیں کہ خود شعر کیا ہے۔ اس قسم کے نقاد اکثر و بیشتر شعر کی موسیقیت کو نہیں محسوس کرتے۔ تحلیل و تجزیہ شعر کی روح کو مجروح کر دیتا ہے۔ شعر کے بنیادی تصور کی جب توجہ کی جائے تو وہ نثر بن جاتا ہے۔ شعر کی شعریت بیان نہیں کی جاسکتی۔ اس نقطہ پر پہنچ کر نقاد کا نقد و نظر سکوت سے بدل جاتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ اس ضمن میں جو کچھ کہا گیا وہ کچھ بھی نہیں۔ ابھی سب کچھ کہنا باقی ہے۔ شعری رمز کے آگے نطق و بیان سر بجر بیان نظر آتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ غزل کے شعر کو صرف اپنے ذاتی تجربہ کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے۔ جس طرح ہم میں سے ہر ایک کی انفرادیت الگ ہے اسی طرح ہر ایک کے ذاتی تجربے علیحدہ ہیں۔ اس لئے شعر ہمیشہ کے علیحدہ علیحدہ معنی ہمیشہ رہیں گے اور انفرادی احساس کی طرح شعر کی شعریت کا تعین بڑا دشوار رہے گا۔ ممکن ہے دو اشخاص کم و بیش ایک ہی قسم کے اشعار کو پسند کرتے ہوں لیکن ان اشعار سے جو تاثرات مترتب ہوتے ہیں وہ دونوں کے لئے مختلف ہوں۔ ہر عہد کی تنقید میں شعر سے مختلف مطالبے کئے جایش گئے اور مطالبہ کرنے والے اپنی اپنی جگہ حق بجانب ہوں گے کسی زمانے میں بھی کسی شخص کا یہ دعویٰ کرنا کہ شعر کو ایسا ہونا چاہیے اور ایسا نہ ہونا چاہیے صحیح نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہر زمانے میں شعر غزل سے جو مطالبہ کیا جائے گا اس میں چند باتیں قدر و شہرت کے طور پر ملیں گی۔ مثلاً یہ کہ وہ موسیقی میں رچا ہوا ہو۔ ہمارے جذبات و شعور میں نزاکت پیدا کرے اور زندگی کے واقعات اور تجربوں کو رمز و کنایہ کی صورت میں اس انداز سے پیش کرے کہ ہم اپنی طور پر انھیں پہلے سے بہتر محسوس کر سکیں اور پہلے سے بہتر سمجھنے لگیں۔ الفاظ "زندگی" بہت وسیع اور جامع لفظ ہے۔ اس میں ان حقائق حیات کا تعین کرنا پڑے گا۔ جو غنائی شاعری یا غزل کا موضوع بنا سکتے ہیں۔ پن چکی

اور ریل گاڑی نظم کے موضوع ہو سکتے ہیں لیکن غزل کے موضوع نہیں بن سکتے۔ داستانِ حسن و عشق کے علاوہ جو کبھی فرسودہ نہ ہوگی حکمت و اخلاق اور تصوف کے نکات بھی غزل کا موضوع رہے ہیں۔ لیکن انھیں محض گوارا کیا گیا ہے۔ اس کا اصل موضوع ہمیشہ عشق مجازی ہی رہا۔ غزل گو شاعر کے نزدیک عشق پوری زندگی پر حاوی ہے۔ زندگی نام ہے علانی کا جہاں تعلق ہوگا وہاں جذبہ ہوگا اور جہاں جذبہ ہوگا وہاں تعلق بھی ضرور ہوگا۔ غزل گو شاعر کی رمز آفرینیاں اور استعارے زندگی کے فلسفی علانی کی تصویریں ہیں۔ ممکن ہے بظاہر معلوم ہو کہ یہ تصویریں زندگی کی ہو بہو نقل نہیں۔ لیکن نقل تو شاعر کے پیش نظر کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ اشیاء اور حقائق کو ویسا نہیں دیکھتا جیسے کہ وہ ہیں یا بظاہر نظر آتے ہیں۔ وہ حیات و کائنات کے مظاہر کو اپنے جذبہ کے ساتھ مربوط کر لیتا ہے اور پھر دیکھتا ہے کہ ان کی کیا شکل نکلی۔ وہ اپنے جذبہ درون سے زندگی کی تصویر میں رنگ آمیزی کرتا ہے، جیسی تو وہ جاذبِ نظر بنتی ہے۔

غزل گو شاعر کی درون مینا اور تخیل نگاری کا مقصد حسن و عشق کی ابدی داستان کو ایمانی انداز سے بیان کرنا ہے۔ اس داستان کا وہ خود ہیرو ہوتا ہے۔ ضرور ہے کہ اس کا ہر شعر اس سکھول کا ایک قطرہِ حقیق ہو اور اس کے اندرونِ تجربہ کے کسی ایک لمحہ کا اس میں مکمل اظہار پایا جاتا ہو۔ عشق جذباتِ انسانی کا مترج ہے۔ عالم کی رونق اور ہماہمی اسی کی کرشمہ زائیں کی رہیں منت ہے۔ زیست کا مزہ بغیر عشق کے ممکن نہیں۔ یہ دوسکی دوا بھی ہے اور پھر خود ایسا درد ہے جس کی دوا نہیں۔ بقول غالب۔

مشتق سے طبیعت نے زیست کو نہ پایا درو کی دوا پائی درد لا دوا پایا
فسادِ محبت اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ خود انسانی زندگی۔ اس دل پذیر افسانے کے جتنے محوئے جیسے یادیں وہ انھیں سانسے بغیر نہیں رہتا۔ جھوٹے کیا خوب کہا ہے۔

کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی شاتاجار باہے جسکو قبتنایا دہوتا ہے
 بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ غزل لکھنے والے شاعروں کا ادعائے عشق مصنوعی
 اور ان کا معیار محبت پست ہے لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ اگرچہ
 اس میں شبہ نہیں کہ جب وہ حسن و جمال کا ذکر کرتے ہیں تو بالعموم ان کی
 مراد مجاز ہوتی ہے سوائے چند صوفیانہ رجحانات رکھنے والوں کے جو اس
 سے حقیقت مراد لیتے ہیں۔ سوائے تیر درو، نیاز بریلوی، اہنغر گوندوی
 اور چند دوسرے شعرا کے غزل نگاری میں عشق مجازی ہی کو کمال مبنی کے
 انداز میں پیش کیا گیا ہے اور حبیبی محبت کے وارداتوں اور معاطوں کو
 لطف بیان میں سمو کر دل پذیر بنایا گیا ہے۔ پھر اس وادی کا کوئی نشیب فراز
 ایسا نہیں جو ہمارے غزل گو شاعروں کی نظر سے بچ گیا ہو۔ ان کو محبت
 کی دنیا کے حقائق پسند ہیں۔ ان کے علاوہ خارجی عالم کے حقائق ان کے
 نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ اس واسطے وہ ان کی طرف اگر کبھی نظر
 اٹھاتے ہیں تو نظر پلٹ آتی ہے اور پھر وہ اپنے آپ میں گم ہو جاتے ہیں۔
 ان کے ذہن و فکر پر عشق کا جذبہ ایسا طاری رہتا ہے کہ وہ اسی کی بھیر
 سے دنیا کو دیکھتے ہیں، چاہے وہ حقیقت کی دنیا ہو یا مجاز کی۔

بقول ولی -

شغل بہتر ہے عشق بازی کا کیا حقیقی و کیا مجازی کا
 بعض غزل گو شاعروں کے ہاں شاید بازی اور کا مجبوری کے اشارے ملتے
 ہیں لیکن بالعموم بواہر ہوس اور محبت میں فرق و امتیاز کیا گیا ہے۔
 میر صاحب فرماتے ہیں :-

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر
 غالب کا شعر ہے -

ہر بواہر ہوس نے حسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی

میر صاحب نے عشقِ بتان کے شعری رمز کو ایک جگہ صاف طور پر واضح کر دیا ہے صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا ہے عشق سے بتوں کے مراد علاقہ اور جذبات عشق کی پاکبازی اسی طرح لازمہ شعر ہے جس طرح حسن کی معصومیت کا تصور عشقیہ واردات اور اپنی رنڈ مشربی کے لئے غزل گو شاعر جو الفاظ استعمال کرتا ہے وہ بطور علامات و رموز کے ہیں جن کے ذریعہ ان کہنی باتیں بھی کہی جاتی ہیں اور اس سلیقہ سے کہی جاتی ہیں کہ کیا کہنا۔ اس باب میں ہمارے شاعروں نے رمز نگاری کا جو کمال دکھایا ہے میں سمجھتا ہوں اس کی مثال دوسری زبانوں کے ادب میں ملنی دشوار ہے۔ رمز و کنایہ کی ایمائی قوت اور تشبیہ و استعارہ کی بدولت کلام کے حسن اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے اور لفظ و معانی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہ سامع پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ مجاز و حقیقت میں جس طرف چاہے اپنی توجیہ کے رخ کو پھیر دے۔ میر تقی میر کے اس شعر کو آپ دونوں طرح سے سمجھ سکتے ہیں اور دونوں طریقے پر اس کے معنی میں کوئی سقم نہیں پیدا ہوتا۔ اگرچہ میر صاحب عام طور پر مجاز ہی سے گفتگو کرتے ہیں اور ان کا عشق خالص انسانی عشق ہونے کے علاوہ کوئی اور دعویٰ نہیں کرتا۔ شعر ہے۔

کوئی ہو محرمِ شوخی ترا تو میں بوجھوں کہ بزمِ عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی
یا مثلاً غالب کا یہ شعر حقیقت اور مجاز دونوں پر حاوی ہے۔

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو جس کا خیال ہے گل جب قبائے گل
غزل میں دیدہ و دانستہ محبوب کے جنس کو نہیں ظاہر کرتے اس

لئے کہ رمز و ایما کا یہی اقتضا ہے۔ جب کبھی اس کا ذکر آتا ہے تو مذکر صفت و افعال استعمال کئے جاتے ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ بات غیر فطری

ہے۔ لیکن جو شخص روحِ غزل کا راز دہاں ہے اس کے نزدیک اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ غزل کی رمز نگاری کا یہی اقتضا ہے چاہے

کہ جس طرح حقیقت و مجاز کے فرق و امتیاز کو مبہم چھوڑ دیا گیا کہ ذوق خود اس کا فیصلہ کرے اسی طرح معشوق کے جنس کو بھی ابہام کے نقاب میں لپیٹ دیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مشرقی آداب اسے گوارا نہیں کرتے کہ محبوب کی نسوانیت کو بے پردہ کیا جائے اور دوسرے غزل کی ٹیکنک رمز و کنایہ کو تفصیل و تشریح پر مقدم قرار دیتی ہے۔ پھر چونکہ اردو غزل نے اپنی خوشہ چینی فارسی غزل سے کی تھی جس میں محبوب کی جنس کو مذکور ظاہر کیا جاتا تھا اس لئے اردو میں بھی یہی طریقہ مستقل ہو گیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت ایرانی تہذیب و معاشرت سے اتنی مشابہ تھی کہ ایسا کرنے میں کوئی قباحت نہ تھی۔ اگرچہ بعض جگہ غزلوں میں محبوب کی نسوانیت ظاہر ہو گئی ہے لیکن اکثر و بیشتر ایسا نہیں ہے۔ جہاں نسوانیت ظاہر کی گئی ہے وہاں بھی ایک خاص سلیقہ پیش نظر رہا ہے۔ نسوانیت کا جہاں اظہار ہو گیا ہے اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔ تیسرے صاحب کا شعر ہے:-
برقع کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آئے اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آئے غالب کے شعر ہیں:-

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز بیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام برہموس سر سے بیزدشنہ و مژگیاں کئے ہوئے
اک تو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ چہرہ فروغ نئے سے گلستاں کئے تئے
چاہے پھر کس کو مقابل میں آرزو زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے تھے

منہ نہ کھلے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں زلف سے چڑھ کر نقاب اس شوخ کے نہ کھلا

مومن خاں کے شعر ہیں:-

چاکر پے سے یہ غم ہے ہیں قلعے پردہ نشین ایک میں کیا کہ سبھی چاکر گریاں ہوں گے

تم اٹھ گئے محفل سے ذکر آتے ہی جنوں کا سایہ سے میرے وحشت لے رشک پئی اتنی

اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشین تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

حسرت کا شعر ہے پردہ سے اک جھلک جو دکھلا کے رو گئے مشتاق دید اور بھی لہجہ کے رہ گئے

ایسی شاہوں سے تو دیوان کے دیوان بھرے پڑے ہیں جن میں معشوق کے لئے مذکور صفات افعال لائے گئے ہیں تاکہ اس کی پردہ دری نہ ہو۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

میر تقی میر

یار عجب طرح بنگاہ کر گیا دیکھنا وہ دل میں جگہ کر گیا
تنگ قبائی کا سماں یار کی پیرہن غنچہ کو تہ کر گیا

اے نیکے یہ تھی کہاں کی ادا کھب گئی جی میں تیری بانجی ادا
بات کہنے میں گالیاں دے کر سنتے ہو میرے بد زبان کی ادا

وہ اک روش سے کھولے ہوئے بال ہو گیا سنبھل چین کا مفت میں پامال ہو گیا
دعویٰ کیا تھا گل نے تے رخ سے باغ میں سیلی نگی صبا کی سوئسنہ لال ہو گیا

غالب

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لب تشنہ تیر یہ بھی تھا
البتہ ہو تم اگر دیکھے تو آئینہ جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

خوب پردہ ہے کہ چلین سے لگے بیٹھے میں صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی ہیں
نظامِ رامپوری
انگلائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ دیکھا مجھے تو چھوڑ دے مسکرا کے ہاتھ

حسرت

بنے وہ رونقِ محفل جس انجمن میں ہے رہے بہارِ چمن ہو کے جس چمن میں ہے
اسی سے چھپتے ہیں ہونی ہے جس پر انکی نظر اگر یہی ہے تو امیدوار ہم بھی ہیں
نگاہِ یار سے اظہارِ انقیاد ہوا تو حل دل نے کہا: آشکارا ہم بھی ہیں

ناگوار ہے بہت تلخی، ہجرانِ لسیکن تم جو کہتے ہو گوارا تو گوارا ہے یہی
اربابِ اشتیاق سے پروانہ چاہیڈ اے حسن خود نما تجھے ایسا نہ چاہیے

دل آرزوئے شوق کا اظہار نہ کرے ڈرتا ہے مگر یہ کہ وہ انکار نہ کرے
ہم جو پرستوں پہ محماں ترکِ وفا کا یہ وہم کہیں تجھ کو گنہ گار نہ کر دے

لطف یہ ہے کہ بعض خواتین صاحبِ دیوان گزری ہیں۔ وہ بھی اپنے
لئے صفات و افعالِ مذکر استعمال کرتی ہیں اور اس طرح آدابِ غزل کی پوری
پوری پابندی کی جاتی ہے۔ صبا بی بیگم شاد آتش، نواب شاہ جہاں بیگم
شیریں والیہ ریاست بھوپال اور شمس النساء بیگم ترمذی مکھنوی کے کلام میں
اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ رمز و ایما کی کیفیت کو اور زیادہ بڑھانے
کے لئے غزل گو شاعر محبوب کے لئے عام طور پر ایسے الفاظ بطور استعارہ

استعمال کرتے ہیں جن سے جس ظاہر نہ ہو جیسے بت، صنم، نازنین، شوخ،
گلرو، گل، جاناں، دلدار، دلربا، دلبر، ظالم، تغافل، شمار، خانہ خراب،
تندخو، جفا جو، بے وفا وغیرہ۔ یہ الفاظ بغیر اسم اشارہ کے استعمال کئے جاتے
ہیں اور ان سے مراد محبوب ہوتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

بسانِ کاغذ آتش زدہ میرے گلرو ترے جلے بھنے اور جی بہار رکھے ہیں

(درد)

بیاں ہو چکی ہم سے اس گل کی خوبی سرو برگ رنگین نگاری کہاں تک

(حسرت)

تجھ سے ظالم کے پاس میں آیا جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا

(درد)

کون دل پرے کہ جس میں خانہ خراب خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا

(درد)

خدا جانے کیا ہوگا انجام اس کا میں بے صبر اتنا ہوں وہ ندخو ہے

(درد)

میلانِ دلربا ہو کیونکر وفا کے اوپر دیتا ہے جان عالم اسکی جفا کے اوپر

(میر)

برقع سے اٹھا چہرہ وہ بت اگر آئے اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے

(میر)

بیتے جی کوچہ دلدار نے جایا نہ گیا اس کی دیوار کا کسے سے سایہ نہ گیا

(میر)

نک بعد مرے میرے طرفداروں کئے تو کوئی بھیجیو ظالم کہ تسلی تو کر آوے

(میر)

آج اس راہ دل ربا گذرا جی پہ کیا جلتے کہ کیا گذرا

(میر)

خدا شر مٹا ہاتھوں کو کر رکھتے ہیں ناکش میں	کبھی میسے گریاں کو کبھی جاناں کے دہن کو
(غالب)	(غالب)
کیوں نہ ہو دلبروں کو شوقِ استم	اہلِ دل کو رہے بے کسی کی ہوس
(احسرت)	(احسرت)
ظالم کہیں روا نہیں عاشقی سے احتراز	کہدے اگر ہو شکِ سخنِ دادِ خواہ میں
(مومن)	(مومن)
دل میں اس شوخ کے جو راہ نہ کی	ہم نے بھی جان دی پر آہ نہ کی
(مومن)	(مومن)
کھل گیا عشقِ صنم طرزِ سخن سے مومن	اب چھپاتے ہو عبت بات بناتے کیوں ہوں
(مومن)	(مومن)
خوشی نہ ہو مجھے کیونکو قضا کے آنے کی	خبر ہے لاش پہ اس یوفا کے آنے کی
(امومن)	(امومن)
کسی طرح جو نہ اس بُت نے اعتبار کیا	میری وفات نے مجھے خوب شرمسار کیا
(داغ)	(داغ)
کیا صبا کو چہ دلدار سے تو آتی ہے	مجھ کو اپنے دل گم گشتہ کی بو آتی ہے
(داغ)	(داغ)
اس نازنین نے جب سے کیا ہے وہاں مقام	گلزار بن گئی ہے زیں و کن تمام
(احسرت)	(احسرت)
اس جفا جو سے یہ ایمائے تنہا تک	ہوسِ لطفِ عنایات چلی جاتی ہے
(احسرت)	(احسرت)
وعدہ رہا نہ یاد تغافلِ شعرا کو	کیا اب جوابِ دوں منگہ انتظار کو
(جلیل)	(جلیل)
ہے تیری جوانی کہ پھٹی پڑتی ہے ظالم	پر کوئی سنبھالے دل بے تاب کیوں تک
(جلیل)	(جلیل)

غالب نے سخن محبوب کو بلائے جان بتایا اور اس کی گہری شاعرانہ نظر نے اس کو تین اجزا میں تقسیم بھی کر دیا۔ عبارت، اشارت اور ادا۔

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیسا

یہی تینوں اجزا تغزل کے اصلی عناصر ہیں۔ غزل محبوب سے اور محبوب کی گفتگو ہے۔ اس کی خوبی اس میں ہے کہ کلام کا مقصد پورا ہو یعنی تاثیر۔ انسان کی ہر بات کا مقصد یا تو اطلاع دینا ہے یا تاثیر پیدا کرنا اول الذکر افادی پہلو رکھتا ہے جو نثر نے اپنے ذمے لے لیا۔ شعر کا اور خاص طور پر غزل کے شعر کا سرمایہ اثر و تاثیر کے خمیر سے بنتا ہے۔ تغزل کی تاثیر کا راز اس میں ہے کہ عبارت، اشارت اور حسن ادا کے رنگ سے تخیل اور جذبہ کی تصویر کی رنگ آمیزی کی جائے۔ ان رنگوں کی آمیزش کے لئے بڑا سلیقہ درکار ہے۔ مثلاً اگر غزل کے کسی شعر میں صرف اشارت کی خوبی موجود ہو اور عبارت اور ادا میں بھدپان پایا جاتا ہو تو شعر اوصحرا اور بے اثر رہے گا۔

عہد حاضر کے سب سے بڑے غزل گو شاعر حسرت نے بھی اس باب میں غالب کے خیال کی تائید کی ہے۔ اس کا شعر ہے۔

ہر حرف میں اس نامہ رنگین کے ہیں پنہاں

جدت کے، عبارت کے، اشارت کے نذایذ

فرق صرف اتنا ہے کہ مرزا غالب نے جس شے کو ادا سے تعبیر کیا تھا اس کو حسرت نے جدت کہا ہے۔ مرزا غالب نے عبارت، اشارت اور ادا کی

لے اگرچہ اس جگہ شاعر نے ادا سے ناز و ادا مراد لیا ہے لیکن ادا حسن اظہار کے لئے وسیع معنوں میں بھی آتا ہے۔ یہ حسن اظہار مختلف شکلیں اختیار کر سکتا ہے زبان و بیان کے ضمن میں یہی حسن ادا اسلوب و طرز کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

خوبیوں کو محبوب کی گفتگو میں محسوس کیا اور حسرت نے دوست کے نامہ مرنگیں میں لیکن حقیقت میں بات دونوں نے ایک ہی کہی ہے۔ ادا میں جب تک جدت نہ ہو وہ ادا نہیں ہو سکتی۔ اگر ایک ہی ادا بار بار دہرائی جائے تو وہ لازمی طور پر بے مزہ اور بے کیف اور بے اثر ہو جائے گی۔ جدت ہی حسن ادا کی ضمانت ہے۔ غرض کہ مرزا غالب اور حسرت نے سخن محبوب کا جو تجزیہ کیا ہے وہ غزل کی خارجی اور معنوی خوبیوں پر حاوی ہے اور اس کے محاسن کا مہیا کر کہا جاسکتا ہے۔ جبکہ محبوب کی باتوں میں عبارت، اشارت اور حسن ادا کی کارروائی ہے تو کیسے ممکن ہے کہ عاشق کی گفتگو ان شعری عناصر سے خالی رہے۔ غزل محض شاعر کا کلام نہیں بلکہ عاشق کا کلام ہے۔ اس پر وہی اصول عاید ہونے چاہئیں جن کی جھلک غالب اور حسرت جیسی حساس طبائع رکھنے والوں نے محبوب کے کلام میں دیکھی۔ بقول سبیر شاعر، عاشق اور دیوانہ ہم کیف ہوتے ہیں جنہیں عقل نے ایک ہی سانچے میں ڈھالا ہے۔ ان میں بہت سی باتیں مشترک کے طور پر ملتی ہیں۔ چنانچہ تجوید نہ ہونا چاہیے کہ ان کے معیار حسن و قبح میں بہت کچھ یکسانیت پائی جاتی ہے عاشق کی گفتگو بہت کچھ محبوب کی گفتگو کا انداز اور رنگ و بھنگ اڑا دیتی ہے۔ خواجہ میر درد نے اسی نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دل بھی تیرے ہی رنگ سیکھا ہے آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے
جگر نے اسی مضمون کو دوسرے انداز میں بیان کیا ہے۔
ترے حسن مغرور سے نسبتیں ہیں کہیں ہم نہ رہ جائیں مغرور ہو کر
دوسری جگہ کہا ہے۔

عشق کا سحر کامیاب ہوا میں ترا تو میرا جواب ہوا
ایک جگہ اس طرح جذب عشق کی تاثیر کو ظاہر کیا ہے۔
تاثیر جذب عشق کا اندر سے کمال آئینہ بن گئے تیری ایک اک داکہ ہم (جگر)

عاشق اور معشوق کے انداز فکر اور کلام کی یکسانیت اس لئے ضروری نہیں کہ دونوں ایک دوسرے کی بات سمجھ سکیں۔ معاملات شوق زبان و منطق سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اس منزل میں بغیر زبان جانے ہوئے بھی سب مطالب ادا ہو سکتے ہیں۔ حافظ نے کیا خوب کہا ہے۔

بکے است ترکی د تازی دریں معاملہ حافظ

حدیث عشق بیاں کن یہ ہر زباں کہ تودانی
اسی مضمون کو حسرت نے بھی ادا کیا ہے۔

دل خوب سمجھتا ہے ترے حرفِ کرم کو

مہرچند وہ اردو ہے نہ ترکی ہے نہ تازی

حسن و عشق غزل میں زندگی کی تمثیل بن جاتے ہیں اور شاعران کے ذریعے سے رموز حیات کو بے نقاب کرتا ہے۔ عشق انسانی فطرت میں ودیعت ہے۔ یہ ایک فطری کشش ہے جو دل میں ذوق اور شورش پیدا کر دیتی ہے۔ کوئی انسان چاہے وہ کتنا ہی بے حس کیوں نہ ہو اپنی فطرت کی اس اساسی حقیقت سے ناواقف نہیں ہو سکتا۔ اسی کے تانے بانے سے ذات اپنی قبائے صفات بناتی ہے۔ یہ مجاز اور حقیقت دونوں پر حاوی ہے اور اس کی منزلیں اتنی ہی وسیع ہیں جتنی کہ کائنات۔ حسن کی قدر افزائی چراغِ عشق کی روشنی ہی میں ممکن ہے عشق اور حسن دونوں اپنی اپنی جگہ کائناتِ مدرک کے اہم مظاہر ہیں شاعران و دونوں کو برابر کا رتبہ دیتا ہے۔ جس طرح بغیر عشق کے حسن کا وجود بے معنی ہے اسی طرح بغیر حسن کے عشق کے مقصود و مہنا کا مین کرنا ممکن نہیں اس مضمون پر حسرت کے متعدد شعر ملتے ہیں۔ یہ کہتا ہے۔

سچ پوچھئے تو حسن سے کچھ کم نہیں ہے عشق یہ جان عاشقان ہے وہ جانانِ عاشقان
اس شعر میں اگرچہ حسن و عشق کا مرتبہ برابر تسلیم کیا گیا ہے لیکن حوالہ کامر کو عاشق کی ذات ہے نہ کہ محبوب۔ عشق میں ایک طرح کی داریوں بینی اور خودی کا احساس شدت سے پایا جاتا ہے عشق کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ جذبہ کو ہر چیز پر فوقیت دے۔

یہاں تک کہ بعض اوقات خود حسن پر بھی۔ جذبہ ذات الہی کی طرح مطلق محض بننا چاہتا ہے۔
 حسرت حسن کی عظمت تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں
 بیان تمنا اور زبان محبت سمجھنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔
 نہ سمجھا سوا حسن کے اور کوئی بیان تمنا زبان محبت (حسرت)
 عشق چاہے کتنا ہی رام حسن رہے لیکن اس کو اپنے وجود کی اہمیت کا ہمیشہ
 احساس رہتا ہے۔

عشق ہر چند رام حسن رہا پر نہ چھوٹی برابری کی ہوس (حسرت)
 پھر اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ انصاف کا تقاضا ہے کہ عشق صادق حسن
 کامل سے نہ ذکر برتری کرے اور نہ سے۔

عشق صادق نے حسن کامل سے نہ سا ذکر برتری نہ کیا (حسرت)
 لیکن کبھی کبھی نیا زندی کے عالم میں عشق حسن کی فوقیت کو عارضی طور پر تسلیم
 کر لیتا ہے۔ قافی کا شعر ہے :-

خود حسن کمال حسن ہے یعنی حسن جہاں ہے کامل ہے اور عشق مال عشق ہے یعنی عشق میں کامل کی نہیں
 کبھی کبھی حسرت نے بھی حسن کے رتبہ کو عشق سے بلند کر دیا ہے :-
 رتبہ تر سے حسن صنوں کا رکا شوق کے رتبے سے بھی فوق ہے (حسرت)
 دوسری جگہ کہا ہے۔

بڑھا تو خوب مگر نار عاشقی کا جلال حریف جلوہ نور جمال ہو نہ سکا
 اور چونکہ عشق وجدانی طور پر جانتا ہے کہ سوائے حسن کے اس پر کوئی دوسرا حکمران
 نہیں ہو سکتا اس لئے وہ کبھی کبھی اپنی گردن نیاز اس کے آگے خم کر دیتا ہے۔
 سرعجز حسرت بھی خم کیوں ہوتا ترانا ہے حکمران محبت (حسرت)

(۱۱) میر حسن دہلوی
 عشق کا اب مرتبہ پہونچا مقابل حسن کے بن گئے بت ہم بھی آخر اس صنم کی یادیں

نیاز شوق کے موضوع پر حسرت کی زمزمہ سنجی ملاحظہ ہو۔

روشن جمال یار سے دینائے عشق ہے گویا شرابِ حسن بہ مینائے عشق ہے
کیا کیا فراقِ حسن میں ہے نغمہ ریزِ غم جانِ حزیں کہ بیلِ گویائے عشق ہے
لے حسن بے مثال تری دید کے لئے درکارِ دیدہ دل بینائے عشق ہے
تیرا خیال منزلِ مقصود آرزو تیرا جمال شاہدِ رعنائے عشق ہے
مدت کے بعد پھر وہ ہوئے نالِ کرم یہ بھی تو لاکِ طریقہٴ احیائے عشق ہے
پہناںِ حجابِ نازیں ہے صورتِ جمال پیدا صرف شوق سے معنائے عشق ہے
حسرت کو پائے بندیِ ایمان سے کیا غرض وہ کافرِ جمال ہے ترسائے عشق ہے
ارو کے تغزل کا میلان زیادہ تر عشقِ مجازی کی طرف رہا۔ اگرچہ بعض شاعروں
نے مجازی کی منزل سے آگے بڑھ کر حقیقت کے رموز و اسرار کی بھی نقاب کشائی
کی ہے۔ دراصل عشقِ مجازی ہی میں انسانی قلب پر وہ وارداتیں گذرتی ہیں
جن کا براہِ راست اس کو تجربہ ہوتا ہے اور جو اس کے لئے جذباتی اصلیت
رکھتی ہیں۔ مجازی حسن چاہے کتنا نامکمل اور زوال پذیر ہو لیکن اس کی گیر لیا
عالمگیر ہیں۔ جمالِ لیاقتی تجربہ خود علم کی اعلیٰ ترین صورت ہے جس کی بدولت
صد اقت اور افادیت کے تضاد کو رفع کیا جاسکتا ہے۔ اس تجربہ میں محفل کے
خواب سے حقیقت پیدا ہوتی ہے جس کی پرورش جذبہ اپنے آغوش میں کرتا ہے
اور اشیاء اور حقائق کے تعلق کا تعین من مانے طور پر کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے
غزل گو شاعر کا نقطہٴ نظر داخلی ہوتا ہے۔ وہ حقیقت کو استعاروں اور کنایوں
کے جال میں اس طرح پھانسا چاہتا ہے کہ اس کا تعلق اس کے خیالی پیکروں سے
ٹوٹنے نہ پائے جو اس کے دل کی دنیا میں براجمان ہیں۔

۷۔ انفرادیت خود مکتبی ہونا چاہتی ہے۔ وہ اپنی ذات کے علاوہ کسی
خارجی منظر سے چاہے وہ کتنا ہی جمیل و حسین کیوں نہ ہو دل بسگی پیدا نہیں
کرنا چاہتی اس لئے کہ یہ اس کے ضعف اور بے کمالی پر دلالت ہوگی۔

لیکن فطرت نے انفرادیت کے پہلو میں عشق کی کسک پیدا کر دی تاکہ وہ کافی بالذات ہونے کے احساس کو شکست دے اور اپنے بعض دوسرے مقاصد عالیہ کی تکمیل کرے۔ درود اشتیاق کی کسک نے کافی بالذات خودی کو غیر خود کی کشش سے وابستہ کر دیا جسے فطرت کی زبردست کامیابی تصور کرنا چاہئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو زندگی اپنی انفرادیت کی تنہائیوں میں گھٹ کر رہ جاتی اور اس کی افسردگی اس کی دائمی ہلاکت کا پیش خیمہ ہوتی۔ غائب نے اس نکتہ کو بڑے لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک طرف تو انسانی خودی کی خواہش ہے کہ وہ آزاد رہے اور اپنے آپ کو کسی سے وابستہ نہ کرے اور دوسری جانب فطرت یعنی غیر خود کی دلبستگی اس کو اپنی محبت کے دام میں پھانسنے کی فکر میں ہے۔ غرض کہ انسانی شخصیت کو عجیب و غریب کشمکش آتے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ شاعر خدا سے دعا مانگتا ہے کہ تو ہی میرے آزاد منشی کے دعوے کی شرم رکھ لے اس لئے کہ اگر میں اس کی زلف میں گرفتار ہو گیا تو میرا یہ دعویٰ باطل ہو جائے گا۔ شر ہے۔

وہ حلقہ ہائے زلف کین میں ہیں لے خدا رکھ لیجو میرے دعوے وارستگی کی شرم دوسری جگہ اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے کہ محبت سے مفر نہیں۔ سرو باوجود اپنی ساری آزادی کے گلشن کے زنداں خانہ میں گرفتار ہے اس لئے اس کا آزادی کا دعویٰ جھوٹا ہے۔

افت گل سے غلط ہے دعویٰ وارستگی سرو ہے باوصف آزادی گرفتار حسن فطرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس نے بس اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ انسان تنہے دل میں درود اشتیاق پیدا کر دیا بلکہ اس کے نفس کو جمالیاتی حس سے آشنا کر دیا اور اس کو یہ صلاحیت دی کہ وہ تخلیق حسن کرے جس طرح وہ آفرینش اخلاق کرتا ہے۔ جمالیاتی حس عقل و ارادہ دونوں سے مختلف ہے لیکن ان دونوں کی طرح اس کا وجود بھی ذہنی ہے۔ جس طرح عقل صداقت،

کی اور ارادہ نیکی کی تخلیق کرتا ہے اسی طرح جمالیاتی حسن عالم فطرت اور عالم انسانی میں حسن کی تخلیق کرتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تخلیق حسن خارجی محرکات کی محتاج ہے؟ اس سوال کے جواب میں ارباب فکر میں بڑے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ہر ایک نے عشق و حسن کی داستان کو اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ تخلیق حسن کھیلے کسی نے اپنے اندرونی تجربوں کو کافی خیال کیا اور بعض نے تھوڑا بہت خارجی محرکات کا استعمال کیا۔ ہماری شاعری میں فکر و احساس کے یہ دونوں انداز ملتے ہیں اور دونوں میں جمالیاتی قدروں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

چونکہ درون بینی تغزل کی بنیادی خصوصیات میں ہے اس لئے بعض غزل گو شاعروں میں یہ میلان قدرتی طور پر پیدا ہو گیا کہ تخلیق حسن کو خارجی محرکات سے بے نیاز کر لیا جائے۔ یعنی عشق کیا جائے بغیر محبوب کے۔ درون بینی نے یہ راہ بتائی کہ خود اپنی ذات کو ہی اپنا معشوق کیوں نہ بناؤ۔ یہ خیال اردو شاعروں کی ایجاد نہیں۔ اہل یونان کے ہاں بھی اس کا پتہ چلتا ہے یونانیوں کے دیو مالان دریا سے دریا سے قنر کے بطن سے ایک فرزند تولد ہوا جو بڑا ہو کر پورے یونان میں سب سے زیادہ خوش رونو جوان مانا جاتا تھا ایک دن کسی چشمہ کے پانی میں اس نوخیز خوش جمال نے اپنا عکس دیکھا تو دل و جان سے خود اپنی صورت پر فریفتہ ہو گیا۔ اپنے عکس کو دیکھنے میں اس پر ایسی محویت طاری ہوئی کہ چشمہ میں گر کر ڈوب گیا۔ اہل یونان کا اعتقاد تھا کہ اس خوشرونو جوان کی روح ایک خوبصورت پھول کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اہل یونان نے اس کو زرخس کے نام سے موسوم کیا۔ زرخس کا پھول آج سے شا بہت رکھتا ہے۔ اس وقت سے آج تک وہ کائنات حسن کا تماشا بنی ہے۔

یونانی نو جوان زرخس کے نام پر یورپ کی مختلف زبانوں کے ادب میں ”زرخسیت“ (زرخس ازم) کی اصطلاح رائج ہوئی جس کا مطلب یہ

ہے کہ آرٹسٹ اپنی ذات کو کائنات کا مرکز حوالہ قرار دے۔ اس اصول کے حامیوں میں انتہائی دروں بینی اور انفرادیت پائی جاتی ہے اور جس طرح وہ اپنی ذات کو مصد رنہ و شہ تصور کرتے ہیں اسی طرح اس کو خالقِ حسن بھی خیال کرتے ہیں۔ چونکہ تخلیقِ حسن کا تعلق اپنی ذات سے ہے اس لئے نہ کسی خارجی محبوب کی حاجت ہے اور نہ جذبیہ و عشق کی کارفرمائی کی۔ اس مسلک کے شاعروں اور ادیبوں نے حسن کو مطلق تجریدی شکل میں پیش کیا جو زندگی کی حرارت اور حرکت سے یکسر محروم ہے۔ یہ ایک طبع کا زندگی سے گریز ہے۔ اس قسم کے تصورات کا یہ اثر ہوا کہ احساسِ جمال کو عشق سے بے تعلق کر دیا گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے انفرادیت پرست آرٹسٹوں نے اپنی ذات کو عشق و محبت کا مرکز ٹھہرا کر خارجی حسن سے بے نیازی کا اظہار کیا۔ لیکن ادب اور آرٹ کے یہ دونوں رجحان انتہا پسندی پر مبنی ہیں۔ اس لئے انھیں قبولِ عام حاصل نہ ہو سکا۔ دراصل جذباتی حقیقت دونوں انتہاؤں کے درمیان معلوم ہوتی ہے۔ اردو و غزل نگاروں میں بعض کے ہاں یہ رجحان ملتا ہے کہ عشق کو حسن سے بے نیاز کر لیا جائے۔ خاص طور پر عہدِ جدید کے شاعروں میں جگر کے یہاں اس قسم کے خیالات ملتے ہیں۔ مثلاً اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مایوس ہو کے پٹلیں جب ہر طرف سے نظروں دل ہی کو بت بنایا دل ہی سے گفتگو کی

کوئین کی ان بھول بھلیوں سے نکل جا اپنی ہی طرف دیکھ ادھر جانہ اُدھر جا

کہاں کا مئے خانہ کس کا ساقی کچھ اور بڑھنے دو بے خودی کو
یہی بنائے گی جام و ساغر۔ یہی کرے گی شراب پیدا

بے تابیوں نے کام دیا دستِ ناز کا آخر پٹ کے سو گئے دردِ نہاں سے ہم

دستِ جنونِ عشق کی گھلکاریاں نہ پوچھ ڈوبا ہوا ہوں سر سے قدم تک بہاریں

فیضِ سوزِ عشق سے لے دل سراپا دے دل جو بہارِ بزمِ مجھ میں ہے سائے گلستان میں نہیں

نازک مزاجِ عشق کی اللہ سے خاطرین اپنی نزاکتوں کو مرا دل بسنا دیا

ایک گوشے میں سمٹ آئے ہیں دونوں عالم میرا دامن ہے کسی زور کا آغوش نہیں
ان شعروں میں یونانی دیوانہ کے کیر کمر زنگ کی تنقید کی گئی ہے۔

اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا ہوتا ہوں میرے آغوش کو اب حسرتِ آغوش نہیں

دیکھئے کیا شورا اٹھتا ہے حرمِ ناز سے سامنے آئینہ رکھ کر خود کو ایک سجدہ کریں
جگر کے چنر اور اشعارِ ملاحظہ ہوں۔

بھرم کھونا کہیں اسے دل از عشق معتبر ہو کر گزر جا ہاں گزر جا حسن سے بھی بے خبر ہو کر

عشق ہے اعتماد کے قابل حسن کا اعتبار کون کرے

ہیں بن جائیں کیوں نہ صورتِ یار دل کو پا بند یار کون کرے

جس طرح عشق حسن سے بے نیاز ہو کر اپنی علو و ہستی کا تحقق کر لیتا ہے

اسی طرح وحشی بہار سے بے نیاز ہو کر صحرا کی طرف بھل جاتے ہیں۔

سوئے صحرا بھل چلے وحشی انتظارِ بہار کون کرے

عشق کیا پیر ہے! اک حشرِ آغوشِ خیال حسن کیا! خوابِ بے اک چشمِ تماشائی کا

اللہ اللہ زری وار ہو گئی عشقِ میری اس جگہ ہوں کہ جہاں حسن بھی دیوانہ ہے

صیاد میرے دم سے ہیں سائے یہ چھپے جب میں نہیں تو رونق گلزار بھی نہیں

بھڑے ہوئے سین نگاہوں میں حسن کے جلنے یہ کیا مجال جہاں میں ہوں اور بہار نہو
کہاں کے سر و صنوبر کہاں کے لالہ و گل نگاہ ہی میں جو کیفیت بہار نہو

لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ جگر نے ہمیشہ عشق کو حسن سے بے نیاز کر دیا ہے
وہ عشق کے لئے حسن کی اہمیت کو محسوس کرتا ہے اور اس کی وسعتوں سے بخوبی
واقف ہے اس کا شعر ہے۔

وہ بھی نکلی اک شعاع برق حسن میں جسے اپنی نظر سمجھا کیا
جگر ہر موقع پر خودی کو غیر خود کے عشق سے بے نیاز نہیں کرتا۔
حسن برق و ش کی ادائیں اسے بھی گھائل کرتی ہیں اور بے تابی محبت و جھکون
غم بنتی ہے۔ اس کی اس غزل کا موضوع یہی ہے۔

سب ان پر ہیں تصدق وہ سائے تو آئیں
اٹھکوں کی آرزوئیں آنکھوں کی التجاؤں
اُس سے بھی شمع تر ہیں اس شمع کی ادائیں
کر جائیں کام اپنا لیکن نظر نہ آئیں
اس حسن برق و ش کے دل سوختہ وہی ہیں
شعلوں سے بھی جو پھیلیں دامن کو بھی پچائیں
آلودہ خاک ہی میں رہنے دے اسکو نافع
دامن اگر جھٹک دوں جلوے کہاں سماؤں
بیتابی عبت وجہ سکون عسیم ہے
آغوش مضطرب میں خوابیدہ ہیں بلائیں
اشعار بن کے نکلیں جو سینہ جگر سے
سب حسن یار کی تھیں بیاختہ ادائیں

دوسری غزل ملاحظہ ہو جس میں اپنی خودی کو غیر خود کے جمال سے وابستہ کر دیا ہے۔
طا کے آنکھ نہ محروم ناز رہنے دے
بچھے قسم جو مجھے پاکباز رہنے دے
میں اپنی جان تو قربان کر چکوں تجھ پر
یہ چشم مست ابھی نیم باز رہنے دے
یہ تیرا نہ ہیں تو شوق سے چلائے جا
خیال خاطر اہل نیاز رہنے دے
ازل سے حسن تو عاشق فواز ہے لیکن
جو عشق ہی اسے عاشق نواز رہے دے

جگر نے کبھی تو عشق کو حسن سے بے نیاز کر دیا ہے اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی خودی حسن برق و ش کی اداؤں سے بری طرح گھائل ہے۔ کبھی ایسا عسوس ہوتا ہے کہ وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ اساسی حقیقت عشق ہے یا حسن؟ مرکز حوالہ خود ان کی ذات ہے یا محبوب؟ اس شعر میں اس کیفیت کا اظہار کیا ہے۔

سب کچھ ہوا مگر نہ کھلا آج تک یہ راز تم جان آرزو ہو کہ ہم جان آرزو عاشقانہ شاعری کا اعلیٰ ترین مقام عشق الہی یا عشق اقدار ہے۔ درمیانی مقام عشق مجازی اور اسفل مقام ہوس پرستی کے جذبات۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عشق حقیقی اور عشق مجازی میں فرق و امتیاز نامعین ہو جاتا ہے۔ جگر نے ایک موقع پر عشق حقیقی کو عشق مجازی کے پرتو سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ صوفیاء تغزل میں مجاز کو حقیقت کا پرتو بتاتے ہیں۔ جگر کے اس نقطہ نظر میں تغزل کی حقیقی روح کا رفرمان ہے۔

صوفی نے جس کو شاہد مطلق سمجھ لیا اک پر تو لطیف تھا حسن مجاز کا اردو تغزل میں عشق مجازی کے واردات و معاملات کو پیش کرتے ہوئے

ایسے ایسے لطیف مطالب و معانی میدانے لگے ہیں کہ ان کی مثال شاید فارسی کے علاوہ دنیا کی کسی اور زبان میں موجود نہیں۔ عشق و محبت کا مضمون بظاہر چاہے کتنا فرسودہ ہی لیکن حقیقت میں اس کی تازگی میں کبھی کمی نہیں آسکتی۔ اس جذبہ کی نمایاں خصوصیت اس کی وسعت ہے جسے تغزل کے سینے سروں میں ظاہر کیا گیا ہے جو اپنی خود رفتگی اور درد مندی کے سبب سے تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ جس طرح انسانی خواہشات اور تمناؤں کی تازگی میں کبھی کمی نہیں آسکتی اسی طرح عشق و محبت کے لوازمات اور ان کی دلچسپیاں اور رنگینیاں انسانوں کو ہمیشہ اپنی طرف مائل کرتی رہیں گی۔ اگر حدیث شوق بیان کرنے والے کے لب و لہجہ میں اخلاص اور اس کے احساس میں شدت ہے تو دل چوٹ کھائیں گے اور سننے والے متاثر ہوں گے۔ لیکن اگر اس کے پیش نظر محض لفظوں کا الٹ پھیر یا ایسی مضمون آفرینی ہے جو تصنع کے پوتے پر پڑا کرنا

چاہتی ہے تو اس کی بات بے اثر رہے گی اور خود کہنے والے کو جھٹلائے گی۔
 غزل میں عشق کی واردات کے علاوہ محبوب کے حسن و جمال، ناز و
 ادا اور جرجر و جفا کا بیان اس طور پر کیا جاتا ہے کہ سامع کے حافظہ میں بھولی
 پسری یا دیں تازہ ہو جائیں اور وہ شاعر کے تجربوں میں خود بھی شریک ہو سکے۔
 لیکن غزل گو شاعر ہر حالت میں ایک قسم کا لحاظ اور پردہ برقرار رکھتا ہے تاکہ
 اسے جو کچھ کہنا ہے اس میں ابتذال اور رکاکت راہ نہ پائے۔ بیان مجاز میں
 بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اس واسطے کہ اس کے ڈانڈے ہوس پرستی سے
 آسانی کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ غزل کے بڑے بڑے استادوں نے ہمیشہ اس
 کا خیال رکھا ہے۔ میر صاحب کی شاعری قمار مجازی عشق کی شاعری ہے۔
 انھوں نے انسانی عشق و محبت کے لطیف اور نازک جذبات کی سچی تصویریں
 کھینچی ہیں جن میں نقص نام کو نہیں۔ ان کے ہاں معاملہ بندی اور واقعہ گذاری
 ہے لیکن اس کی سطح بہت بلند ہے۔ ان کی سادگی پر لاکھ تکلف قربان ہیں
 ان کا ہر لفظ بلاغت اور سوز و گداز میں رچا ہوا ہوتا ہے اس لئے نثر کی
 طرح دل کے پار ہوتا ہے۔ ان کا سنجیدہ ذوق سخن اور اسلوب بیان بے مثل
 ہے۔ ان کے عشق و محبت میں مجازی اور انسانی پہلو ہمیشہ نمایاں رہتا ہے۔
 ان کا کلام سن کر سامع لطف اندوز ہونے کے ساتھ اپنی فطرت میں بلندی اور
 بالیدگی محسوس کرتا ہے۔ سینے وہ کیا فرماتے ہیں۔
 جو تو ہی صنم ہم سے بسینار ہوگا تو جینا ہمیں اپنا دشوار ہوگا

جمن میں گل نے جو گل دعوے جمال کیا	جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا
بہار رفتہ چہر آئی ترے تماشے کو	جمن کو یمن قدم نے ترے ہمال کیا
لگانہ دل کو کہیں کیا نہ نہیں تو نے	جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
 لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کلم

اب سنگ مداوا ہے اس آشفۃ سری کا
 آفاق کی اس کارگر شیشہ محری کا

دل سے شوق رخ نمونہ گیا
 ہر قدم پر تھی اس کی منزل لیک

جھا نکھا تماکت کجھو نہ گیا
 سرے سودائے جستجو نہ گیا

ایک پیش اس کے روبرو گیا
 دل میں کتنے مسودے تھے ولے

اے نچلے یہ تھی کہاں کی ادا
 جادو کرتے ہیں اک نگاہ کے بیج

کھب گئی جی میں تیری بانگی ادا
 دیکھی چلنے میں ان بتاں کی ادا

بے ادائی تھی آسمان کی ادا
 خاک میں مل کے میسر ہم سمجھے

جھائیں دیکھیاں بے وفائیاں دیکھیں
 بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

میں تو خواباں کو جانتا ہی ہوں
 قفس و فرہاد کے وہ عشق کے شور

پر مجھے بھی یہ خوب جانتے ہیں
 اب مرے عہد میں فسانے ہیں

عشق کرتے ہیں اس پڑی رو سے
 میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں

آرزو اس بلند و بالا کی
 دیدنی ہے شکستگی دل کی

کیا بلا میرے سر پہ لائی ہے
 کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

یعنی اک بات سی بسائی ہے
 کیا دوانے نے موت پائی ہے

مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میر

ناز کی اس کے لب کی کیا کہیے^{۶۰} پتھری اک گلاب کی سی ہے
 میں جو بولا کہ یہ آواز اسی خانہ خراب کی سی ہے
 میسر ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

خدا کرے میرے دل کو تک اک قرار آئے کہ زندگی تو کروں جب تنک کے یار آئے
 ہیں تو ایک گھڑی گل بغیر دو بھر ہے خدا ہی جانے کہ اب کب تلک بہا آئے
 نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر تیر کہ اب جو دیکھوں اسے میں بہت پیار آئے

میر صاحب کی غزل گوئی انسانی اور مجازی رنگ لئے ہوئے ہے لیکن کہیں
 بھی طبیعت کو پستی یا ہوس پرستی کی طرف راغب نہیں کرتی۔ یہ ایک عشق باز
 کی نازک قلبی وارداتوں کا بیان ہے جو اپنے خلوص اور سوز و گداز کے
 سبب سے تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کے برخلاف جرأت کے تغزل میں
 چوچلا پن اور لطیف سی خارجیت اور ہوس پرستی ہے۔ جرأت کو الفاظ
 کے استعمال پر پوری قدرت حاصل ہے لیکن وہ بلند جذبات براہمختہ نہیں کرتا۔ اس
 کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ان باتوں کو جو در پردہ کہنے کی تھیں صاف صاف کہہ دیا
 اور اس طرح اپنے کلام میں ایک عیب کو راہ دی جس سے وہ چاہتا تو بیچ سکتا
 تھا۔ وہ معاملات جو رمز و ایما کی زبان سے بیان کرنے کے ہیں تفصیل کے
 کس طرح متعل ہو سکتے ہیں۔ غزل میں معاملات کے اشارے ہونے چاہئیں نہ کہ
 معانی۔ کا بیان جرأت کے کلام کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ل جا گلے سے تابا بے ، زین نہیں ہے ہے خدا کے واسطے مت کہ نہیں نہیں
 کیا رکے وہ کہے ہے جو کمال سے لگ چلوں بس بس بے ہو شوق یہ اپنے تئیں نہیں
 کیا جانے کیا وہ اس میں ملنے ہے جتن جی یوں اور کیا جہان میں کوئی نصیب نہیں

قسط جو وہ کھینچے تو کھینچی جائے ادھر جان اور چھوڑ دے زلفوں کو تو بس باری ڈالے
بے ہوش سا غفل میں مجھے دیکھ وہ کیا کیا ڈرتا ہے کہ ایسا ہنوکھ منہ سے نکالے

تو گیا اور ہم تری صورت کو تکھے رہ گئے غمزدہ روتے تڑپتے سر پٹکتے رہ گئے
عاشقوں کے دل بلاق یار کے موتی کی طرح بوسہ کی خواہش میں اس بے رنگتے رہ گئے
اس غزل کے اشعار سے ذہن کسی بلند خیال یا نازک احساس کی طرف مائل
نہیں ہوتا۔ لیکن اسی غزل میں ایک نہایت بلند شعر بھی ہے جسے سن کر سحر
ٹھنک جاتا ہے۔ اس میں اعلیٰ درجہ کی رمزی اور نیمائی قوت موجود ہے۔
کارواں جاتا رہا ب اور ہم گم کردہ راہ گرد کے مانند صحرا میں بھٹکتے رہ گئے
اس غزل کے مقطع میں لفظوں کا چٹاؤ اعلیٰ درجے کا ہے لیکن چونکہ شاعر نے رفو
کنایہ کی کوئی طلسمی کیفیت پیدا نہیں کی بلکہ حقیقی خارجی منظر کو پیش کرنے کی کوشش
کی ہے اس واسطے سامع کے ذہن میں لطف کے ساتھ ایک قسم کا مضحکہ خیز تصور
راہ پاتا ہے۔ مقطع یہ ہے۔

ہو گیا غائب نظر سے برق کے مانند وہ اور ہم جرات پلک اپنی بھیسکتے رہ گئے

اور دوسری مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اجل گر اپنی خیال حال یار میں آئے تو پھر بجائے فرشتہ پری مزار میں آئے
اٹھے جہاں سے نہ جرات اٹھا کے در و درون الہی موت بھی آئے تو وصل یار میں آئے
پہلے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اگر جمال یار کے تصور میں موت آئے تو مزار میں بجائے
فرشتہ کے پری آئے گی اور دوسرے شعر میں خدا سے تنہا کی ہے کہ موت وصل یار
کی حالت میں آئے۔ دونوں تصورات بھونڈے، غیر شاعرانہ اور رکاکت کا پہلو
لئے ہوئے ہیں جو ذوق سلیم پر گراں گزرتے ہیں۔

کر و منع نامع کو ہم سے نہ بلائے کہاں کا یہ غمخوار پیدا ہوا ہے

کہے کہ کوئی اس سے ملے کہ جرات
تو کہتا ہے وہ از رہ طعن "ہاں جی
تمہارا طلب گار پیدا ہوا ہے
یہی تو عزیز ار پیدا ہوا ہے"

بھٹکے در پہ کہ کس حشر وہ بیانہ کہیں
بیشخص کیا دور کہ چاہے یہی کثرت توقع
نیرپا اس دل مضطر کو دبائے رکھیے
آپ کے زانو سے زانو کو بھڑائے رکھے
یہاں بھی جرات کی معاملہ بندی مجاز کی منزل سے عمل کر لیا ہو سی کے کوچے
تین قدم رکھتے ذرا نہیں جھکتی لیکن وہ لفظوں کا استعمال خوب جانتا ہے۔
آخری شعر میں جرات کے کی جگہ "ملائے" یا "لگائے" لائے تو شعر بے مزہ ہو جائیگا
اگرچہ اس شعر میں رمز و ایما کی کوئی معنی یا داخلی خوبی موجود نہیں لیکن لفظ
"بھڑائے" نے شعر میں جان ڈال دی ہے۔ بعض لفظوں میں انہماک کی ایسی زبرد
توت اور تازگی ہوتی ہے کہ ان کی وجہ سے مطالب کی سچی کایب بڑی حد تک چھپ
جاتا ہے۔

جرات سے قبل خواجہ میر درد کے ہاں بھی "بھڑانے" کے لفظ کا برجستہ
استعمال ملتا ہے۔

کبھی خوش بھی کیا ہے دل کسی رند شرابی کا
بھڑا دے منہ سے منہ ساتی ہمارا اور گلانی کا
حسرت نے بھی اس لفظ کو برتا ہے۔

آج تو منہ لب ساغر سے بھڑائے میر
ساتیا تجھ کو میری سستی پیاں کی قسم
شعراے متوسلین میں موئن خاں موئن نے عشیقہ مضامین کے اسالیب بیان میں
جوزاکت اور لطافت پیدا کی وہ انھیں کا حصہ تھا۔ انھوں نے اپنی غزل کو
عشق مجازی کے اظہار ذریعہ بنایا اور اس کی حدود سے آگے بڑھنے کی کبھی
کوشش نہیں کی۔ اگرچہ ان کی مضمون آفرینی انسانی محبت کی وارداتوں اور
معاہلات تک محدود رہی لیکن ان کی خوش مذاقی نے انھیں کبھی پستی کی طرف
نہیں جانے دیا۔ ان کی جذبہ نگاری کا دامن سستی اور مریضانہ جذبہ فروشی کے

داغ سے پاک ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں عشق کی کیفیتوں حسن کی ادائوں اور اس میدان کے تمام تجربوں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ذوق وجد میں آجاتا ہے۔ وہ کنایہ اور استعارہ کے بادشاہ ہیں۔ اردو زبان کے اعلیٰ اور دلنشین تغزل کی مثالیں ان کے کلام میں ملتی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ طلب ہیں۔

صبر و حُشت اثر نہ ہو جائے	کہیں صحرابھی گھر نہ ہو جائے
کثرت سجدہ سے وہ نقش قدم	کہیں پامال سر نہ ہو جائے
میرے تین رنگ کو مت دیکھ	تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
مومن ایمان قبول دل سے مجھے	وہ بت آرزوہ گر نہ ہو جائے

ہنس ہنس کے وہ مجھ سے ہی میرے قتل کی باتیں	اس طرح سے کرتے ہیں کہ گویا نہ کریں گے
بیمار اجل چارہ کو گر حضرت عیسیٰ	اچھا بھی کریں گے تو کچھ اچھا نہ کریں گے

شب تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے	کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے
--------------------------------------	-----------------------------------

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی کہا ہے غیر نے تم سے میرا حال کہا اس بت سے مرتا ہوں تو مومن داغ کی غزلوں کا عام رجمان بھی عشق مجازی کی طرف ہے لیکن اس نے رمز و ایما کی کیفیات کو اکثر برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے جس کے سبب سے اس کا تغزل جرات کے تغزل کے مقابلے میں زیادہ بلند ہے۔ اس کی شونخی اور اہیلے پن میں ایک خاص شان ہے جسے خوبی بیان اور حسن ادا نے اور بھی چمکا دیا۔ اگرچہ اس کے یہاں وہی پرانے فرسودہ مضمون ملتے ہیں جنھیں قدما کے وقت سے اب تک باندھتے چلے آئے ہیں لیکن وہ انھیں

میں نئی جان ڈال دیتا ہے۔ اس کی زبان میں خاص نزاکت، لطافت اور لہجہ ہے جو اس کے ہمعصروں میں سے کسی کو بھی نصیب نہ ہو سکا۔ امیر مینائی نے بہت زور لگایا لیکن وہ بات نہ پیدا کر سکے اور سامع کے لئے اس دل بستگی کا سامان فراہم نہ کر سکے جو داغ کے کلام کی خصوصیت ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ترے غمروں کو اپنے کام سے کام کسی کے دل کو تاب آئے نہ آئے
تم آؤ جب سوار تو سن ناز قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے

ابھی تو کھیل ہیں لے داغ شوخیاں اُن کی پھر آرزوئیں کرو گئے حیا کے آنے کی

مرے سوال کے معنی وہ نجم سے کہہ دیتے مگر سوال کا میرے کوئی جواب نہ تھا
نگاہ شوق پر الزام بے قراری کا تمہارے برق تجلی کو اضطراب نہ تھا
وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چاروں طرف ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا

منصفی دنیا سے ساری اٹھ گئی اسے بتو ایمان داری اٹھ گئی
بے طرح پھیلا ہے ان زلفوں کا جال اب اُمید رستگاری اٹھ گئی
دور میں اس چشم مست ناز کے لذت پر ہیز گاری اٹھ گئی
کس سے رکھے داغ چشم دوستی اٹھ گئی یاروں سے یاری اٹھ گئی

بات میری کبھی سنی ہی نہیں جانے وہ بُری بھلی ہی نہیں
لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد بائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں
اڑ گئی یوں وفا زمانے سے کبھی گویا انہی میں تھی ہی نہیں
داغ کیوں تم کو بے وفا کہتے وہ شکایت کا آدمی ہی نہیں

مندرجہ ذیل غزل کے اکثر شعر موسیقی میں رچے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تصویر کشی جاذب نظر ہے ایسا ہی محاکات اور ترنم کی خوبیوں نے داغ کے آرٹ کو اس غزل میں بہت بلند کر دیا ہے۔ خصوصاً دوسرا شعر خوب ہے۔

حیا نے روک لیا جذب دل نے کھینچ لیا
چلے وہ تیر کی صورت کھینچے کمان کی طرح
جھکی ہی جاتی ہے کچھ خود بخود جیسے وہ آنکھ
گری ہی جاتی ہے بیمار ناتواں کی طرح
ادائے مطلب دل ہم سے سیکھ جائے کوئی
انہیں سنا ہی دیا حال داستان کی طرح
ایک اور شعر سن لیجئے۔۔۔

دل میں ساگنی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

ہمد جدید کے شعرا میں عشق مجازی کی کیفیات کو حسرت نے جس نزاکت اور لطافت سے بیان کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ رنگینی اور جوش بیان کے امتزاج سے وہ خیالات کا ایک طلسم سا باندھ دیتے ہیں جس میں داخلی تجربہ اور خارجیت کی جھلکیاں ایک دوسرے میں سموی ہوتی ہیں۔ ان کا عشق خالص انسانی عشق ہے۔ وہ میر تقی میر کی طرح مجاز کی منزل سے آگے بڑھنے کے کبھی دعویدار نہیں بنے۔ خیالات کی رفعت اور مٹھاؤ اور جذبات کے خلوص کے باعث انہیں اگر اس زمانے میں غزل کا امام کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ انہیں بندشوں کی حسرت، لفظوں کی نشتر، تشبیہوں اور استعاروں کی جدت میں کمال حاصل ہے۔ وہ عشق و محبت کے نازک اور لطیف جذبات اور ان کے اتار چڑھاؤ کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں کہ اس کی مثال شکل ہی سے مل سکتی ہے۔ وہ اس وادی کے ذرہ ذرہ سے آشنا معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی ریخ و کلفت کا ذکر ملتا ہے جو اس وادی میں قدم رکھنے والے کو پیش آتے ہیں لیکن وہ ہمیشہ پُر امید رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ہمارے غزل گو شاعروں میں کوئی بھی اتنا پُر امید نہیں جتنے کہ وہ ہیں۔ انہیں ہمیشہ اس ہایتیں رہنا ہے کہ آخر

میں ان کی سب آرزوئیں پوری ہوں گی۔ ان کے ہاں تیر کا سونہ و گداز اور داغ کی نشاط انگیزی دونوں موجود ہیں۔ اگرچہ ثانی الذکر کا پلاڑا بھاری ہے۔ وہ زندگی کے امکانات سے کبھی مایوس نہیں ہوئے اور اپنے تفضل کو شہریت کے علاوہ اور کسی دوسرے خارجی محرکات سے آلودہ نہیں کیا۔ لیکن آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ زندگی سے گریز کرتے ہیں۔ اگر انسانی جذبات زندگی کا جز ہیں تو ہم یہ کہنے میں یقیناً حق بجانب ہیں کہ حسرت زندگی کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اور ایسے رنگوں میں پیش کرتے ہیں جن کی آب و تاب آدمی کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ ان کی شگفتہ بیانی میں جو دل بستگی اور بے ساختہ پن ہے وہ دور جدید کے کسی غزل گو کے ہاں موجود نہیں۔

حسرت کے ہاں صنف غزل اپنے انتہائی عروج پر نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں غالب اور مومن کی نازک خیالی نے یارو پ اختیار کیا ہے۔ آئیے ذرا ان کے کلام کا تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ عشق و محبت کی داستان کو انھوں نے کس طرح سے بیان کیا ہے۔ حسرت کے یہاں انسانی زندگی محبت سے مبدلت ہے۔ اگر یہ نہیں تو زندگی بے رنگ اور بے کیف ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں عشق کے مختلف مباح کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ اور اپنے تخیل کی مدد سے جنسی جذبہ میں تنزل کی کمال بینی پیدا کر دی ہے اس کمال بینی میں جنسی جذبہ کا نفسیاتی تجزیہ بھی ہے اور ترکیب بھی۔ وہ جس چیز کو عشق کہتے ہیں وہ خالص انسانی چیز ہے۔ اس کی شدت اور حرکت کے ہر راز سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ شریع شرع میں اس کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ دل چاہتا کیا ہے، فطرت کی شدت اپنے کسی نشاط کی تکمیل کے لئے پراسرار طریقے اختیار کرتی ہے کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پردہ راز سے کوئی پیکار رہا ہے۔

جذبہ شوق کدھر کو لئے جاتا ہے مجھے پردہ راز سے کیا تم نے بچارا ہے مجھے؟
وادی عشق کا مسافر جذبہ شوق کی آواز پر کشاں کشاں چلا جاتا ہے اور اُسے

کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کدھر جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے؟ چلتے چلتے تھک کر چور چور ہو جاتا ہے اور قریب ہے کہ گر پڑے لیکن قوت عشق اس کو سنبھال لیتی ہے۔

قوت عشق بھی کیا شے! کہ ہو کر مایوس جب کبھی کرنے لگا ہوں میں سنبھال ہے مجھے آغاز محبت کا ایک منظر ملاحظہ ہو۔

دل کو تیری دزدیدہ نظر کے گئی ہے اب یہ نہیں معلوم کدھر لے کے گئی ہے
اس بزم سے آرزو نہ آئے گی محبت آئین وفا مد نظر لے کے گئی ہے
جب آلے کے گئی ہے ہنس تا کوئے ملاست مجبور ی دل خاک بسرے کے گئی ہے
پہلے ہی سے مایوس نہ کیوں ہوں دعا کو قسمت مری محروم اثرے کے گئی ہے
لیکن واضح رہے کہ حسرت اپنی داستان محبت کو مایوسی کے بے پرتختم نہیں کرتے
وہ بڑے پُر امید واقع ہوئے ہیں۔ باوجود ناکامیوں اور نامرادیوں کے امید کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ محبت کے ابتدائی تجربوں میں مایوسی ہوتی ہے۔ اس سے وہ بے غیر نہیں۔ کبھی مایوسی اور محرومی میں عاشق محبت سے دستبردار ہو جانا چاہتا ہے اور محبوب کو جتا دیتا ہے کہ دشمن وفا ہو کر دل کی خریداری ممکن نہیں۔ یہ جنس گرامی بے وفاؤں کے لئے نہیں۔

وفا سے دشمنی رکھ کر میرے دل کی طلب گاری بہت مشکل ہے اس جنس گرامی کی خریداری
لیکن بالآخر حسن و عشق کی کشمکش میں حسن کو کامیابی ہوتی ہے اور وہ جنس گرامی
جس پر عاشق کو بڑا ناز تھا خرید لی جاتی ہے۔ ایک دفعہ پھنسنے تو ہمیشہ کے لئے
پھنسنے۔ اب اس جال سے رستگاری ممکن نہیں۔ ہجوم غم میں دل عشق کی زیر نگین
کا جلوہ گاہ بن جاتا ہے۔ اسی عالم میں عاشق اس طرح گنگنا نے لگتا ہے۔
ہوئیں ناکامیاں، نامائیاں، رسوائیاں کیا کیا نہ جھوٹی ہم سے لیکن کوئے جاناں کی ہواد
وہ دن اب یاد آتے ہیں کہ آغاز محبت میں نہ چالاک کی بجائے عشق آتی تھی نہ عیاری
نہیں غم حبیب دامن کا گراں فکر ہے اتنی نہ اٹھنے کی میرے درست جوش سے بڑھ چکا ہے

نہ ان کو رحم آتا ہے نہ مجھ سے صبر ممکن ہے
 و فوراً شک ہم سے ہجوم شوق بے حد میں
 غضبِ یحییٰ نیاں کھین گریہ ہائے ابتدائی کی
 نہیں کھلتی مری نسبت تیری لئے حیلہ جو مری
 نہ کرتا ستم ہم درد مندوں پر کہ دنیا سے
 نہ دیکھے اور دل عشاق پر پھر بھی نظر رکھے
 یہی عالم رہا اگر اس کے خونِ سحر پر ورکا
 وہ جرم آرزو پر جس قدر چاہیں نرافے یں
 نسیم دہلوی کو وجہ ہے دردِ دوس میں حسرت
 ہجر کی کلفتوں میں مشتاق دید اپنے آپ کو طرح طرح سے دھو کے یں
 مبتلا کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ محبوب کا حجاب اس کی حیرت سے ہم کلام ہے۔
 تھا حجاب ان کا میری حیرت سے سرگرم کلام
 متنی بظاہر خاموشی در پردہ خاموشی نہ تھی
 تناسل پردوں میں لطف و عنایت کی خواہش پیدا کر لیتی ہے وہ دھو کے
 کھاتی ہے اور آئندہ اور دھو کے کھانے کے غدر تلاش کرتی رہتی ہے۔ اگر یہ
 قریب نظر نہ ہوں تو زندگی بڑی بے کیف اور بے رنگ ہو جائے غمنا کی خواہش
 لطف و مراعات ملاحظہ فرمائیے۔

روشِ من مراعات چلی جاتی ہے ہم سے اور ان سے وہی بات چلی جاتی ہے
 اس جنا جو سے بایاے تمنا بے تک ہوس لطف و عنایت چلی جاتی ہے
 یہ جانتے ہوئے کہ کرم یا رہم رنگ جنا ہوگا پھر بھی دل اسی کا مستحق
 رہتا ہے۔

پھر اسی لطفِ ستم کو ش کا مشتاق ہے دل ہم نے جس لطف کو ہم رنگ جنا دیکھا تھا
 ہجو و محرومی کی راتوں کو کانٹے کے لئے لطفِ ستم کو ش کا متنی کبھی یہ تراء
 محبت گاتا ہوا سنائی دیتا ہے۔

ترے گشتے لے جانِ جانِ محبت حقیقت میں ہیں کاروانِ محبت
 کرم بھی تر یا دو گار و فقا ترا جو رہی ہے نشانِ محبت
 جانِ آفریں کئی بہارِ تمنا بہارِ آفرین ہے خزانِ محبت
 جو سرگشتہ ریاس و حیرانِ غم ہو وہی عقل ہے کامرانِ محبت
 رہے قبلہ دین و ایمانِ حسرت خوش رہتے رہے آستانِ محبت
 کبھی ایسا ہوتا ہے کہ روئے دلار کے تصور سے عاشق کے خیال میں رنگ و
 بوئے یار پیدا ہو جاتی ہے جسے اس کی درونِ بینی کی کرامات کہنا چاہیے۔
 خیالِ یار میں بھی رنگ و بوئے یار پیدا ہے یہ رنگیں ماجرا اے شفقِ شیریں کا پیرا ہے
 عاشقِ جو رجوا جفا ہوتا ہے اور دل میں اس کی تاویلیں کرتا جاتا ہے تاکہ معشوق
 پر حرف نہ آئے۔

اس ستم گر کو ستم گر نہیں کہتے ہفتا سخی تاویل خیالات چلی جاتی ہے
 کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ محبوب بھولا بھالا ہے مکن ہے وہ اپنی ستم رانیوں کی
 توجیہ نہ کر سکے اور شمشِ پنج میں ٹر جائے اس لئے معاملات کو اس طرح سمجھ اور
 سمجھاؤ کہ اس کو پشیمان نہ ہونا پڑے۔

ہم رضا شیوہ ہیں تاویل ستم خود کرنس کیا ہوا ان سے اگر بات بنائی نہ گئی
 کبھی یہ تاویل کی جاتی ہے کہ تغافلِ انھیں کے ساتھ کیا جاتا ہے جن کے ساتھ
 خصوصیت ہوتی ہے۔

ہماں شانِ تغافل ہیں ہر مرتا تیا زانِ کجا بانداز جفا ہے التفاتِ دلنوا زانِ کا
 کبھی عاشق کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اس کی وفا شکاری کا اس کو کوئی صلہ
 نہیں ملا اس واسطے کاوش درو جگر کی لذتوں کو فراموش کر کے بے نیاز
 رہنا ہو جائیے۔

جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش ہے اب نہ ملے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائے
 دل سے یاد روزگارِ عاشقی دیکھ نکال آرزوئے شوق سے نا آشنا ہو جائے

کاوش درد و جگر کی لذتوں کو بھول کر مائل آرام و شقائق ثنا ہو جائیے
ایک بھی ارمان نہ رہ جائے دل مایوس میں یعنی آخریے نیاز مدعا ہو جائیے
بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر کئے زیاد اس قدر بیگانہ، عہد وفا ہو جائیے
لیکن ان عزائم میں کامیابی نہیں ہوتی۔

بانے ری بے اختیار یہ تو لب کچھ ہو سکر اس سراپا ناز سے کیونکر خفا ہو جائیے
یہ کہکر دل کا حوصلہ بڑھایا جاتا ہے کہ جب اس میدان میں قدم رکھا ہے تو اب
واپس جانا کیسا؟

کوئی خشقبازی کا شغلہ نہیں کھیلے دل متلا گمراہ کیا ہے جو حوصلہ تو خوشی سے نابالغا
عاشق عوس کرتا ہے کہ درد اشتیاق کی کسک میں ایک خاص قسم کی لذت ہے
جسے ترک نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی خواہش اور تنہا ہی رہتی ہے کہ کوئی پیرمغان
عاشقی سیراب غم کر دے تاکہ تشنگان عاشقی کی پیاس بجھے۔ عاشقان عاشقی کا
احوال اس غزل میں نہایت پرتاثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے
ایک ایک لفظ میں تذل اور شعریٹ کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ شاعر کو محبوب سے بھی زیادہ خود عاشقی سے محبت ہے۔ وہ محبت
کرتا ہے محبت کی خاطر نہ کہ محبوب کی خاطر۔ محبت کا یہ اخلاص خود محبت کے مرتبہ کو
بلند کر دیتا اور اس کی شدت کو بڑھا دیتا ہے۔ عاشقان عاشقی کی زبان سے
حسرت سوز نہاں کی کیفیات اس طرح بیان کرتے ہیں :-

حسرت کشان درد ہیں ہم تشنگان عاشقی
مطلوب آہ سرد ہیں تجبوب رنگت دہیں
پس واقف انجام ہم کون میں نصیر الم تم
راحت سے دل بھر لگا رہے غم یاد آئیگا
منظیر رد لاری رہا لطف نہاں لبران
وہ ہم کہاں وہ دل کہاں البتہ آتا ہے کہاں
سیراب غم کر دے کہیں پیرمغان عاشقی
معتوق اہل درد ہیں ہم عاشقان عاشقی
جب تک رہیں ناکام ہم ہیں کامران عاشقی
کیونکر بھلا یا جائیگا عین زمان عاشقی
مقصود رسوائی رہی شان عیان عاشقی
باقی ہے اک سوز نہاں اب تک نشان عاشقی

باد جو امید پرست ہونے کے حسرت کا عقیدہ ہے کہ عشق کی روح پاک تحفہٴ غم کے بغیر شاد نہیں ہو سکتی۔

عشق کی روح پاک کو تحفہٴ غم سے شلاد کر اپنی چٹا کو یاد کر میری وفا کو یاد کر
جان کو جو غم بنا دل کو دفا بنا دکر بندہٴ عشق ہے تو یوں قطع رہ مراد کو
حسرت باد جلو وادوی عشق کی مایوسیوں اور محرومیوں کے اچھی طرح جانتا ہے کہ

ایک نہ ایک دن ستم یار تہید کرم بن جائے گا۔

ستم ہو جائے تہید کرم ایسا بھی ہوتا ہے محبت میں بتا اے ضبط غم ایسا بھی ہوتا ہے
بھلا دیتی ہیں سب رنج و الم حیرانیاں میری تری تمکین بے حد کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے
جائے یار کا شکوہ نہ کر لے رنج بکا می اسید و یاس دونوں ہوں ہم ایسا بھی ہوتا ہے
تری دلدار یوں سے صورت بیگانگی نکلی خوشی ایسی بھی ہوتی ہے الم ایسا بھی ہوتا ہے
کبھی عاشق محض یاد یا سے فراق کی گھڑیوں کو گوارا بناتا ہے۔ عشق کی ایذا

پہن دل کو راحت ملتی ہے۔ کرم یار کی جھلکیاں اب عالم خیال میں نظر آنے لگتی ہیں۔

از بسکہ یاد یار میمائے عشق ہے راحت فزائے دل ہے جو ایذائے عشق ہے

تیرا خیال منسل منقصود آرزو تیرا جمال شاہد رعمائے عشق ہے

حسرت کہاں وہ شاہ کہاں تو گدائے حسن زہرا اگر تجھے سرو سودائے عشق ہے

مدت کے بعد پھر وہ ہونے لگتا کرم یہ بھی تو ایک طریقہٴ احیائے عشق ہے

حسن جانان سے عشق کا خطاب تو ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ خطاب کرنے والے کے

تجربہ بتاتے ہیں کہ اس کو اپنی عظمت کا احساس ہے۔

حسن جانان سے یہ کہتا ہے تیرا تہتر عشق دور پہنچا ہے میرے نام سے افسانہ تیرا

بے خود ہو کے محبت کی بدلتا محفل نام بھی اب نہیں لیتا دل فردانہ تیرا

فکر کو نین سے بیگانہ ہوا تو حسرت خوب ٹھہرا غم جانانہ سے یارانہ تیرا

محبت کی مختلف آزمائشوں میں سے گزر کر شوقِ محفلِ حسن میں پایہٴ پاتا ہے۔

عظاہر ہر پہنچ کر دل اٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ لیکن مجبوراً اٹھنا ہی پڑتا ہے۔

کوئی ان کی بزمِ جمال سے کب اٹھا خوشی سے کہاں اٹھا
 جو کبھی اٹھا بھی اٹھائے سے تو اسی طرف نگراں اٹھا
 بلاخر جذبہ شوق کی رہبری میں وادیِ عشق کا مسافر شہرِ وصال پہنچ جاتا ہے
 کچھ بھی شہرِ وصال دور نہیں جذبہ شوق ہو جو راہ نما
 منزل پر پہنچ کر مسافر کو جو خوشی ہوتی ہے عاشق کو وہی مسرت اپنی کا مرانی پر
 ہوتی ہے جسے شاعرانہ زبان میں وصل کہتے ہیں۔
 اب حسرت کا ترانہ وصل سینے۔

لہذا الحمد کہ تارِ یکی فرقت ہوئی دور
 چمن جاں میں نسیم ہوس انگیز چلی
 بارہ عشق سے یگانے تنہا رہ گئیں
 بند کر دے گلاب یار کو بوسوں کا ہجوم
 مندرجہ ذیل اشعار میں شاعر نے اپنے مطالب کو صاف صاف بیان کر دیا ہے
 کہ سامع کے ذہن میں اس کی مقصد براری پر کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے
 لیکن آپ دیکھیں گے کہ لب و لہجہ میں ضبط و اعتدال ہے کہیں اعتدال اور
 عریانی کا شائبہ نہیں جو ذوق پر نگراں گذرے۔ پھر بیان کی تازگی اور صفائی
 کے ساتھ مرکزی کیفیت پر قرار رکھی ہے جس پر تغزل نازاں ہے۔
 چاندنی راتوں میں چلوں کا ہے زور کیا تو
 روشنی بخش تمنا ہے جواک ماہِ منیر
 دیکھتے ہی انھیں پہچان لیا جان لیا
 قابل دید تھی گرمی میں پسینے کی بہار
 بن گئی ہے بدل گردشِ گردوں ماتی
 داستانِ ماضی کا آخری منظر ملاحظہ ہو جس میں حسنِ شادابی کی اداس اور شوق
 بے عجاب کی گستاخ دستیاں ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں نظر آتی ہیں

لایا ہے دل پر کتنی خرابی . اے یار تیرا حسن شرابی
 پیرا ہن اس کا ہے سادہ و نجین یا عکس مئے سے شیشہ نگلابی
 عشرت کی شب کا وہ دور آخر نور حسد کی وہ لاجوابی
 پھرتی ہے اب تک دل کی نظیریں کیفیت ان کی وہ نیم خرابی
 بزم طرب ہی وہ بزم کیوں ہو ہم غمزہ دوں کو داں بارابی
 اس نماز میں نے باوصف محبت کی وصل شب وہ بے حجابی
 شوق اپنی بھولا گستاخ دستی دل ساری شوخی حاضر جوابی
 وہ روئے زیبا ہے جان خوبی ہیں وصف جس کے سایے کتبانی

خیال تھا کہ مقصد برآری کے بعد عاشق اطمینان کی نیند سوئے گا۔ لیکن یہ
 سارا ماجرا فریب نظر ثابت ہوا۔

وصل میں بھی نہ ہوئی وجہ سکون کثرت شوق ڈھونڈ لیتا ہے یہاں دل مضطر کیا خوب
 پھر عاشق کو یہ ڈر بھی لگا رہتا ہے کہ وصل زوال شوق کا سبب نہ بن جائے۔
 غرض دل کو چین نہ بھر و محرومی میں ہے اور نہ مقصد باری میں۔ اضطراب اور
 بے تابی زندگی کے ساتھ ہیں۔ جب تک جان ہے اس وقت تک ان سے
 چھٹکارا نہیں یہ ہی غم آرزو محبت کے نیت نئے جادو جگاتا ہے۔

دل طالبِصال ہے بے شک گر کہیں حسرت یہی غریب نہ ٹھہرے زوال شوق
 غالب نے بھی وصل میں زوال شوق کے خیال کو اپنے خاص انداز میں ادا
 کیا ہے اور استعارہ بالکنایہ سے رمز کی کیفیت کا ایک سماں باندھ دیا ہے
 گرتے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال

موج حیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

مطلب یہ ہے کہ اگر تیرے دل میں شبیہ ہے کہ وصل کے بعد شوق میں
 ضعف پیدا ہو جائے گا تو اپنے دل سے اس شبہ کو نکال دے۔ موج کو دیکھ
 کہ باوجود مجرے ہم آغوش ہونے کے اس کی بے تابی اور اضطراب میں کوئی

کمی نہیں پیدا ہوتی ۔
ایک اور جگہ اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وصل کے بعد حریص
دل کا شوق اور زیادہ ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے ساعر کا جب خراب
سے وصل ہو جاتا ہے تو اس میں جھاگ اوپر آنے لگے ہیں جو اس کی
تمشہ بی پر دلالت کرتے ہیں ۔

ہوا وصال سے شوق دل حریص زیادہ

لب قح یہ کف بادہ جوش تشنہ بی ہے (نسخہ حمید)

ایک اور جگہ وصال کے مضمون میں غالب نے عجیب ندرت پیدا کی ہے ۔
وہ کہتا ہے کہ عاشق پر ایک ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جبکہ وصال داخلی
تجربہ اور ذہنی لطف سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ۔ اس کیفیت میں اس
الجن کی آمیزش ضرور ہوتی ہے کہ اگر وصال میرزا ہوا تو کہاں جائیں گے اور
اگر ہوگا تو کیونکر ہوگا ۔

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال کہ گرنہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو
اس کے برخلاف داغ کے یہاں وصال کے تصور میں خارجیت کا پہلو نمایاں
ہے ۔ وہ کہتا ہے :-

شب وصال قیامت تھی جب کسی نے کہا وہ دیکھ صبح نمودار ہوتی آتی ہے
عشق اور موت شاعری کے دائمی موضوع ہیں ۔ عاشقانہ شاعری
کو آپ درد و الم کے خیالات سے الگ نہیں رکھ سکتے ۔ عشق کا خاصہ جذب
غم ہے جسے محبت کی جاتی ہے اس کے لئے غم ہے جاتے ہیں کہ بغیر اس

لحا بقول حافظ شیرازی :

دوام عیش و تنعم شیوہ عشق است اگر معاشدہ مائی بنوش جام غم
اسی خیال کو نظیری نے یوں ادا کیا ہے
گریہ دار نصف ماہر کہ مرد عورتا نیست
کے کہ کشتہ نشہ از قبیلہ مایہ نیست

کے اخلاص مشتبہ رہے گا۔ عشق بغیر غم کے عنصر کے تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا بغیر ادراک غم خود انسانی شخصیت اور صورتی رہتی ہے۔ غم کی دھیمی آواز میں سلگنے سے شخصیت کے جوہر نکھرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انسانی زندگی میں غم کے عناصر ایسے پیوست ہیں کہ انہیں اس سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔ خوشی اور مسرت کے گریز پالمحوں کی یادیں جلد فراموش ہو جاتی ہیں۔ لیکن غم کی یاد کبھی دل سے نہیں جاتی۔ اس کے نقوش ایسے گہرے ہوتے ہیں کہ زمانے کے ہاتھ سے بڑی مشکل سے بھرتے ہیں۔ غزل میں جذبہ غم وہی حیثیت رکھتا ہے جو مغربی ادب میں تریکڈی (المیہ) کو حاصل ہے۔ ہر زبان کے ادب میں المیہ ہی کا مرتبہ آپ بلند پائیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غم زندگی کی ایک اساسی شے ہے۔ زندگی کی یہ کوشش کہ اپنی تکمیل اور تخلیق کی راہ پر گامزن ہو اپنے جلو میں غم کی پرچھائیاں چھوڑ جاتی ہے۔ انسان کا یہ احساس کہ زندگی کی ابھی تکمیل باقی ہے، بجائے غم آگین ہے۔ پھر ہر قسم کی سعی و جہد جو اس راہ میں کی جاتی ہے الم انگیز ہوتی ہے۔ زندگی کچھ عجیب اسی چیز ہے۔ جتنا اس غم کو بوجھنے کی کوشش کی جاتی ہے اتنا ہی وہ الجھتا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ الجھاؤ کبھی سلکھنے والا نہیں اس واسطے کہ زندگی کا بننا ہی یہ ہے کہ یہ کبھی نہ سلکھے اگر سلکھ جائے تو زندگی اپنی قوت محرکہ سے محروم ہو جائے گی جو نشانے قدرت کے خلاف ہے۔

انسان کی طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ غم سے بیزار ہو کر مسرت کی منزل کی طرف رواں دواں جاتا ہے۔ جب وہاں پہنچ جاتا ہے تو کچھ کمی اور تشنگی محسوس ہوتی ہے اور کچھ دنوں میں وہی مسرت جس کا وہ دل و جان سے خواہاں تھا اجیرن ہو جاتی ہے۔ ایک ستر کی بے اطمینانی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کے اسباب اکثر اوقات نامعلوم ہوتے ہیں۔ تمنائیں منزلوں کے خواب دکھانے لگتی ہے۔ حاصل شدہ مسرت ایک زندان بن جاتی ہے

جس سے رہائی کے لئے دل بے تاب ہوتا ہے۔ دستِ جنوں اس زندان کی زنجیر کھڑکاتا ہے اور از سر نو تمنا کی وادیوں میں دشتِ فردی شروع ہو جاتی ہے۔

رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ خار دشت پھرتو امیرا بھلائے ہے (ذوق)
سوزِ آرزو کی نیرنگیاں نئی صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ بقول میر انصاری:

کلبا یک گیا میں کیا کہوں اس دل کے ہاتھوں سے
ہمیشہ کچھ نہ کچھ اس میں خیالِ خام رہتا ہے

قد مائیں میر تقی میر نے اپنے کلام میں دردِ عالم اور ناکامی اور مایوسی کی جھلکیاں دکھائی ہیں اور اس سلیقہ سے دکھائیں کہ ان کی نظیر آج تک نہ پیدا ہوئی۔ میر کے سوز و گداز میں انفرادی رنگ ہے جس کی تاثیر بے پناہ ہے۔ وہ دل پر زخموں کے ایک جام سے عمر بھر بہہ رہے ہیں۔ ان کی مدہوشی غمِ زیست کی مدہوشی ہے۔ دلِ تیرخوں کی اک گلابی سے عمر بھر ہم رہے شرابی سے ان کے نزدیک جن حیات کا ہر گل لہو سے بھرا ہوا ساغر ہے۔

یہ عیشِ گاہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا ہوا کا
بیرِ صاحب کا کلام غمِ عشق کے سوز و گداز میں رچا ہوا ہے اسی لئے اس میں بے پناہ تاخیر ہے۔ انھوں نے جس غم کا ذکر کیا ہے وہ زندگی کی اساسی حقیقت ہے۔

اس کے بغیر انسانی سیرت نہیں بن سکتی اور اس کی پوشیدہ قوتیں اور صلاحیتیں نہیں ابھر سکتیں۔ عشق کی آگ میں جب جذبات تپائے جاتے ہیں تو ان میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ بیرِ صاحب کا عشق بھی خالص انسانی عشق ہے۔ وہ مجازے

بہت کم آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہی ان کے کلام کی بڑی خوبی ہے۔ چونکہ ان کے جذبات اصلی ہیں اس لئے وارداتِ عشق کی مصوری میں فطری سوز و آہ و ہوا پیدا ہو گیا ہے۔ انسانی عشق و محبت کی ککھ

انھیں صاحبِ نظر بنا دیا اور ان کی ہر بات میں گہرائی پیدا کر دی۔ ان کے

کام سے چند سالیں ملاحظہ ہوں۔

دیدنی ہے شکستگی دل کی کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

کروں جو آہ زمیں و زمان جل جائے پہر پہلی کا یہ سانبان جل جائے

نبول میرے مظلوم عشق ہے وہ غریب اگر وہ آہ کس سب جہان جل جائے

بک نیا ز عشق ناز جن سے کھینچے ہے ہاتھ آخر میر سر بر آستان مارا لگ

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا غم کے جانے کا نہایت غم رہا

قائل ہیں ہم تو میر کے بھی ضبط عشق کے دل جل گیا تھا اور نفس لب پر دھتا

ابتداءے عشق ہے روتا ہے کیا آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا داغ چھاتی کے عبت دھوتا ہے کیا

یہ جو چشم پر آب ہیں دونوں ایک خانہ خراب ہیں دونوں
رونا آنکھوں کا رویئے کبت تک پھوٹنے ہی کے باب ہیں دونوں
ایک سب آگ ایک سب پانی دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

عالم عالم عشق و جن و دنیا دنیا تہمت ہے دریا دریا روتا ہوں صحرا صحرا وحشت ہے
صبح ہے آئسو نو میدان جیسے دوائی آتا تھا آج کو خواہش کی شاید دل ہے ہکے نصرت ہے

دل جادے ہے جون کے شبنم نے کہا گل سے اب ہم تو چلیں گے تو رہ جورہا چاہے
رنگ گل و بوئے گل ہوئے ہیں بواہ نول کیا فائدہ جاتا ہے جو تو بھی چلا چاہے

آج کل بھتسار ہیں ہم بھی بیٹھ جا چلتے ہاں میں ہم بھی
منہ گرہ ذکر تو اسے ناصح اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

بہنہ و دل حسرتوں سے چھایا بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا
ہمد جدید کے شعرا میں فانی نے غم کے مضمون کو ایسا اپنایا کہ گویا وہ اسی کا
ہو گیا۔ میر کے غم اور فانی کے غم میں فرق ہے۔ میر کا غم محض ایک انفرادی تجربے
کا بیان ہے۔ برخلاف اس کے فانی کے ہاں غم ایک جمالیاتی قدر کا مرتبہ رکھتا
ہے۔ اس کا سارا نظام نقصورات غم کے محور پر قائم ہے۔ یہ ایک کسوٹی ہے
جس پر کائنات کے حقائق کے کھرے کھوئے کو پرکھا جاتا ہے۔ رنج و الم
سے حواس و ادراک میں ایسی مینری اور صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان
کی مدد سے انسان کو زندگی کی حقیقت کا پتہ چل جاتا ہے جس کی تک
مسترت نہیں پہنچ سکتی۔ میر نے غم کے جن خیالات کو انتہائی سادگی سے
بیان کیا انھیں فانی فلسفیانہ رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ فانی نے غم کی
پرورش کی تاکہ اس سے لطف اندوز ہوں۔ انھیں غم میں ایک طرح کی
لذت محسوس ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ لذت الم و عش غم کے جواریا رہے۔ ان
کی یاس غیر مخلوط یاس ہے جس میں کسی قسم کی امید اور کما کیابی کی آئینہ نش
نہیں۔ انھیں ہر قسم پر وہ دار غم نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں غم کا تصور اور
غم کا احساس دو ذل خالص رنگ میں ہیں۔

ہر قسم پر وہ دار غم نظر آیا مجھے
گل خزان کے راز کا محرم نظر آیا مجھے

اس میں شبہ نہیں کہ غم زندگی کی ایک ضرورت ہے۔ اگر آرت کے ذریعہ حیات اجتماعی میں اس کی قدر حد سے زیادہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ جماعت کی عملی صلاحیتوں پر اس کا برا اثر پڑے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر کسی جماعت کے افراد احساس غم سے بے اعتنائی برتتے ہیں جبکہ جدید مادی تمدن میں نظر آتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری جماعت کا تحت شعوری احساس متاثر ہوگا اور وہ بے رحمی کے ایسے وسائل دریافت کرے گی جو دوسروں کو بھی مبتلائے غم کریں اور خود اس کو بھی۔ مثلاً جنگ کے ذریعے غم کی ضرورت کی تکمیل کی جائے گی۔ جرمنی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جب دل غم کی لطیف کسک سے آشنا نہیں ہوتا تو وہ بے رحمی پر اتر آتا ہے اور دوسروں کو مبتلائے غم کرنے میں لذت محسوس کرتا ہے، اس لئے آرت میں غم کے عنصر حیات کو اس طرح سے پیش کرنا چاہیے کہ جذبات کی تہذیب ہو سکے۔ فانی نے غم کے ذریعہ تہذیب جذبات کا کام لیا ہے جو یقیناً ایک کارنامہ ہے۔

فانی نے غم کو نیا مزاج دیا اور اسے نئے آداب سکھائے۔ اس نے حیات کو غم سے ہم آہنگ کر دیا۔ غم کی ہر ادا میں اس کو نئی کیفیات محسوس ہوتی ہیں۔ امیر اور داغ کی شوخ نگاریوں کے بعد فانی کا تراہ غم تکملہ کا حکم رکھتا ہے۔ لیکن بعض جگہ انھوں نے احساس غم میں اتنا غلو برتا کہ ان کے اکلام کی شریعت مجروح ہو گئی۔ زندگی میں غم بھی ہے اور خوشی بھی آہ و نالہ بھی ہے اور غم اور خوشی بھی۔ ناکامیاں بھی ہیں اور کامرئیاں بھی۔

ع زمانہ جام بدست و جوازہ بردوش است
فانی نے موت میں جو غم کا فہم ہے کمال بینی کی تصویر دکھی اور اس تصویر کے بنائے سنوارنے میں انھوں نے ایسے تیز رنگ استعمال کئے کہ بعض دفعہ ذوق شری پر گراں گزرتے ہیں۔ جب کوئی مضمون رمز و ایما کی حد سے

باہر نکل جائے اور سامع کو یہ خیال ہونے لگے کہ شاعر جو کہہ رہا ہے اس سے
یادوں کو تازہ کرنا مقصود نہیں بلکہ بعض تصورات کے متعلق مطلع کرنا تو وہ
بالکل دوسرے نقطہ نظر سے شعر کو جا بجا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ موت
ایک زبردست محرک شعری ہے لیکن اگر کفن اور جنازہ سے واقعی کفن اور جنازہ
مراد ہو تو اس انداز بیان سے لازم ہے کہ ایک قسم کی کراہت پیدا ہونے لگے
مثلاً ان شعروں کی شعریت میں مجھے کلام ہے۔ چاہے یہ شعر ہوں لیکن غزل کے
شعر نہیں ہو سکتے اور نہیں ہونے چاہئیں اس لئے کہ انھیں سن کر ذہن مریض
کے بجائے امر واقعہ کی طرف رجوع ہوتا ہے جو دل آویز نہیں۔
ہڈیاں ہیں کٹی پٹی ہوئی زنجیروں میں لئے جاتے ہیں جنازہ تھے دیوالے کا

پلے بھی آؤ وہ ہے قبر فانی دیکھتے جاؤ تم اپنے مرنے والے کی شانی دیکھتے جاؤ
سنے جاتے نہ تھے تم سے مے دن ایکے شکوے کفن سداؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ
وہ اٹھا شور ماتم آخری دیدار میت پر اب اٹھا چاہتی ہے نقش فانی دیکھتے جاؤ

وہ ادھر رخ ادھر ہے میت کا لوگ فانی کو قبیلہ روتو کریں

داع اگرچہ عام طور پر خوش باشی اور لذت پرستی کا علمبردار ہے لیکن تبرکاً کہیں
کہیں غم کا مضمون بھی باندھ جاتا ہے۔ ایک جگہ موت کا نقشہ اس طرح چھینچا
ہے کہ عبرت کی بجائے کراہت ہوتی ہے۔ اس کا شعر ہے۔
میت پر میری آنکھیں دل ان کا دل گیا تعظیم کو جو لاش میری اٹھ کھڑی ہوئی
چاہے کسی کے احترام کے لئے ہی کیوں نہ ہو لیکن لاش کا کھڑا ہو جانا ایسا مضمون
نہیں جسے غزل میں برتنا چاہئے۔ صاف ظاہر ہے کہ شاعر رمز و ایما کی کوئی
کیفیت نہیں پیدا کر سکا۔ سامع کو اس قسم کا شعور سن کر معایہ خیال ہوتا ہے کہ

وہ اپنے سامنے کسی لاش کو اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہے جو یقیناً
ایک کریمہ نظر ہے۔ اسی مضمون کا ماہر لکھنؤی کا بھی شعر ہے :-

ماہر یہ کس ادا سے وہ شازہ ہلا گئے یوں دل ہلا کہ قبر میں لاشہ ہلا کیا
فانی کے شعر میں جو کفن سر کانے کا مضمون ہے وہ بھی اسی نوعیت
کا ہے۔ لیکن ویسے فانی کے ہاں غم کے متعلق بے نظیر اشعار ملتے ہیں۔ جو
تغزل میں اچھی طرح کھینچتے ہیں، انھیں اس کر سماع کے ذہن میں غم کا وہ تصور
آتا ہے جو اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ انسان اپنے مقدر سے الجھک آزما
ہو۔ یہ غم زندگی کا تخلیقی عنصر اور اس میں توازن قائم کرنے کا ذریعہ ہے۔ ان
اشعار پر ہمارا ادب جتنا ناز کرے کم ہے۔ یہاں چند مثالیں پیش
کی جاتی ہیں۔

تو نے کرم کیا تو بے عنوان رنج زیت غم بھی مجھے دیا تو غم جادو داں تھا
آزادہ تھا کہ ضبط فغاں میں اثر نہیں شرمندہ ہوں کہ ضبط فغاں رائیگاں تھا

مرے شکوے پاس غم کی بے یں دل کے لئے قمرِ خان کو میں نے آہنگِ طرب کا ہم نوا پایا

دل ہیں ہوا حاصل درد میں فنا ہو کر عشق کا ہوا آغاز غم کی انتہا ہو کر
نامراد رہنے تک نامراد بیٹے ہیں سانس بن گیا اک اک نالہ نارسا ہو کر
بڑھاپے نہ گھٹتا ہے مرتے ہیں بیٹھے ہیں دردِ پردہ کی مار دل میں ہو گیا رہ کر

غم خاؤ دل کا کیا کہنا وہ کچھ بھی سہی یہ بات کہاں
خلوت میں یہاں جو جلوت تھی وہ آج تری محفل میں نہیں
سنتے تھے حجت۔ آسان ہے واللہ سب گسان ہے مگر
اس پہل میں جو دشواری ہے شکل سی شکل میں نہیں

گوراحت و رنج میں فرق نہیں یہ فرق مراتب کیا کم ہے
 جو سعی حصول عیش میں ہے وہ عیش غم حاصل میں نہیں
 جینے کی حدیں ملتی ہیں کہیں ایمائے اجل ہے آگے بڑھ
 منزل کا نشان ہے ہر منزل اکرام کسی منزل میں نہیں
 ہم بھی ہوں خیال یار بھی ہو اس فکر محال سے کیا محال
 بس اب فانی ہم ہی نہیں یا کوئی ہمارے دل میں نہیں

فانی کفِ قاتل میں شمشیر نظر آئی لے خواب محبت کی تعبیر نظر آئی
 آگئی ہے تیرے بیمار کے منہ پر رونق جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارماں نکلا
 ہاں تاخنِ عزم کسی نہ کرنا ڈرتا ہوں کہ زخمِ دل نہ بھر جائے
 زبانِ حال شہرِ داستانِ عشق نہ چھوڑ کہ خواب مرگ ہے تاثر اس فسانے کی

غم کے بھڑکتے شعلوں سے جب جل کے کلیجہ خاک ہوا
 داغِ وجودِ حسرت سے تب دل کا دامن پاک ہوا
 میرے سوا تجھے اور جو بردے سارے کے سارے چاک ٹوٹے
 یہ بھی اگر اللہ نے چاہا اب کوئی دم میں چاک ہوا

یہ غزل فانی کی ہمیشہ زندہ رہنے والی غزلوں میں سے ہے :-
 شوق سے ناکامی کی بدولت کوچہِ دل ہی چھوٹ گیا
 ساری امیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا

فصل گل آئی یا اجل آئی کیوں در زنداں کھلتا ہے

کیا کوئی وحشی اور آپہو پنا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا
اس شعر کی بلاغت اور طلسمی رمزیت بیان نہیں کی جاسکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ نقاش نے اپنے قلم کی خفیت سی کشش سے جہان معنی پیدا کر دیا ہے۔ کچھ
باتیں کہی گئی ہیں اور کچھ امدیدہ و دانستہ نہیں کہی گئیں۔ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ
جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں لطافت زیادہ ہے یا ان میں جو ان کہی چھوڑ دی
گئیں۔ ایک زنداں کا منظر پیش نظر ہے۔ کوئی قید و بند میں مبتلا اس پر غور کر رہا ہے
کہ آخر در زنداں کے کھلنے کی کیا وجہ ہے۔ کیا موسم بہار آ گیا یا اجل کی آمد
آمد ہے؟ کیا کسی قیدی کو چھوڑا جا رہا ہے یا کسی نو گرفتار کا خیر مقدم مقصود ہے۔
جو مطالب اس شعر میں صدف کئے گئے ہیں اور وہ جو بیان کئے گئے ہیں ان
دونوں کا مجموعی اثر تغزل کی اعلیٰ ترین معراج کو ظاہر کرتا ہے۔ اس غزل کے
باقی شعر بھی نہایت بلند ہیں۔

یہ بھئے کیا دامن کی خبر اور دست جنوں کو کیا کہیئے

اپنے ہی ہاتھ سے دل کا دامن مدت گزری چھوٹ گیا
منزل عشق پہ پہنا پہونچے کوئی تنہا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھ چھوٹ گیا

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گورو کفن

فربت جس کو اس نے آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا
فانی نے اپنے مخصوص انداز میں عشق و حسن کے معاملات اور زندگی کے
اسرار بیان کئے ہیں جن کی تشریح وہ غم ہی کی زبان سے کرتے ہیں۔ ان کے
خیالات فرضی نوعیت کے نہیں ہیں بلکہ صداقت اور خلوص پر مبنی ہیں
اس لئے ادب ہمیشہ ان کی قدر کرے گا۔ وہ بھی جوان کے باس و تمنو طبیعت
کے رجحان کو زندگی کی مکمل توجیہ نہیں سمجھتے ان کے کلام کی تاثر مستانت

اور خلوص سے انکار نہیں کر سکتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر شعر محسوس کر کے لکھتے تھے اور ان کے احساس میں ایک خاص قسم کی گہرائی تھی جسے تحفہ غم سمجھنا چاہیے۔

زندگی کی کیا خوب توجیہ کی ہے۔

ایک سہ نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کا ہے کوہِ خواب سے دیوانے کا
ایک خواب اور وہ بھی ایک دیوانہ کا خواب۔ رمز و ایما کی انتہائی کیفیات آن چند
لفظوں میں موجود ہیں۔ دوسری جگہ اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی زندگی نام ہے مرم کے جسے جلنے کا
بخت کی ایک کیفیت اس شعر میں کیا خوب بیان کی ہے
محبت میں ایک ایسا وقت بھی دل پر گذرتا ہے

کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی
بعض دفعہ رند شرب جگر بھی ایسی چہ کی بات کہہ جاتا ہے کہ انسان پر ایک
قسم کی حیرت سی طاری ہو جاتی ہے۔ آنسوؤں کے خشک ہونے کے مضمون
کو ادا کیا ہے

اس عشق کی تلافی مافات دیکھنا

رونے کی حسرتیں ہیں جب آنسو نہیں ہے

اس شعر کا ایک ایک لفظ اثر و بلاغت میں ڈوبا ہوا ہے۔ عشق کی تلافی مافات
کا تصور بالکل نیا ہے۔ اور اس خیال میں کتنی حسرتیں پوشیدہ ہیں کہ جب آنسو
خشک ہو گئے تو دل کو رونے کی تمنا ہے۔ جو حصہ حذف ہے یعنی یہ کہ جب
آنکھوں میں آنسو تھے تو ان کی پوری طرح قدر نہ ہوئی کس قدر لطیف اور
باکیف ہے۔

اسی مضمون کو غالب نے بھی ادا کیا ہے لیکن جگر کا شعر بڑھا ہوا ہے۔

زبان کے لحاظ سے بھی اور اجمالی کیفیت کے لحاظ سے بھی۔ غالب کا شعر ہے۔

غالب زبکہ سوکھ گئے چشم میں رشک
آنسو کی بوند گوہر نایاب ہو گئی (منہج حیدر)
جگر کے شعر کا مضمون دماغ کے یہاں دوسرے پیرائے میں ملتا ہے۔
جب باور تھکے تو جگر کی جگہ دل نہ رہا تو اندھ کی
غالتابی کی گھڑیوں کے لئے سونہ و گداز کو صدف بنایا اس کے نزدیک
کلام میں اس وقت تک ہر نہیں ہوا ہر شے صاحب نام کہے والے کا دل غم کی
لذت سے آشنا ہو۔

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد پیسے دل گداختہ پیدا کرے کوئی
ایک جگہ اپنی غزل سداۓ کی اس طرح توجیہ کی ہے۔

مجھے استعانت غم نے اپنے عرض حال بخشی ہر س غزل سرائی تیش فناء خوانی
ہی بار بار جی میں مے آئے ہے کہ غالب کروں خوان گفتگو پر دل و جاں کی مہمانی
غالب نے غم کی حقیقت کو محسوس کیا اور اپنے کلام میں اسے بڑے وسیع
معنوں میں استعمال کیا۔ لیکن وہ ہر وقت اور موقع بے موقع نام نہان نہیں
نظر آتا۔ اس کا غم ضبط کا دامن کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ زندگی میں
غم کی اس حقیقت کو اس شعر میں کس خوبی سے ظاہر کیا ہے۔

خانے پائے خزان ہے بہار اگر ہے یہی دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا
بہار کو موسم خزان کے پاؤں کی ہندی کہا جس کا رنگ بہت جلد غائب
ہو جاتا ہے۔ دنیا کا عیش بھی رنگ خاک کی طرح نمائشی اور عارضی ہے۔ زندگی
کی اصلی حقیقت غم ہے۔

دوسری جگہ زندگی اور غم کو ایک ہی چیز بتایا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ
غم غم عشق ہے جو زندگی کا محرک عنصر ہے۔

تبدیلیات و تبدل غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پا کر
ایک موقع پر کہا ہے کہ غم دل کے محبت میں انسان ہمیشہ سلقینا رہتا ہے

اور ہمیشہ اس کی حیثیت ایک سندی کی رہتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غم کی تکمیل کبھی نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے عیش و فراغت کی انتہا پر انسان بہت جلد پہنچ جاتا ہے اور اسی لئے اس سے آنا ہی جلدی اکتا بھی جاتا ہے۔

نیتا ہوں محبت غم دل میں سبقِ سنوز لیکن یہی کہ ”رفت گیا اور بود تھا“ غالب کے یہاں غم مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے۔ کبھی غم روزگار کی اور کبھی غم عشق کی اور کبھی دائمی تنہا اور انتظار کی۔ غم عشق کی بدولت غم روزگار سے بے بسی کی نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

غم اگرچہ جانِ گسل ہے یہ کہاں بھین کہ دل ہے غم عشق اگر نہ ہو تا غم روزگار ہوتا اسی غم عشق سے زلیلت کا مرہ ملتا ہے۔

عشق سے طبیعت نے زلیلت کا مرہ پایا درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا غم عشق کا چمکا ایک دُف دُف پڑنے کے بعد چھٹتا نہیں۔ اس کے اندازِ جنوں سے دل بصیرت اندوز ہوتا ہے اور پھر اس کے آگے کسی دوسرے کی نہیں مانتا۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھایوں یہی یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے۔ عشق و محبت میں زندگی ایک دائمی ہجوری کی کیفیت بن جاتی ہے اس فراق و محرومی کی حالت میں دل کو سیرِ گلشن کی تاب نہیں رہتی۔

غم فراق میں تکلیف سیرِ باغِ زدو بجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا اس احساسِ ہجوری کا سبب محرومیِ حسن کی تڑپ ہے۔ اس جستجو میں انسان ہمہ تن چشمِ شوق بن جاتا ہے۔

ہنود محرومیِ حسن کو تڑپتا ہوں کرے ہے ہر بن مو کا م چشمِ بنا کا حسن کی نارسائیاں تنہا کی آگ کو بھڑکاتی ہیں یہاں تک کہ عشق میں ایک ایسا مقام آتا ہے کہ عاشقِ حسنِ محبوب سے بے نیاز ہو کر تنہا کی خاطر تمنا کرتا ہے۔ تنہا تنہا کی خاطر اچھوتا مضمون ہے جو صرف غالب ہی کے یہاں

ماتا ہے۔ کہتے ہیں۔
ہوں میں بھی تماشائی نیزنگ تما مطلب نہیں کچھ اس کے مطلب ہی رائے
بہل مقصد حسرت و غم کی لذت ہے۔ دل کے ٹوٹے ٹوٹے ٹھوس ٹھوس سے
آئینہ خانہ مراد لیتے ہیں اور پھر مدعا سے محروم کو اس کی سیر کراتے ہیں۔

مدعا محو تماشائے شکستِ دل ہے آئینہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے
تتاخیر کا روپ بھر کر کسی کے سراغِ جلوہ کے لئے انتظار کی کڑیاں جھینتی ہے۔
کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کوئے خدا آئینہ فرشتہ شمشیرِ جہت انتظار ہے
اس غزل کے ایک اور شعر میں کہتے ہیں کہ محبوب کے وعدہ کا احترام
اسی شکل میں ممکن ہے کہ باوجود اس دشمن کے کہ وہ دے دے گا اہم برابر اس کا
انتظار کئے جائیں۔ جس طرح تما، تناس کی خاطر تھی ابتدا انتظار کی خاطر ہے۔

ہج آپڑی ہے وعدہ دلدار کی مجھے وہ آئے یا نہ آئے پر یاں انتظار ہے
تتا، حسرت اور انتظار سب غم کی شائیں ہیں جن کے ذکر سے کلام غائب بھر اڑا ہے
غائب کے غم میں غم کی حقیقت کا سراغ ملتا ہے جس کا قصداً سوت ہے جو ایک
زبردست شعوی محرک ہے۔

ہوس کو ہے نشاط کا کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیسا
فانی نے جسے ”مر مر کے جسے جانا“ کہا ہے اسے غائب ذوق فنا کی
ناتامی سے تعبیر کرتا ہے۔

جی جیے ذوق فنا کی ناتامی پر نہ کیوں ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے
اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح ادا کیا ہے۔

جلتا ہے جی کیوں نہ ہم اک بار جل گئے اے ناتامی نفس شعلہ بار حیف
اپنے داغ ناتامی کو اس شمع کی تشبیہ و رعایت سے بیان کیا ہے جسے کسی نے
بھجا دیا ہو اور اسے پورا جلتے کا موقع نہ ملا ہو۔

اس شخص کی طرح سے جس کو کوئی بھجائے میں بھی جلتے ہوؤں میں ملے ناتامی

دوسری جگہ پھر شمع ہی کے استعارہ کو لے کر کہا ہے کہ غم کی فطرت ہے کہ وہ جاگداز ہے۔ دوسروں کی غمخواری سے اس کی یہ فطرت نہیں بدل سکتی۔

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں لیکن ذوق فنا کی نامتائی خود حیات کا اقتضا معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بغیر غم زبست کیسے حاصل ہو؟ اور اگر غم زبست نہ ہو تو متنا کی زیرنگیاں کیسے جلوہ افروز ہوں؟ نفس شعلہ بار کی نامتائی کے ذکر کے ساتھ اس کو زندگی کے ساتھ کبھی خوشی سے ہم آہنگ کیا ہے۔

نالے غم میں چند ہمارے سپرد تھے جو داں نہ کھینچ سکے وہ یہاں آ کے دم ہو رہی نالے جو عالم ازل میں کھینچے جاتے وہ وہاں نہ کھینچے جاسکے تو دنیا میں سانس بن گئے۔ اس طرح زندگی کی بنا غم و الم ٹھہرتے ہیں۔ کبھی عاشق پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ فرط غم سے اس کو اپنے وجود کا اعتبار باقی نہیں رہتا۔

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے اس شمر میں فرماتے ہیں کہ میرے سوز غم نے جگر کو ایسا پھونکا کہ سوائے داغ کے اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ اب اگر میں کسی سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے تو کوئی باور کرنے کو تیار نہ ہوگا۔ اس سے یہ استدلال کیلئے جو لطف اور بلاغت سے خالی نہیں کہ غم کی وجہ سے ہستی کا اعتبار ہی جاتا رہا۔ بعض جگہ غالب کے ہاں غم کے مضمون میں بھی ایک خاص قسم کی خوشی ملتی ہے جو اس کے مزاج شعری سے سازگار ہے۔ موت اور کفن کے مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

دھانپا کفن نے داغ عجب برسنگی میں ورنہ ہر لباس میں رنگ وجود تھا

اک خون چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پر جو سکی

غالب کا تصور غم فانی کے تصور غم سے مختلف ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ غالب بھی اس کے قائل ہیں کہ زندگی کی بنیاد غم پر قائم ہے۔ لیکن ان کے نزدیک۔ اس عمارت کے در و دیوار پر ایسے نقش و نگار بھی ملتے ہیں جو پرستار اہل جاذب نظر ہیں اور جن میں اتنی کشش ہے کہ وہ احساس غم کو بھی بھلا دیتے ہیں چاہے وہ عارضی طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ غم اور ناامیدی کی تاریکی بر غبی غالب کی حقیقت نگراں نگاہ نے امید کی کرن دیکھی کہ یہی حیات کی نمان ہے۔ چنانچہ زندگی کے پُر امید گوشوں پر اس کی نظر گئی اور اس نے انھیں سمجھنے کی کوشش کی جس کا اظہار اس شعر میں بڑی خوبی سے کیا ہے

سرایا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افروز حاصل کا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خالق فطرت نے جب دیکھا کہ انسان اپنی انفرادیت اور خودی کے خول میں ایسا بند ہے کہ اس سے باہر آنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتا تو اس نے انسانی دل کو غم عشق کی کک سے آشنا کر دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خودی اپنے آپ میں گھٹ کر فنا ہو جاتی۔ غم عشق بھی فنا (ٹریجڈی) کی طرف لے جانا چاہتا ہے اور بے جاتا ہے اگر اس پر مذہب و اخلاق کی بندشیں نہ عاید ہوں جن کے بطن سے تہذیب جنم لیتی ہے۔ غالب کا اوپر کا شعر ہمیں عالم تہذیب کی سیر کرانا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سچ ہے کہ میری فطرت سراپا رہن عشق ہے لیکن اس کے ساتھ میری فطرت میں زندگی سے الفت و دیست ہے۔ غم عشق کا فہتا چاہے ٹریجڈی ہو لیکن باوجود اس کے زندگی کی گہرائیوں میں سے کوئی سرگوشیاں کرتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ تیرا مقدر فنا نہیں بچا ہے۔ زندگی کی یہ عجیب و غریب اور پُر اسرار کشش ہے کہ وہ ایک طرف تو برق کی پرتش کرتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حاصل جبات کو سنت سنت کر اوبھی چا

کر رکھنا چاہتی ہے اس احساس نے غالب کو امید پرست بنا دیا جو باوجود غم و غم عشق کی حقیقت کو ماننے کے زندگی کے خوشگوار اور پرست تجربوں کی بھی قدر کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ دوسرے بھی قدر کریں۔ غم و مسرت کی دھوپ چھاؤں جس سے انسانی زندگی عبارت ہر کائنات ہستی کا ایک طلسمی مزہ ہے۔ اگر غم و مسرت ایک دوسرے کے پہلو میں موجود نہ رہیں تو زندگی کی حقیقت سادہ اور یک طرفہ ہو جائے غالب کا زندگی اور آدھ کا یہ نقطہ نظر حقیقت پر زیادہ حاوی اور صحت مند ہے۔ اس کو غم کی تائید میں بھی اسیہ کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں کہ یہی حاصل حیات ہیں۔

عہد جدید کے شاعروں میں حسرتِ ربانیت پسند ہیں لیکن لذتِ آزار سے وہ بھی بالکل بیگانہ نہیں۔ ان کی پُر اسیہ کی تہ میں سوز و گدازِ دردِ مندی کی جھلکیاں قدم قدم پر دکھائی دیتی ہیں۔ جن سے ان کے تغزل کے اثر و آہنگ کا پتہ چلتا ہے۔ کہتے ہیں۔

ہوتا ہے برا لذتِ آزار کا لپٹکا مرنا بھی کہیں مجھ کو یہ دشوار نہ کر دے
کچھ حد بھی ہے اس شورشِ خاموش کی حسرت یہ کشمکش غم تجھے بے کار نہ کر دے

عشق کی رُوح پاک کو تھو غم سے شاد کر اپنی جفا کو یاد کر میری دغا کو یاد کر
جان کو محو غم بنا دل کو دکھا ہناد کر بندہ عشق ہے تو یوں قطع رہ مراد کر
جگر کے غم و الم میں بھی رنگینی ہے کیا خوب کہا ہے۔

رنگینی الم میں دیکھا ہے جن کو اکثر اسے دل! وہی تو جلوے مرزا یہ نظر ہیں
غزل گو شاعر عاشق ہوتا ہے اور عاشق کی ہر بات دنیا والوں سے
الگ ہوتی ہے۔ اس کا ہر اندازِ نرالا اور اس کی ہر شان میں انوکھا پن ہوتا ہے
وہ دوسروں کی چلی ہوئی راہ پر نہیں چلتا بلکہ اپنی الگ سادہ نکالتا ہے چاہے
وہ سیدھی ہو یا ٹیڑھی اس سے اسے محبت نہیں۔ اگر ٹیڑھی بھی ہے تو ہوا
کرے۔ اس کو یہ اطمینان کافی ہے کہ اگر وہ بھٹکے گا تو بھی اپنی ہی راہ پر بھٹکے گا

اس کی اصل منزل تو خود اس کا اپنا دل ہے جس تک اس کی رسائی رہنی چاہیے اس کے علاوہ وہ کچھ اور نہیں چاہتا۔ دوسرے غم سے بھرا تے ہیں لیکن عاشق غم کی پرورش کرتا ہے۔ لذت الم اس کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے جس کی وہ چھپا چھپا کرمحاطت کرتا ہے۔

دنیا والوں کا قاعدہ ہے کہ بچ والہ اور مصیبت کو دور کرنے کے لئے دعا کرتے ہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ دعا مانگو تاکہ تمہاری احتیاج پوری کی جائے اگر شدت خلوص سے کوئی چیز طلب کی جائے تو ضرور ہے کہ وہ حاصل ہو۔ عاشق کہتا ہے کہ اگر میں دعا مانگوں گا تو وہ ایک طرح کی شکایت ہوگی۔ مذہب کہتا ہے کہ دعا سے بہت سی آنے والی بلائیں مل جاتی ہیں۔ عاشق کہتا ہے کہ میں تو بلاؤں کو دعوت دیتا ہوں۔ ان کے بغیر زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ جب تک غم زیت کی خلش نہ ہو زندگی کس کام کی؟ وہ زاہد ناداں کو اس طرح خطاب کرتا ہے :-

نہ مانگ زاہد ناداں ذرا سمجھ تو ہسی
شکایتیں ہیں کیس کی دعا کے پرے میں (مال و طوی)
اگر کبھی اس کی زبان سے دعا کے لفظ نکل گئے تو بہت جلد انھیں واپس لینے کی فکر کرتا ہے۔ اسے خوف ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دعا قبول ہو جائے۔ وہ اپنی زامت کا اظہار اس طرح کرتا ہے۔

بہت بخلی ہے ترے دروسے دعا میری
یہ خوف ہے کہ نہ سن لے کہیں خدا میری (حسرت)
دعا قبول نہ ہونے کی وہ دعا مانگتا ہے۔

کسی کی خاطر نازک کا آگیا ہے خیال
دعائیں مانگ رہا ہوں دعا قبول نہ ہو (جنگر)
غالب کو جب احابت دعا کا یقین ہو گیا تو اس نے سوائے دل بے

مدعا کے اور کوئی چیز طلب نہ کی ۔

گر تجھ کو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ
داغ کی دعا کو در قبول تک جانے میں اسی طرح تامل رہا جس طرح
اس کے محبوب کو اس کے ہاں آنے میں ۔

آئے وہ بے وفایہاں اس کی ہلا کو کیا غرض

جائے در قبول تک میری دعا کو کیا غرض
فانی اسے محبت کی توہین خیال کرتے تھے اگر عاشق دعائیں اثر کا طالب
ہو ۔ ان کا شعر ہے اور اخلاقی حیثیت سے بڑا بلند شعر ہے ۔

تنگ ہے سنی عرض محبت فرض محبت پورا کر

اس کے سوا کچھ یاد نہ رکھ بھولے سے اثر کا نام نہ
دعا سے گزر کر جب نالوں تک لوبت آتی ہے تو عاشق کو اندیشہ پیدا
ہوتا ہے کہ کہیں ان کی رسائی نہ ہو جائے ۔ اس کو فکر ہوتی ہے کہ اگر آفلک
سوز اپنا کام کر گئی تو پھر شب بھراں میں کس سے شکوے بیان کئے جائیں گے
اگر فلک رہا تو پھر ان شکوؤں کا سننے والا کون ہو گا ؟ ۔ یہ عجیب و غریب
شاعرانہ اندیشہ ہائے دور و دراز ہیں ۔ مجروح کا لاجواب شعر ہے :-
پھر کس سے شکوے شب بھراں میں میں گئے کام اپنا کہیں آہ فلک سوز نہ کر جائے
کبھی یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں نالوں کی وجہ سے محبوب بے تاب محبت نہ ہو جائے
جگر کا شعر ہے ۔

کون دیکھے اسے بے تاب محبت لئے دل تو وہ نالے ہی نہ کر جن میں اثر ہوتا ہے
خوگر غم کے لئے نالہ کشی حسن طلب ہے ۔ اس کے نالے شکوہ جفا کے لئے
ہیں بلکہ تقاضائے جفا کے لئے ہوتے ہیں ۔ غالب نے اس مضمون کو اس
طرح ادا کیا ہے ۔

نالہ جز حسن طلب لے ستم ایجاد نہیں ہے تقاضائے جفا شکوہ پیدا نہیں

اب تک مشقیہ شاعری کے اس رجحان کا ذکر کیا کیا جس کا خطاب مجاز سے ہے لیکن انسانی ذہن و وجدان کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ مجاز و حقیقت کو ایک دوسرے سے بالکل جدا کرنا دشوار ہے۔ حافظ کہہ گئے ہیں۔

مادر پیالہ عکس رخ یار دیدہ

اے بے خبر ز لذت شرب مدام

اہل نظر کو مجاز میں حقیقت کا یہ تو نظر آتا ہے۔ معرفت الہی بغیر معرفت نفس اور معرفت کائنات کے ممکن نہیں۔ ذات احدیت جو واجب محقق ہے اسما و صفات سے منزہ اور خلق و مجاز سے ماوراء ہستی لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مظاہر کو نیہ کی احوالیت کیا ہے؟ بقول غالب

جب نہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ کوگ کیسے ہیں نغمہ و عشوہ واد کیا ہے؟

شکن زلف عنبریں کیوں؟ نگہ چشم سر نہ سا کیا ہے؟
ان سوالوں کا جواب غالب نے وہی دیا جو معارف و سلوک کے واقف کاروں نے اس سے پہلے دیا تھا۔

اصل شہود و شاہد شہود ایک ہے حیراں ہوں پھر شاہد ہے کس حساب میں ہنگامہ ہستی کی کرشمہ سازوں میں اور پری چہروں کے غمزہ و عشوہ و ہوا اور ان کی شکن زلف عنبریں اور نگہ سرا میں ارباب عرفان کے لئے تجلیات الہی کی جلوہ فرمایاں موجود ہیں جو انسان کا حقیقی مطلوب ہے۔ اصلی حسن و جمال شاہد حقیقی میں پایا جاتا ہے اس لئے وہی عشق و محبت کے قابل ہے۔ دوسرے مظاہر جمال فریب نظر سے زیادہ نہیں ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ غالب کا تصوف اتنا وارداتی نہیں جتنا کہ میر درد یا نیا زبیری کا۔ اس کا تعلقی اندرونی احساس کے مقابلے میں ذہن سے زیادہ اس کے اسس ذہنی رجحان نے اس کی وسیع مشربی کو اجاگر کیا جو تغزل کی روح رواں ہے۔

عشق کی کیفیات بھی تفصیل، منطقی تسلسل اور مصراحت کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ غزل میں تصوف کے مضمون اچھی طرح کھپ گئے۔ تصوف کے سہارے فلسفہ و حکمت نے بھی ایوان غزل میں باریا یا جن کی بدولت کلام میں تنوع پیدا ہوا اور لطافت، علوم و فنون بیان ہونے لگے جافظ سے لے کر غالب تک مشرقی ممالک کے علم و فن کی ساری ذہنی ترقی ہمیں غزلوں میں نکات شعری کی شکل میں نظر آتی ہے۔ اگرچہ غزل کی حقیقی اساس جذبات ہی رہے لیکن جذبات جذبات میں فرق ہوتا ہے۔ ایک اس شخص کے جذبات ہیں جس کا سینہ علوم و معارف کی روشنی سے منور ہے۔ ایک اس کے جذبات ہیں جو مادی حیوانی زندگی سے آگے اپنی نظر نہیں لے جاسکتا۔ ضرور تھا کہ اس فرق کا اثر غزل کھینے والوں کے کلام پر پڑتا اور پڑا۔

اردو میں میر و درد کا کلام عشق حقیقی کے رنگ میں رچا ہوا ہے لیکن وہ تغزل اور شعریت کے دامن کو کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
ان بوں نے نہ کی مسیحائی ہم نے سو سو طرح سے مرد دیکھا

ہمت چند اپنے ذمے دھر چلے کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس بیچنے کے ہاتھوں مر چلے
دوستہ دیکھا تماشا یاں کا بس تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے
شمع کے ماتہ ہم اس بزم میں چشم تر آئے تھے دامن تر چلے
ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے وہ بھی آڑے آگیا جدھر چلے
جوں شرر اسے ہستی بے بودیاں بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساقیاں لگ رہا ہے چل چلاؤ جب تک بس چل کے ساغر چلے
درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

بسان کاغذ آتش زدہ میرے گھرو ترے جلے بھنے اور ہی بہا رہتے ہیں
فلک سمجھ توہی ہم سے اور گلو گیری یہ ایک جیب ہے سوتا رہتا رہ پکتے ہیں
متوسطین میں غالب اور نیاز بریلوی کے یہاں تصوف کا رنگ ملتا ہے خاص
طور پر نیاز بریلوی نے جو اپنے زمانے کے مشہور صاحب حال صوفی گذرے ہیں
اپنے کلام میں سلوک کے اسرار اور رموز بیان کئے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہو۔

دید اپنے کی تھی اسے خواہش آپ کو ہر طرح بنا دیکھا
صورت گل میں گل کھل کھل کے ہنسا شکل ببل میں چہچہا دیکھا
شعش ہو کر کے اور پروانہ آپ کو آپ میں جلا دیکھا
کر کے دعویٰ کہیں انا ملحق کا پر سردار وہ کھنپا دیکھا
تھا وہ برتر شام و ما سے نیاز پھر وہی اب شام و ما دیکھا
کہاں ہے بادشاہ تخت نشین ہمیں کا سہ لئے گدا دیکھا
کہیں عابد بنا کہیں زاہد ہمیں رندوں کا پیشوا دیکھا
کہیں وہ در لباس معشوقان بر سر ناز اور ادا دیکھا
کہیں عاشق نیاز کی صورت سینہ بریاں و دل جلا دیکھا

تو نے اپنا جلوہ دکھانے کو جو نقاب منہ سے اٹھا دیا
وہیں محو حیرت بیخودی مجھے آئینہ سا بنا دیا

وہ جو نقش پا کی طرح رہی کھتی منور اپنے وجود کی
سو کشش سے دامن ناز کی اسے بھی زمیں سے مٹا دیا

کیا ہی چین خواب عدم میں تھا تھا زلف یار کا کچھ خیال

سو جگا کے شور ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا
 رگ دپے میں آگ بھڑک اٹھی پھونکنے پر اُس بھی بدن
 مجھے سا قیائے آتشین کا یہ جام کیسا پلا دیا
 جہی جا کے مکتب عشق میں سبق مقام فنا کیا
 جو لکھا پڑھا تھا نیا ز نے سو وہ صاف دل سے بھلا دیا

خاک کے تیلے نے دیکھ کیا ہی چاہا ہے شور
 عشق کے میدان میں آ صورت انسان بنا
 جن و ملک کے اوپر کر رہا ہے اپنا زور
 عاشق مولا ہوا چاند کا جیسے چکور
 بل بے سلامی تیری اوسے سمندر کے چور
 سینے میں قلم کو لے قطرہ کا قطرہ رہا

خوشی کا عالم ہے اپنا مقام
 مبارک رہے تجھ کو دعا عطا بہشت
 نہیں آستانِ بحث و تکرار کے
 میاں ہم تو طالب ہیں دیدار کے

غالب کے کلام میں مجاز اور حقیقت دونوں کو بڑی خوبی سے سمویا گیا ہے۔
 غالب کی شخصیت کی طرح اس کے کلام میں بڑی وسعت ہے اس کی چشم
 بینا نے حیات اور کائنات کو ہر ممکن نقطہ نظر سے دیکھا اور ان کی اس طرح
 ترجمانی کی کہ اس میں سب کچھ آ گیا۔ مجاز اور حقیقت جی شرح درد اشتیاق
 بھی اور حسن کرشمہ ساز کی معجز نمایاں بھی۔ شوخی اس بلا کی ہے کہ خود اپنے
 آپ تک کو نہیں چھوڑتے اور کبھی خود اپنے اوپر بھی چوٹ کر جاتے ہیں۔
 یہ سائلِ تصوف یہ ترایانِ غالب تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا
 سائلِ تصوف کے ساتھ پری و شوں کا ذکر بھی کرتے جاتے ہیں کہ ہمیں تجزیہ
 حکمت کی خشکی انسانیت کی شگفتگی پر غالب نہ آ جائے۔
 ذکر اس پری و ش کا اور پھر بیان اپنا بن گیا تیب آخر تھا جو راز داں اپنا

مجاز کو بعد میں دیکھیں گے۔ آئیے دیکھیں وہ حقیقت کی نسبت کیا کہتے ہیں، انھیں جو کچھ کہنا ہے بڑی بلند آہنگی سے کہتے ہیں۔ مقبذل اور پیش یا افادہ تشبیہوں سے انھوں نے ہمیشہ احتراز کیا۔ ان کے طرزِ ادا کی جدت کا یہ اقتضا تھا کہ خود اپنے تخیل سے نئی نئی ترکیبیں بندشیں اور اچھوتے استعارے اور کنائے ایجاد کریں۔ چنانچہ انھوں نے یہی کیا۔ ہر بات کو انوکھے طریقے سے بیان کیا۔ واجب الوجود کے مسئلہ کو کس معنی آفرینی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

ہر چند ہر ایک شے میں توہن ہے بد بختی سے تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مت فریب ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب آخر تو کیا ہے اسے نہیں ہے

ہے تجلی تری سامان وجود ذرہ بے پر تو غور شید نہیں

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری ہم کر دیا کا فرمان احصاء خیالی نے مجھے

ہر جز جلود یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود میں

ہے مثل نمود صور پر وجود مجسر یاں کیا دھڑا ہے قطرہ و موج جباب میں

بحر کا وجود ان صورتوں کے تعدد پر مبنی ہے جو کبھی قطرہ کا کبھی موج کا اور کبھی جباب کا روپ اختیار کر لیتی ہیں۔ مختلف صورتیں بحر سے علیحدہ کوئی وجود نہیں رہتیں بلکہ اس کی شانیں ہیں۔ وہ جلود گر ہوتا ہے۔ اگر شائیں نہ ہوں۔ بحر کی ہستی نامکمل رہ جاوے۔ شاعر نے یہ ہی لطیف اور یلغ

طریقے سے انسانی وجود اور مظاہر خارجی کو اس طرح خالق کائنات سے وابستہ اور خود ان کی وجہ وجود کو آشکارا کیا ہے۔

بے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں غیب انغیب سے تصوف کی اصطلاح میں احدیت ذات مراد ہے جو عقل و اور اک کی حدود سے پرے ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جس کو تم عالم ظاہر سمجھ رہے ہو جو کثرت و تعدد کی صورت میں نظر آتا ہے وہ ذات احدیت ہی ہے۔ اس کی جلوہ فرمایا ہوں سے دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ مظاہر کوئی اس سے کوئی علیحدہ ہستی کھتے ہیں۔ حالانکہ یہ اس سے جدا نہیں ہیں۔ غالب نے بڑی دقیقہ سنجی سے مندرجہ بالا شعر میں خواب کی تمثیل سے اپنا مطلب واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ وضاحت تفصیل سے بے نیاز ہے۔ شاعرانہ وضاحت میں بھی رمز و ایسا کی مبہم کیفیت موجود رہتی ہے۔ چنانچہ اس شعر میں بھی اس کی مثال ملتی ہے۔ کوئی شخص اگر خواب کی حالت میں یہ دیکھے کہ وہ بیدار ہے تو کیا وہ واقعی بیدار ہوگا۔ نہیں۔ خواب میں اپنی بیداری کا خواب دیکھنے والا خواب ہی میں ہوگا۔ کائنات کے جلووں کی بوقلمونی اور انسان کی طاقت دید کے محدود ہونے کو اس طرح ظاہر کیا۔ صد جلوہ رو برو ہے جو مژگاں لٹھائیے طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے دیوان غالب میں اسی طرح کے اور اشعار ملتے ہیں جن میں سلوک تصوف کے مہلک پیش کئے گئے ہیں۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسرب جدا جدا ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
یعنی کجس گردش چہانہ صفات عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہیے

محرم نہیں ہے تو ہی تو اباسے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
لیکن غالب کے کلام کا بیشتر حصہ عشق مجازی کی کیفیت پر مشتمل ہے اور کہیں کہیں بڑی دقیقہ رسی سے زندگی کی گہٹیوں کو حکیمانہ انداز میں رمز و ایما کے ذریعے

بلھایا ہے۔ اس کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت جو اسے دوسروں سے متاثر کرتی ہے اس کا طرز ادا ہے جس کو اردو شاعری کے لئے سرمایہ نازش سمجھنا چاہیئے۔ ہمارے اکثر شاعر ایک ہی لکیر کے فقیر ہیں۔ جولدت پرستی کی طرف مائل ہوا تو وہ کائنات میں سوائے اس کے اور کچھ دیکھتا ہی نہیں جو اندوہ و الم سے متاثر ہوا تو اسے حسرت و غم کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ لیکن زندگی تو بڑی وسیع شے ہے۔ وہ مسرت اور غم اور لذت پرستی سب پر حاوی ہے اور پھر ان سے بالاتر بھی ہے۔ غالب نے اس نکتہ کو پا لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں ہمیں تنوع نظر آتا ہے جو اس کی ہمہ گیر شخصیت کا عکس ہے۔ اس کے یہاں غم بھی ہے اور مسرت بھی، جوش جذبات بھی ہے اور حکیمانہ نکتہ رسی بھی۔ تلخیل کے نقش و نگار بھی ہیں اور حقائق و محسوسات کی ترجمانی بھی۔ دیوان کا دیوان ایسی دل آویز موسیقی میں رچا ہوا ہے کہ اسے فردوس گوش کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔

غالب اور نیاز بریلوی کے بعد بھی غزل میں تصوف کے نکات اور مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ چنانچہ فانیؒ اصغر اور جگر بادہ تصوف کے ذوق شناس ہیں۔ عارفانہ مضامین میں اگر حدت ادا کی دلاویزی بھی شامل ہو جائے تو یہ شراب دو آتشہ ہو جاتی ہے اور اہل ذوق کے قلب پر بجلیاں گرنے لگتی ہیں۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

فانیؒ

تجلیات و ہم ہیں مشاہدات آب و گل	کرشمہ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا
حسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری	ہوں تو میں شمع مگر بجھیں ہے پروانہ کا
اٹھتی نہیں تہمت نظارہ جمال	منہ دیکھتا ہوں جلوہ نظارہ ساز کا
کوئی چٹکی سی کلیجہ میں لئے جاتا ہے	ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے
حسن مطلق بھی ہے حجاب ان کا	اعتبار است بر ملا کی قسم

ہزار ڈھونڈئے اس کا نشان نہیں ملتا
تعمیلات کی حد سے گزر رہی ہے تنگ
جس میں ملے تو ملے آستان نہیں ملتا
بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہوں کا
ہم تمہارے ہیں ورنہ بھڑھم کیا
اس مرحلہ سنی، ماشائے گذر جا
اپنی ہی نگاہوں کا یہ نظارہ کہاں تک

اعتراف گونڈوی

شورشِ دل جو وہ ہوتی تھی بدستور ہے آج
جس سے کل تک دل قیاب میں کھینکا جاتا تھا
ہمیں معلوم وہ نزدیک ہے یا دور ہے آج
اسی شکلہ کو جو دیکھا تو سر طر ہے آج

بزدلہ حیران میں آ کر کوئی ہے اس کے سوا
میں تو ان عجوبوں پر بھی سراپا دید ہوں
لے خوش اور جسے کز نزدیکی بھی ہے دوری بھی ہے
اس کے جلوے کی ادالک شان ستوری بھی ہے
میری عروسی کے اندر سے یہ دی اس نے صدا
قرب کی راہوں میں میری ایک راہ دوری بھی ہے

اس جلوہ گاہِ حسن میں چھایا ہے ہر طرف
میں ہوں ازل سے گرم رو عرصہ وجود
ایسا حجاب چشم تماشا کہیں جسے
میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے

یہ عشق نے دیکھا ہی عقل سے پہناں ہے
لے پیکرِ محبوبی میں کس سے تجھے پوچھوں
قطرہ میں سمندر ہے ذرہ میں بیاباں ہے
جس نے تجھے دیکھا ہے وہ دیدہ حیراں ہے
سوار تیرا دامن ہاتھوں میں میسے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

جگر

حسن کے مجوزہ وحدت و کثرت کی قسم
تجھ کو دیکھا مگر اس طرح کہ دیکھا ہی نہیں
چشم حیرت میں ہے رب کچھ سرِ حیرت کی قسم
اپنی کلم مائیکگی جرات و ہمت کی قسم

مجھ سے چھپتا تجھے زیبا نہیں ہے پیکر حسن میں محبت ہی محبت ہوں محبت کی قسم

کرشمے ذات و صفات کے ہیں بحال قدرت دکھائے ہیں
کہ ہر تصور سے دور رہ کر وہ ہر تصور میں آ رہے ہیں
کہاں کی دید اور کس کا عرفاں جو اس گم ہیں نظر پر نشان
جو ایک پردہ اٹھا رہے ہیں تو لاکھ پردے گرا رہے ہیں
یہ حادثات زمانہ کیا ہیں اسی کے حسن طلب کے جلوے
دلوں کو ٹھوکر لگا لگا کر دلوں کی دنیا جگا رہے ہیں
کرشمے ہیں حسن بے جہت کے فتنوں ہیں شہم مناسبت کے
ادھر سے دیکھو تو آ رہے ہیں ادھر سے دیکھو تو آ رہے ہیں
نفس نفس میں صفات تازہ موت تازہ حیات تازہ
انھیں میرے ذات تازہ جو خود کو تجھ میں مارت ہیں

لگا و شوق ہی کچھ جانتی ہے راز ستوی وہ خود جلوہ ہے ان کا تب سے پردا سمجھتے ہیں

یہ فریب جلوہ ہے سر بسر مجھے ڈر یہ ہے دل بے خبر
کہیں جم نہ جائے تری نظر انھیں چند نقش و نگار پر
میں رہن درد ہی سگر پیچھے اور چاہئے کیا جگر
عسم یار ہے میرا شیفتہ میں فریفتہ عسم یار پر

ہجوم تجلی سے مسرور ہو کر نظر رہ گئی شعلہ طور ہو کر
مجھی میں رہے مجھ سے مسرور ہو کر بہت پاس نکلے بہت دور ہو کر
ترے حسن مغرور سے نسبتیں ہیں کہیں ہم نہ رہ جائیں مغرور ہو کر

۱۱۳
 لحظہ بہ لحظہ دم بہ دم جلوہ بہ جلوہ آئے جا
 تشنہٴ حسن ذات ہوں تشنہٴ لبی بڑھائے جا
 لطف سے ہو کہ قبر سے ہو گا کبھی تو روبرو
 اس کا جہاں پتہ چلے شور و یش بچائے جا

عراج شوق کیلئے یا حاصل تصور جس سمت دیکھتا ہوں تو سرگرداں ہے
 شعر کی تاثیر کا انحصار لفظوں کے برجستہ اور موزوں استعمال پر منحصر ہے
 لیکن شعر کی روح چونکہ رمز و ابہام کے طلسم میں پوشیدہ ہوتی ہے اس لئے
 لفظوں کے معنی میں تشبیہ اور استعارہ اور کنایہ سے وسعت پیدا کی
 جاتی ہے۔ تشبیہ میں وہ قوت اور تاثیر نہیں ہوتی جو استعارہ اور کنایہ
 میں پائی جاتی ہے اس لئے کہ اس میں رمز و ابہام کا ایمانی عنصر نسبتاً
 کم ہوتا ہے اور اس کے استعمال سے ایک حد تک مطالب میں وضاحت
 آجاتی ہے۔ اگر استعارہ اور استعارہ بالکنایہ کا استعمال اس لئے کیا جائے
 کہ معنی کی تفصیل اور وضاحت ہو تو وہ بھی تشبیہ کے مثل ہو جائیں گے اور ان
 کی قوت و تاثیر میں کمی آجانا لازمی ہے۔ استعارہ سے حقیقت کی تصویر کشی
 مقصود نہیں ہوتی بلکہ اس کی پیچیدگی کو ظاہر کرنا۔ عالم فطرت کی وسعت
 کثرت متنوع، اس کی بلندیاں اور پستیاں، زمان و مکان کی کبھی نہ ختم
 ہونے والی پہنائیاں، ذہن کی شعوری اور غیر شعوری کیفیات دقیق اور
 الجھی ہوئی ہوتی ہیں جن کی طرف شاعر متوجہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ان سب
 سے زیادہ الجھی ہوئی حقیقت خود اس کے دل کی دنیا اور اس کے جذباتی
 حقایق ہیں جنہیں حرف و صوت کی شکل میں وہ ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ ہر شاعر
 دوہرا مطلب رکھتا ہے۔ ایک کی جگہ دو تصورات ذہن کے سامنے آتے ہیں
 لیکن دونوں میں وحدت پوشیدہ رہتی ہے۔ استعارہ اور کنایہ کی مدد سے

جذباتی حقائق کی بوجھ میں ایک لمحہ میں دلتیں ہو جاتی ہے جس کی وضاحت اگر منطقی طرز میں کی جائے تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو جائیں لیکن اصل بات کا پتہ نہ چلے۔ استعارہ ایک فن ہے کہ اس میں منظر مہیا کرتا ہے جس پر شاعر کی بصیرت حرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ غزل میں استعارہ اور کنایہ کو اہمیت حاصل ہے اور نظم میں تشبیہ کو اس لئے کہ ثانی الذکر کا مقصد تفصیل اور تشریح سے مضمون کو رسالت کے دل نشین کرنا ہے اور اول الذکر کا رمز و ایما کے ذریعہ تحریر میں اضافہ کرنا۔ استعارہ معنی آفرینی اور جدت ادا کا ایک زبردست وسیلہ ہے جسے تغزل میں بہت شاعرانہ کمال پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ معمولی سی بات کو کہاں کہاں پہنچایا جاسکتا ہے۔ مثلاً غالب اس مضمون کو تشبیہ و استعارہ کی زبان میں کیا خوب بیان کرتا ہے کہ انسان کی عمر گزری چلی جاتی ہے اور اس کی گریز پائی پڑیں کو کوئی تابو نہیں۔ یہ شعر رمزی محاکات کا کمال ظاہر کرتا ہے جس میں داخلی اور خارجی عناصر دونوں ہم آغوش ہیں۔

زویں ہے رخسِ عمر کہاں دیکھتے تھے

لے ہاتھ باگ پر ہے نہ پاپے رکاب میں
استعارہ نے معانی کو چار چاند لگا دیے اور معانی کی بلندی اور خوبی نے لفظوں کے چناؤ میں شاعر کو مدد دی۔ یہی حسن ادا ہے جس نے غالب کو غالب بنایا اور اس کے شاعرانہ رتبہ کو اتنا بلند کر دیا کہ اب تک وہاں کوئی نہ پہنچ سکا۔ انسان کی جتنی بے ثبات کی تصویر استعارہ اور تخیل کے ذریعہ دوسری جگہ یوں پیش کی ہے۔

میری تقبیر میں مصمّر ہے اک صورت خرابی کی

ہبعلیٰ برقی خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا
کسی شاعر کی عظمت کا اندازہ اس کے استعاروں کی قوت تازگی اور بلندی سے کیا جاسکتا ہے جو معانی و بیان کی جان ہوتے ہیں۔ استعارہ رمز آفریں

ہوتا ہے اس لئے جذبہ اور اندرونی تجربہ کی تصویر اس سے بہتر کھینچنے والا کوئی اور ذریعہ کلام نہیں۔ زندگی اور خارجی حقیقت کی ہو بہو نقل کے بجائے استعارہ اور کنایہ سے اس کی توجیہ اور باز آفرینی ممکن ہوتی ہے۔ اگر تشبیہوں یا معنی کی تفصیل پر زیادہ توجہ کی گئی تو شعر کا اصلی مقصد فوت ہو جائے گا۔ غزل گو شاعر کے پیش نظر معنی کی صحت سے زیادہ استعارہ یا کنایہ کی صحت ہوتی ہے۔ وہ اشیا اور حقائق کائنات کو دیکھا نہیں دیکھتا اور نہیں دیکھنا چاہتا جیسی کہ وہ نظر آتی ہیں۔ وہ جب انھیں بیان کرتا ہے ان ان لطیف تعلقات کو بھی اپنے پیش نظر رکھتا ہے جو دوسری اشیا اور حقائق سے انھیں وابستہ و چوستہ کئے ہوئے ہیں پھر جب وہ ان کا تعلقی استعارہ اور کنایہ کے ذریعہ اپنے اندرونی جذبہ اور تجربہ کی روشنی میں جوڑتا ہے تو لازمی طور پر اس کا نقطہ نظر داخل ہو جاتا ہے اور اس کے بیان میں رمز و اہام کی کیفیت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ رمزیت موسیقی کی طرح حقیقت اشیا کے جو ناقابل فہم عناصر ہیں ان کی علامت ہے۔ اسی کے ذریعے جذبات کی بھول بھلیاں کے پچ و خم اور ان کی پراسرار کیفیات کا پتہ چلتا ہے ورنہ پیاری منطق ان تضادوں کو دور کر سکتی ہے جو ہاں قدم قدم پر ملتے ہیں اور نہ ان کی کوئی توجیہ کر سکتی ہے۔ جذبہ کے روبرو منطق سرگرداں ہو جاتی ہے اور اپنی نارسائی کو تسلیم کرتے میں اسے قائل نہیں ہوتا۔

غزل گو شاعر اپنے اندرونی جذبات کو غنیمت کی زبان میں بیان کرنے کے لئے کبھی معانی کے لئے سوزوں الفاظ تلاش کرتا ہے اور کبھی انصاف کے لئے معانی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے معانی سے لفظوں کی خارجی صورت معین ہوتی ہے اور لفظوں کے بر محل استعمال سے خود معانی کا تعین عمل میں آتا ہے۔ شاعر کا خیال زبان اور معانی دونوں میں قدر مشترک ہوتا ہے اور دونوں میں رشتہ اور ربط قائم کرتا ہے الفاظ اور معانی کے صحیح ربط سے جن ادا کی جلوہ گری ہوتی ہے جس کے بغیر کلام میں تاثیر نہیں آ سکتی علم و نظر

۱۲۶
 کی رحمت سے معنی آفرینی کے میدان میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ کبھی بعض مخصوص
 شعری علامتوں یا تیموں کا آسرا لیا جاتا ہے۔ کبھی صنائع و بدائع سے شعر
 کے الفاظ کی نشست و ترتیب میں حسن پیدا کیا جاتا ہے اور کبھی نقل قول سے
 ایمانی اثر کو بڑھایا جاتا ہے۔ صدقوں میں حسن تخیل، مبالغہ، تضاد، مقابلہ، ایما،
 مراۃ النظر اور بخارائے مارغانہ سب کی سب غزل کی رمز کی کیفیت اور تاثیر
 کو بڑھاتی ہیں۔ صنائع فطری و معنوی سے شاعر کو ایسے تخیل کی پرواز میں مدد
 ملتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ان کا اعتدال برقرار رہے۔ اگر صفت کی خاطر صفت
 برقی گئی اور شعر کہا گیا تو رمز کی تاثیر مجروح ہو جائے گی۔ صنائع کبھی بلاغت
 سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ ضرور ہے کہ ان سے شعر کی طلسمی تاثیر میں اضافہ
 ہو نہ کہ کمی۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ غزل میں جن ادا کہاں سے آتا ہے؟ اس کے
 قواعد و ضوابط مقرر کرنا ممکن نہیں۔ ایک مطلب کو ایک شاعر اس طرح ادا
 کرتا ہے کہ لطف آ جاتا ہے اور دوسرا دی بات کہتا ہے اور سننے والے
 ذرا بھی متاثر نہیں ہوتے۔ یہ امتیاز ذوق چیز ہے۔ عشق کے پامال مضمون بزعمایت
 کا ایک شعر ہے اور ذوق کا ایک شعر دونوں شعروں کے فرق سے دونوں کی
 شخصیت کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ غالب کہتا ہے۔

عشق سے طبیعت نے زلیست کا مرقا پایا درود کی دو اپائی دردِ دادوا پایا
 فوق اپنی فہم و نظر کے مطابق عشق کو تیرہ خاکدان کے لئے چراغ
 قرار دیتے ہیں۔ معانی اچھے ہیں لیکن لفظوں کی نشست سے اس مضمون
 کی بلندی کی طرف ذہن راغب نہیں ہوتا بلکہ معمولی اور بلکی سی بات معلوم
 ہوتی ہے۔ بلند بات کے لئے طرز و اسلوب کی بلندی لازمی ہے ورنہ کلام
 بے اثر رہے گا۔ ان کا شعر ہے۔

فرغ عشق سے ہے روشنی جہاں کیلئے یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کیلئے

۷۱
اس غزل میں محض رعایت فطری سے جو سنی آفرینی کی کوئٹیشن ہے وہ کسی قدر
تجدیدی ہے۔ - کہتے ہیں

اپنی مولاں میں کیا اس نظم نے چونکہ مہیا
کہ ہاتھ رکھتے ہیں کا زور یہ سب اذائیں کیلئے
ذوق کے ہاں اسی رعایت فطری کی مندرجہ سے طرز ادائیگی قدرت
یا حسن پیدا نہ ہو سکا۔ محمد حسین آزاد انھیں چاہے کچھ سمجھتے رہے ہوں لیکن قبول
میں ان کا مرتبہ بلند نہیں۔ اور غالب کی تودہ گو گو بھی نہیں پہنچتے۔
غالب کا شعر ہے:-

سب کہاں کچھ لالہ رنگ میں تیاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہیں گی کہ نہاں گئیں
ناتواں نے بانگ میں مضمون باندھا ہے لیکن اس کے شعر میں غالب کے شعر کا سا
طبعی اور رمزی اثر نہیں پیدا ہو سکا۔ ناسخ کا شعر ہے
ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں
اس لئے خاک سے ہوتے ہیں گشتاں پیدا

ناتواں نے منطقی استدلال کی کوشش کی جو روح غزل پر گراں گذرتی ہے اسی لئے
اس کا شعر تاثر سے محروم رہا اور اسلوب بیان میں کوئی بلندی یا نزاکت پیدا
نہ ہوئی۔ اس کے برخلاف غالب نے دلیل کے بجائے محض دعوے سے اپنا
کام نکال لیا اس لئے کہ اس کا شعر ایک مکمل استعارہ بالکلیا ہے۔ وہ وہیں
کی اشارہ سے رہبری کرتا ہے استدلال کی بھول بھلیاں میں اسے نہیں
بھٹکتا۔ رمزی اثر کی کمی کے باعث ناسخ کا شعر غالب کے شعر کے سامنے نشر
معلوم ہوتا ہے۔

طرز ادائے انحصار الفاظ اور معانی دونوں پر ہے جو کلام کے اجزائے
لائیک ہیں۔ اگرچہ معانی شعر کی جان ہوتے ہیں لیکن انیس الفاظ کی جو
خارجی قیاس نہیں کرانی جاتی ہے وہ بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے۔

شعر کی اور خاص طور پر شعر غزل کی خارجی حیثیت و اثر کا دار و مدار الفاظ کے صیغ اور مودوں استعمال پر ہوتا ہے۔ لفظوں کو اگر صحیح استعمال کیا جائے تو وہ خود معنی بن جاتے ہیں جس طرح موسیقی میں ہوتا ہے۔ لیکن یہ صورت صرف بڑے اساتذہ کے یہاں نظر آتی ہے۔ عموماً لفظ اور معنی کی دوئی قائم رہتی ہے لیکن اس دوئی میں موزنیت پیدا کی جاسکتی ہے۔ اگر الفاظ کو شعر کا جسم اور معانی کو روح سمجھا جائے تو شعر ہے کہ معین و لیسف روح کا خارجی قائل کشن اور لطافت رکھتا ہو، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوح اور جسم ایک دوسرے کو نہایت ہی پر اہل و اطراد پر متاثر کرتے ہیں۔ انسانی روح کے احوال بڑی حد تک مادی جسم میں کسی نہ کسی صورت میں نمود و نظاں ہو جاتے ہیں اسی طرح مادی جسمانی کیفیات روح پر اپنا گہرا جھاب لگائے بغیر نہیں رہیں بالکل یہی حال الفاظ اور معانی کا ہے۔ اگر کوئی لفظ موقع محل اور مقتضائے حال کے مناسب ہو تو اس کی تاثیر اس لفظ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوگی جو یوں ہی بدلتی اور بے شکے بن سے استعمال کیا گیا ہو۔ چاہے آپ کے معانی کتنے ہی بلند اور گہرے کیوں نہ ہوں اگر ان کی خارجی صورت غیر جاذب نظر اور دل نشینی سے معرا ہے تو خود معانی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور تاثیر تو نام کو بھی نہیں پیدا ہو سکتی۔ شعر غزل کی رمزی اور ابائی کیفیت اس دقت تکمیل پائی ہے جب الفاظ و معانی ہم آہنگ اور مقتضائے حال کے سب مطالعوں کو بولا کرتے ہوں۔ اسی سے طرز ادا کی دل نشینی عبارت ہے جو کسی ایک خیال یا احساس حق کے کسی ایک لمحے کو ابدی بنا دیتی ہے۔

الفاظ میں تصورات پوشیدہ ہوتے ہیں ہر تصور اپنا ایک پس منظر رکھتا ہے جو ہمیں ذہنی طور پر مخصوص گرد و پیش میں لے جاتا ہے۔ غزل گو شاء بعض دفعہ تعلیمات کے ذریعہ جو دراصل ایمانی حیثیت رکھتی ہیں ہمیں ایک

خاص فضا کی سرکرا دیتا ہے۔ موسیقی اور طور، شیریں اور فرہاد، اعلیٰ اور محضوں،
عمود اور ایاز کی تنگیوں کا نرم خیالات کی باز آفرینی کے لئے نہ ہر دست و حرکت
شعری بن جاتی ہیں۔ اور یہ صرف تبلیغات ہی تک محدود نہیں۔ ہر لفظ میں وقت
اور توانائی کا خزانہ چھپی ہوتا ہے بشرطیکہ اس کو برتنے والا اس کے استعمال کا
ذہب جانتا ہو۔ بقول غالبؔ:

تجفیف نہ سنی کا طلسم اس کو سکھے
جو لفظ کے قالب میں رکھے اس قدر آئے

ہر لفظ کی ایک جوہری انفرادیت ہوتی ہے۔ چنانچہ کبھی ایک لفظ سے جو
خیالی تازنات اور ذہنی مسکھات پیدا ہوتے ہیں وہ اس کے ہر اہل انشا کا
سے کبھی بھی پیدا نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کسی ایک زبان کے
شعر کا دوسری زبان میں جیسا ترجمہ ہونا چاہیے وہاں نہیں ہو سکتا بعض لفظ
ایک نقطہ میں ایک جہان مبنی پہنا ہوتا ہے۔ اور ذہن کو ایک خاص فضا
میں لے جاتا ہے۔ چنانچہ شعر غزل میں آہنگ احساس اور آہنگ سماعی
کا جو ایک لطیف ربط قائم ہو جاتا ہے اس کو کسی دوسری زبان میں منتقل
نہیں کیا جاسکتا۔ بحر اور قافیہ اور ردیف کے سانچوں میں ڈھل کر لفظوں
کی جوہری انفرادیت اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے اور انھیں سن کر محنت
شعور کی بھولی بسری یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ بالکل اپنی طرح جیسے بعض وقت
خواب کی حالت میں گزشتہ واقعات اپنی جتنی جاگتی شکل میں نظروں کے
سامنے آ جاتے ہیں۔ یہ خواب کی کیفیت بھی دراصل اشارہ اور کنایہ کی کیفیت
ہوتی ہے جن کی تفصیلی خلا کو ملاحظہ بعد میں کر لیتا ہے۔

غزل کی ہر بحر اپنے اندر ایک قسم کا رمز دیا رکھتی ہے۔ مثلاً بحر
رمل جو سرعت کے ساتھ پڑھی جاتی ہے اردو غزل نگاروں کے ہاں اپنی سہمی
خوبیوں کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی۔ میں یہ بات دعوے سے تو نہیں کہہ

نیکن ہر خیال ضرور ہے کہ عربی اور فارسی میں اس بحر کو اتنی تبدیلیت حاصل نہ ہوئی
جتنی کہ اردو میں۔ ممکن ہے کہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ یہ بحر منہی بحر منہی بحر منہی
سے نسبتاً قریب تھی۔ اس بحر کے شعرا کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔
رمل سدس مجنون تصور

شیخہ اسے کی شرت اسے ساقی پھیر دے مست کہ بھرے بیٹھے میں
نا صحو آپ میں جرات نہ رہا اب سمجھ کر اسے سمجھائیے گا
(برائت)

رمل شش مجنون مخدوف۔
ہوس گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بیٹے پر دہالی نے مجھے
(غالب)

چرخ گوہ یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردہ نگاری میں
(اصبا لکھنوی)

رے وعدے پر بٹے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مرہ جاتے گرا اعتبار ہوتا
(غالب)

رمل سدس مجنون مخدوف
نہ کچھ آشفستہ سری نے مارا کہ مجھے چارہ گرمی نے مارا
(مومن)
اہل تدبیر کی دانا ندگیاں آبلوں پر بھی خا باندھے ہیں
(غالب)

بجر کے غم سے نہ گھرجات ^{۱۲} اتنا حسد ان نہیں رہا ہے کیا
(عرشہ)

یوں قور و ٹٹے میں مگر لوگوں سے بولتے تان ہیں اکسیر میرا
(نشا ام بایرانا)

تھک کے بیٹھوں تو بکتا ہے جنوں ، دست و پا کو چڑھ سوئی ہے
(جلیل)

بحر اور رریف و اذیفہ کے موزوں انتخاب کے علاوہ غزل گو شاعر خاص طور پر
ایسے الفاظ پر مبنی ہے جن کے ساتھ شری قصوات صدیوں سے

وابستہ ہو گئے ہیں اور ان سے ایک خاص قسم کی ایمانی فضا کی تخلیق مکن ہے۔ طرزِ ادا اور
حسنِ سخن ان کے کوئی علم و حیر نہیں۔ میں اس جگہ صرف چند اس قسم کے رمزی اور علامتی لفظوں
کی مثالیں پیش کرنا ہوں جنہیں ہم ایسے غزل نگاروں نے محض شری کے طور پر برتنا ہی مثلاً جنوں ،

گر بیان ، ذخیرِ نوح ، شبابِ آفتاب ، نفسِ امار ، سطح کے بہرے ، اصطلاحی لفظ اور علامتیں
ہیں۔ گویا ان کے چاک ہونے میں عشق و شوق کی آشفٹ سری کی خاص رمزی اور ایمانی گویا
ہے۔ یہاں میں جنہیں ہم ایسے شاعروں نے محسوس کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔
جنوں و گریبان۔

زندہ ہیں ابھی غور و ش زنگی اپنے جنوں کی اب سنگ بدادو اور اس آشفٹ سری کا
(دیس)

جنوں تیری منت ہے مجھ پر کہ تو نے نہ دکھا مرے سر پہ بار گریبان
(سیر)

اب کے جنوں میں نامہ شادی کی کچھ ہے دامن کے چاک اور گریبان کے چاک میں
(سیر)

اگر زنجیر میرے پیر میں ڈالی تو کیا ہوگا بہاؤ آنے دو میرا تھ ہے اور گریبان
(یقین)

لے دست جنوں تیری مدد ہوئے نوب بھی اک جھٹکے میں ملتا ہے گریباں ٹھکانے

گر ہے یہی بہار کی شورش تو ناصحا (جھ سے نہ ہو سکے گی گریباں کی احتیاط)

مرے دست جزئی کو مشط اچھا مل گیا (جزئی حیرت)

بیکاری جنوں کو ہے سر پیشنے کا شغل (اللہ اعلم)

تب چاکِ گریباں کا مزہ بدل نالاں (عقاب)

نہ ناصح سے نادان کیا ہوا اگر اس نے شدت کی

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر (عقاب)

رہ گیا چاک سے وحشت میں گریباں خالی (آتش)

ایسی وحشت نہیں اپنی کہ ہو محتاجِ بہار (دراغ)

کیا کہیں آمد بہار ہوئی کیوں گریبان پہ ہاتھ جانے لگے (مروج)

چاک ہو پردہ کو وحشت مجھے منظور نہیں (دراغ)

چاک کر میرے گریباں کو نہ لے دستِ جنوں (اسیر کھنوی)

فصل جنوں ہے جامہ در کی بہار ^{۲۳} کوٹے وہ ہاتھ جو کہ گریباں کو دور ہے
(صبا لکھنوی)

اس کے دامن سے اُبھرتا ہے ادب لے دست شوق
یہ بھی دیو اس نے کوئی میرا گریبان ہو گیا
(فتانی)

جوش جنوں سے کچھ نہ چلی ضبط عشق کی
سو سو گلے سے آج گریباں نکل گیا
(جگر)

کیا کیا ہوا ہنگام جیتوں یہ نہیں معلوم
کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا
(اصغر)

غضب ہوا کہ گریباں ہے چاک ہونے کو
تہائے حسن کی ہوتی ہے آج پردہ در
(اصغر)

نشانی ہم نے رکھ چھوڑی ہے اک اگلی بہار ان کی
بہار آئی گلے میں ڈالی دہمی گریباں کی
(نیرودہ بھوی)

زنجیر :-

دل بند ہے بہار موج ہوئے گل سے
اب کے جنوں میں ہم نے زنجیر کیا خالی
(مست)

کچھ موج ہوا بیجاں لے یہ نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی
(مست)

ہاتھ میں سلا، زلف گرہ گیر نہیں
زور دیوانہ ہوں میں بستہ زنجیر نہیں
(خواجہ وزیر)

قیدیں ہے ترے وحشی کو دہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک بچہ گراں باری زنجیر بھی تھا
(غالب)

خانہ زاد ارفیق بن زبیر سے بھاگ کر گئی تھی۔^{۱۴} لیکن اگر غدار بلال زنداں سے بھاگ کر آگیا۔

جے شوق یار میں ہمہ تن رنگ استغریب

و حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو قتل کرنے سے منع کیا
مگر وہ نے کہا کہ میں نے اسے قتل کر دیا ہے۔

زلفوں کی تری لہر نہاے نہیں گرائے
 ہر موجدِ عربیہ ہو زنجیر کا دھوکا
 کس کے زنجیر کو آنکھوں سے لگا ہے کون
 کس کے دل میں پادشاهِ دیوانوں کا
 (عبد اللہ خان تہا)
 (شاعرِ عظیم آبادی)

پھر گوشتہ گیر طبقہ زنجیر ہے جنوں
صعرا کو نہ رستگاری اندازاں کے ہوئے
(فتانی)

زنجبیر پھر بلادی نسیم بہار نے پھر باہر آب سے تراویان ہو گیا (جنگل)

سج

موج کی حرکت بے تابی اور بے تعینی تغزل کی رمزِ ظاہری میں مختلف سرایا
میں ملتی ہے۔ کہیں موج بہار کہیں موجِ رنگ کہیں موجِ گل کہیں موجِ
نشاط اور کہیں خالی موج بطور استعارہ محرکِ شعری بنی ہے
میر صاحب کا شعر ہے

تھی عشق کی وہ ابتدا جو موج سی ٹھی کھبو اب دیدہ ترکو جو تم دیکھو تو ہے گرد آسما
خاست کے ہاں خاص کر لفظ موج اصطلاحی غالب کر کے ملی ہیں۔ گل میں
موج رنگ کی شوقی فریفتہ ہونے کی چیز نہیں۔ رنگ تو اصل میں گل کی

خونین فوائی کا نتیجہ ہے۔ حسن توجہ ملاحظہ ہو۔

جو تھا سو موج رنگ کے دھوکے میں گر گیا لئے وائے نالہ لب خرمین نولے نعل

(غائب)

محبوب کی رفتار کی مشکوٰۃ طرازی کے ذکر میں موج کی دل فریب تشبیہ سے کیا خوب کام لیا ہے۔

دیکھو تو دل فریبی انراؤ نقش پا موج حرام یا رہ بھی کیا گل کتر گئی
موج بہانہ کی دیوانگی قابلِ تامل ہے کہ وہ مستحق کو درسِ خرام دیئے
چلی ہے۔ اسی وجہ سے اس کو نقش پا کی طرح غیر متحرک اور پابہ زنجیر ہو ناپڑا۔
دیوانگی ہے تجھ کو دوسرے حرام دنیا موج بہار بکسر زنجیر نقش پا ہے سلسلہ
(نسخہ حمیدیر)

لہ موج حرکت مستی کی علامت ہے جسے غائب نے اپنے کلام میں طرح طرح سے استعمال کیا ہے
خاص کر اس کلام میں جو بیدل کے رنگ میں ہے۔ لفظ موج کو کہیں تشبیہ اور کہیں استعارہ
اور کہیں استعارہ بالکنایہ کے طور پر باندھا ہے اور اس کے استعمال کی کثرت غائب کے
ذہنی تصور کے حرکی اور قوت آفرین ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اسی طرح سیلاب اور سیلاب
کے لفظ بھی جا بجا جاملئے ہیں۔ اس سے زیادہ حرکی تصور حیات کیا ہو گا کہ درو دیوار
جیسی سکونی اور جوردی اشیاء کو بھی شاعر کی آنکھ سیلاب کا خیر مقدم کرتے وقت متحرک
اور رقص کی حالت میں دکھتی ہے۔ چاہے اس حرکت اور رقص کا نتیجہ درو دیوار کا
ابھدام ہی کیوں نہ ہو۔ غائب کا شعر ہے۔

نہ پوچھو کیخودئ ندیش مقدم سیلاب کہ ناچتے ہیں پر لے سر سر در و دیوار
دوسری جگہ کہا ہے کہ عاشق کو اپنے مکان کی برابادی کی پرداہیں، اس کو
فلک ہے تو اس بات کی کہ سیلاب جہ آئے سیلاب سے وہ ایسا مسرور ہوتا ہے جیسے کوئی
جلوترنگ سن رہا ہو۔ (بقیہ سلسلہ تحت مشابہ دیکھو)

اصغر کے شعر ہیں

یہ دیکھتا ہوں ترے زیر لب تبسم کو کہ بحر حسن کی اک موج بے قرار نہ ہو
یا زندگی کو فوجی ہر موج حوادث کی یا موت کا طالب ہوں انفاسِ سجاے
نہ رنگین پہ موجیں ہیں تبسم کے پہنائی کی شعاعیں کیا بڑیں رنکت بڑی آنی گشتا کی
جرم سے توی مستی کی آواہو جانت موج صبا تری ہر لہزش مستانہ بنے

(سبند ص ۱۲۵ حاشیہ ۱)

مقدم سلاب سے دل کیا نسا کا رنگ ہے خاندانِ عاشقِ مگر سازِ صدائے آب تھا
شاعر کو دشتِ فنا میں سراب نظر آتی ہے جو سرابِ فریب ہے اس سراب کا ہرزہ
جو ہر تپ کی طرح تیز اور چمکدار ہوتا ہے۔

موجِ سراب دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال ہرزہ شل جو ہر تیغِ آبدارِ فضا
لفظ موج کی استعمال کی دوسری مثالیں ملاحظہ ہوں :-

ضبطِ گریہ گہرِ آب لایا آخر پائے صد موج بطوفان کدہِ دل باندھا
نا امید نے بہ تقریبِ مضامین خمار کوچہ موج کو خیازہ ساحل باندھا
دھواک بیا بیاں ماندگی سے ذوقِ کمیرا حبابِ موج رفتار ہے نقشِ قدم میرا
روانی لائے موجِ خونِ لعل سے ٹپکتا ہے کہ لطف ہے عجاظا فرقِ قاتل پسند آیا
جست تھی جن سے لیکن اب یہ بدوائی ہے کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا
اند دشتِ پرست گوشہِ تنہائی دل ہے برنگِ موج کے خیازہ ساغر ہے دم میرا
فص موجِ محیط بے خودی ہے تفاعلِ ہائے ساقی کا گلہ کیا
بے خون دل کے چشم میں موجِ گج غبار بہ سیکہ خراب ہے تلے کے سراغ کا
ذوقِ مرشار سے بے پردہ ہے طوفانِ میرا موجِ خیازہ ہے برزمِ نسا باں میرا
موجِ غم سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے آستانِ بار سے اٹھ جائیں کیا
لسانِ اجہر آئینہ از ویرانیِ دل صا غبار کوچہ لائے موج ہے خاشاکِ ساحل میرا
دقیقہ شاعری

جگر کے ہاں ایک موج مئے خانے کو بہا لے جاتی ہے۔ کہتے ہیں
میکشوا! مزدہ کو باقی نہ رہی قیید مکان
آج ایک موج بہا لے گئی میخانے کو

بسمکے جوش گرہ سے زبرد زبرد ویرانہ تھا
دل در رکاب صحر خانہ خراب صحرا
ساقی نے از بھر گریباں چاکی موج باؤ نہاب
مگر وہ شورش ہے طوفان طراز خلق خونریزی
چہر ہوا دفت کہ ہر بال کشا موج شراب
پوچھت وجہ یہ سعی ارباب چمن
جہو اعزہ مئے بخت رسا رکھتا ہے
ہے برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
عام طور پر ہمارے شاعروں کے یہاں میٹھ و طرب سی سکونی حالت سے عبارت ہوتا ہے
جس میں دل کی ساری آرزوئیں پوری ہو جاتیں۔ اس کے برعکس غالب کے یہاں عیش و
طرب کا تصور بھی سکونی نہیں بلکہ حرکتی ہے۔ چنانچہ اس شعر میں اس نے بتایا ہے کہ طوفان
عیش کے گرداب کا اگر تجربہ کریں تو اس میں موج گل، موج شفق، موج صبا اور موج شراب
کے اجڑاؤں گے۔

چار موج اٹھتی ہے طوفان طرب سے ہر سو
جس قدر موج تباہی ہے جگر نشہ ناز
مذہبہ ذلیل طوئل میں رنگ اور موج دولہاں
محکات شعری کو معنوی قوت اور دفعی
سے ایک دوسرے میں سودا گیاں ہر شعر سے مٹی ٹپکتی ہے ایسا عین ہونا کہ نشہ رنگ نے عالم مٹی
کو زندگی کی حرکت میں تبدیل کر دیا ہے۔ موج شراب کبھی تو رنگ تاک میں جان بن کر دوڑی
پھرتی ہے اور کبھی رنگ کے شہ پر نگا کر ہنگامہ دہنی میں بال کشائی کرتی ہے۔ رنگ کی

۱۲۸
جگہ کے کلام میں لفظ موج کی ایمانی محاسبات جا۔ جاد کھائی دیتی ہیں۔
وہی بھی جازا ابد خدا کا نام لے کر لیا بھی جا
بادہ کو خرگاہی بھی اک موج پیمانے میں ہے

دستِ جاسد سے بالِ کنائی یا ازما لطف سے خالی نہیں۔

بسکہ دوڑے ہے رگ تاک میں خوں ہو کر
موج گلی سے چرخاں ہے گزرگاہ خیال
نشہ کے پردہ میں ہے محو تر شاہے دماغ
ایک عالم پر ہے طوفانی کیفیت۔ فصل
شرح ہنگامہ آہنی ہے نہ ہے موسم گل
ہوش اُڑتے ہیں مرے جلوہ گل دیکھ اسد
ثابت ہوا ہے گردن مینا پر خون خلق
ہجوم فکر سے دل تپل موج لرزے ہے
کون آیا جہین بیتاب استقبال ہے
شور جولاں تھا کنار بحر کس کا کہ آج
ہے فردغ ماہ سے ہر موج ایک قصہ خاک
گر بعد مرگ و حشر دل کا گلہ کروں
گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شفی کاروں
پیدا نہیں ہے اہل تگ و تازہ جستجو
بے دامنی جلد جوئے زک تنہائی نہیں
لے گئی ساقی کی نخوت قلم آشاہی مری
اہل بینش کو ہے طوفان حوادث سکت
مبادا بے تکلف فصل کا برگ و تراگم ہو

شہ پر رگ سے ہے بالِ کنائی موج شراب
ہے تصور میں زبں جلوہ ناموج شراب
بسکہ رکھتی ہے سر نشو و نما موج شراب
موج سبزہ فوئیز سے ناموج شراب
ہے تصور میں زبں جلوہ ناموج شراب
پھر ہوا وقت کے ہو بالِ کنائی موج شراب
لرزے ہے موج مئے نری زقار دیکھ کر
کہ شیشہ تارک و صہبائے آہگینہ گزار
جنش موج صبا ہے شوخی زقار باغ
گرد ساحل ہے بزم موج دریا نمک
سیل سے فرش کنان کرتے ہیں تادیران ہم
موج غبار سے پر یک دشت و اکروں
موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں
ماتہ موج آب زمان پریدہ ہوں
ورز کیا موج نفس زنجیر رسوائی نہیں
موج مئے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں
لطف موج کم از سلی استاد نہیں
مگر طوفان مئے میں بجش موج صبا گم ہو

(بقیہ نعت ۱۲۹ پر)

ترے جلوں کو دیکھیں اور سرے دل کی طرف دیکھیں
کہاں ہیں اقبال موج و ساسل دیکھنے والے (چتر)

قبلہ عاشقہ ص ۱۲

نہیں جز در تکیں گویاں بے میدان
بلاگردان تکیں تیان صد موج و گوهر
بے وحشت جنوں کی بہار اس قدر کہ ہے
میکدے میں زبدل افسردہ بادی کشتاں
مہتی فریب نامہ موج مراب ہے
ناتنا پیش تیغ حفا پر تازہ ماہ
دزد و گدشتگی میں خرمی پر حرف ہے
ماں آب دو اند موسم غم میں حرم ہے
کفکش ہائے مہتی سے کرے کیاسی آزادی
غزوہ لطف ساقی نشے بے باکی ستان
جہان ندان سو بیاں دہائے پریشان ہے
ترجیں رکھتی ہے شرم قطرہ سامانی مجھے
ہمارا دیکھنا گرتنگ ہے میر گلستاں کو
چشم خواباں سے فروش نشہ دار تازہ ہے
دیوانچی ہے تجھ کو درس خزام دینا
دو دیاں ہے مجھ کو ساقی لیکن نمسا رانی
یک برگ بے فانی صد دعوت نیتان
روانی موج نے کی گر خط جام آشنا ہوئے
ہے کند موج گل آشفہ قرآنی اسد

کہ موج گریہ میں صد خندہ دندان ناگم جو
غرق بھی جن کے عارض پر بہ بکلیہ جیالگم جو
بال پری بہ شوخی موج صبا غرو
سوج سے شش خط جام ہے بہ ماندہ
یک عمر ناز شوخی عزان اٹھائے
حوسہ دریا نے بیانی میں ہے اک موج خوں بھی
بج غبار سرمہ بھولی ہے صدا مجھے
زنا و گشتہ ہے موج صبا مجھے
ہوئی زنجیر موج آب کہ فرصت وانی کی
غم دامن عصیاں ہے طراوت میں کونز کی
طش شمش جبت یک حلقہ گرداب طوفاں ہے
موج گرداب جیسے چن پشانی مجھے
شماراہ سے موج صبا دامن ٹھپکین ہے
سرمہ گویا موج زرد شعلہ آواز ہے
سوج بہار بیکسر زنجیر نقش پا ہے
تا کہ چہ دادن موج حیارہ آشنا ہے
طوفان نالہ دل تا موج پوریا ہے
کھینے کیفیت اس سطر قلم کی عبارت کی
رنگ بیاں بوجہ سوار تو سن چالاک ہے

ساقی کی فیض مست نگاہی کے میں شمار ایک ایک موج نے کورنگیوں بنا دیا
(جگر)

کیسا قطرہ، کیسا دریا، کس کا طوفان، کس کی موج
نوجو چاہے تو ڈبووے خشکی ساحل مجھے جگر
"موج ہو اے دردِ دل" کی ترکیب اور اس کی صنویت قابلِ داوہے۔
جس طرف وہ شوخ نظریاں اٹھ نکلیں لے اڑی موج ہو اے دردِ دل جگر
بہمد حاضر کے چند دوسرے شاعروں کے اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔
سکونِ خاطر بلبیل ہے اضطرابِ بہار ز موج ہوئے گل اٹھتی نہ آشیاں ہوتا
(فانی)

دریا نے محبت بے ساحل اور ساحل بے دریا بھی ہے۔
جو موج ڈبووے ساحل ہے یوں نام کا ساحل کوئی نہیں
(فانی)

لب دریا سے غرض نہ تہ دریا سے موج و گرداب سے دستِ فگریاں ہونا
(زیکخانہ)

(بندہ حاشیہ ۱۱۹)

بیچا تگی، خودِ حاکم موجِ رم آہو ہا
درسِ نیرنگ ہے کس موجِ نگہ کا یارب
مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے
اس بیاباں میں گرفتار جنوں میں کہ جہاں
لے ہرزہ دہی سنتِ عکین جنوں مہینے
یتابی یادِ دوست ہرنگِ تسلی ہے
چنائے سے ہے سروشا ط بہار ہے
ہے موجِ دنِ اک تلومِ خوں گاش ہی ہو
خودِ نشاط و سرخوشی ہے آمدِ فصلِ بہار
دام نگذافت زنجیرِ پشیمانی
غنیچہ صد آئینہ زانوئے گلستانِ زدہ ہے
موجِ شرابِ یک مرہِ خوابِ ناک ہے
موجِ ریم سے دل پائے بہ بختِ آوے
تا آبدِ محلِ شش موجِ گھر آوے
موجِ تیشِ جنوں محلِ کشِ لیلی ہے
بالِ تدرؤ جلوہ موجِ شراب ہے
آتا ہے ابھی دیکھو کیا کیا مرے آگے
آج ہر سبیلِ رواں عالم میں موجِ بارہ ہے

رخ رنگین یہ موصیٰ ہیں قسم ہائے پند کی
شعاعیں کیا پڑیں زنجت کل آئی گلستان کی
(اصغر)

پرودہ و نقاب :-

نقاب خود رمز و طلسم کی کیفیت پیدا کرنے والی چیز ہے۔ چنانچہ غزل کی رمز نگاری کے لئے یہ لفظ اور اس کے ساتھ جو مفہوم وابستہ ہے وہ خاص ثابت رکھتا ہے۔ اردو غزل گو شاعروں کے دیوان حجاب و نقاب کی مضمون آفرینوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اس مضمون میں معاملہ بندی اور واقعہ گذاری کی جو جزو تہمتیں پیدا کی گئی ہیں وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشری زندگی کا سچا رقعہ اور غلیل نفس کے ماہر کے لئے ایک دلچسپ موضوع ہیں مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ویسے ظاہر کا لطف ہے چھینا کم متا شائبہ میں یہ پردا کچھ

(میر)

نقائے نے بھی کام کیا و آن نقاب کا مستی سے ہر نگہ سے رخ پر بکھر گئی

(غالب)

نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا جوش بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

(غالب)

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے پر کھلا

(غالب)

ایک جگہ غالب اپنے محبوب کو مشورہ دیتے ہیں کہ ہم سے خصوصیت سے منہ

نہ چھپاؤ ورنہ لوگ خواہ مخواہ متوجہ ہوں گے شاعر کا کہنا ہے کہ اگر محبوب بیگوار

بے حجاب رہے تو دوسروں پر محبت کا حال نہیں کھل سکتا حسن طلب کی بلاغت میں

ایمانی اثر آفرینی کی جھلکیاں ملاحظہ کیجئے۔ کہتے ہیں۔

دوستی کا پردہ ہے بے گانگی منہ چھپانا ہم سے جھوڑا چاہیے

دوسری جگہ اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے کہ محبوب میر کے ساتھ بے جانی سے

پیش آتا ہے تاکہ لوگ سمجھیں کہ اس کے ساتھ اسے کوئی خصوصیت نہیں، لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے۔ یہ اظہار رشک کی بڑی لطیف صورت پیدا کی ہے۔
 درپردہ انھیں غیر سے ہے ربط نہانی ظاہر کا پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے اور مثالیں ملاحظہ ہوں۔

شوخ نے تیری لطف نہ رکھا حجاب میں جلوے نے تیرے آگ لگا دی نقاب میں

(شفقت)

اس رونے بے نقاب کا جلوہ ہوا نقاب نکلی ہے رنگ رنگ سے صورت حجاب کی

(داغ)

نگاہ شوق نے کیا خواب میں نہیں دیکھا نیا حجاب ہے چھپتے ہو رو برو ہو کر

(داغ)

درپردہ جوش حسن نے بے پے پردہ کرویا ٹوٹی گرہ رُاق سے بند نقاب کی

(داغ)

داغ کا دعویٰ ہے کہ محبوب چاہے چھپنے کی کتنی کوشش کرے لیکن وہ نہیں چھپ سکتا

اس لئے کہ میری نظریں کون و مکاں کے جلوے سائے ہوئے ہیں۔

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

پاوجود حجاب کے نگہ شوق میں محبوب کا جلوہ موجود رہتا ہے۔ اس شعر میں اثبات

و نفی سے حسن کلام کے جوہر کو خوب چمکایا ہے۔

ان سے جلوہ کہ جہلیں اور نگہ شوق میں ہے ان سے پردہ کہ وہ ہے اور دل حیراں میں نہیں

(داغ)

بے پردہ ہم سے ہو کے وہ کرنے لگے مجاہد حسرت کی آنکھ ہم بھی چھپاتے تو خوب تھا

(جلال)

وہ میں کہ دیکھ رہا ہوں نقاب بن کے تجھے وہ تو کہ چھوڑ دیا ہے نقاب کہ کے مجھے

(وقار امپوری)

پچھے وہ مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا یہی

(حسرت)

وہ بے نقاب ہوئے بھی تو کیا ہو کر ہے ہجوم حسن کے پروئے نقاب کے بدلے

(حسرت)

جمال بے حجاب تھا کہ جلوہ تھا حجاب کا کلیم برق طور تھی کرتا تھا نقاب کا

(فانی)

بہال خود رخ بے پردہ کا نقاب ہوا نئی ادا سے نئی وضع کا حجاب ہوا

(فانی)

نئی شان مجویوں پر بھی سراپا دید ہوں اس کے جلوے کی ادا ایک شان تو رہی بھی

(اصغر)

تھیں خود نمود حسن میں شائیں حجاب کی مجھ کو خبر ہی نہ رہے بے عجاب کی

(اصغر)

عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں رہتی

دور نہ چیز ہی کیا ہے گوستے نقاب ان کا

(بنگر)

اسی سے دل کا ہر اک نقش جلوہ تاب ہوا مری نظر نہ ہوئی آپ کا حجاب ہوا

(جگر)

قفص اور آشیانہ

قفص اور آشیانہ کی بھری علامت میں از نور نزل گو شاعروں نے جدت ادا کا حق ادا

کیا ہے یہ محض جدت ادا اور نہ نیک ہے جس کی وجہ سے فرمودہ مضمون میں بھی

تازگی اور شکستگی آجاتی ہے۔ لفظ اسے معنوی معنی سے زیادہ اہمیت اس بات کو ہے

کہ اس کے ہاتھ لگنے کے ذوق و وجدان میں اس کا کیا سہنوم ہے۔ قفس اور آشیانہ

کے معنوی لحاظ سے کہہ سکتے ہیں۔ ہمارے شاعروں نے کس طرح غلامی طور پر ہوتا ہے۔

جب کوئی ہے بجلی تب جانب گلتاں رکھتی ہے پھر میرے غاشاک آٹیاں سے
(میر)

کیسا کیسا قفس سے سر مارا موسم گل میں ہم رہا نہ ہوئے
(میر)

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے تھوڑے دم گری ہے جس کل بجلی وہ میرا آٹیاں کہوں ہو
(غالب)

کچھ قفس میں ان دزل گتہ ہے جی آٹیاں اپنا ہوا بر باد کیا
(مومن)

خوشا قسمت قفس میں ہم قفس پر سینکڑوں پردے
نظر بھی اب تو جاسکتی نہیں دیوار گلشن تک

(نیم دہوی)

روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں جیسے کبھی آنکھوں سے گلستان نہیں دیکھا
(صفر گوندوی)

سوار جلا ہے قویر سوار بسا ہے ہم سوختہ جافوں کا شیمن بھی جلا ہے
(صفر گوندوی)

چمکیں بڑا کیا جو یہ تینکے جلا دیئے تھا آٹیاں مگر تے پھولوں سے دور تھا
(ثاقب لکھنوی)

باغباں نے آگ دی جب آٹیاں نے کمرے جن پہ تیکہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے
(ثاقب لکھنوی)

برق کے گرنے سے ماتم ایک ہی ہوتا تو خیر آٹیاں کے ساتھ آج آئی ہر جہت پر بھی
(ثاقب لکھنوی)

نایاب دروغ نگہ گرم بھی نہیں بجلی تڑپ رہی ہے مرے آٹیاں سے دو
(طاف)

اس کے سوا نہیں خبر آئیاں مجھے میں تھا اسیر دام تو بجلی جین میں تھی

(قافیہ)

فصل گل جو یاد آئی آئیاں بھی یاد آئیاں فصل گل میں اجڑا تھا شاید آئیاں اپنا

(قافیہ)

ہماری شاعری میں اسی طرح کے بیسیوں علامتی الفاظ ہیں جو باوجود پیش پا افتادہ اور بظاہر فرسودہ ہونے کے حسن استعمال سے ایسا ہی اثر قلبی اور فکری دیتے اندر پوشیدہ رکھتے ہیں۔ دراصل کسی زبان کا کوئی لفظ کبھی پرانا اور فرسودہ نہیں ہوتا۔ نئے لفظ اور نئی بندشیں بیکار ہیں اگر ان میں ایسا ہی اثر آفرینی نہ ہو۔ اور اگر شاعر ایمانی اثر پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ پرانے اور رسمی لفظوں میں نئی جان ڈال دے گا۔ مثلاً چند رسمی لفظ یہ ہیں۔ رہرو اور منتریں، کشتی اور ساحل، شمع اور پروانہ، جلوہ اور تماشا وغیرہ ان کی مثالیں دینے میں بڑی طاقت ہوگی۔ ان سب لفظوں کو ہمارے شاعر دو سو برس سے برت رہے ہیں۔ لیکن آج بھی ہمیں ان میں عجیب و غریب لطف ملتا ہے یہ اعجاز ہے قادر انظاہی کا۔

قادر الکلام شاعر لفظوں کو فحشاء و انداز میں برتتا ہے تو وہ اگر کسی ایسے مضمون کو پیش کرنا چاہتا ہے جسے اس کا کوئی پیشرو پہلے بہت چمکے تو باوجود اس کے وہ اپنی شخصیت کے اثر سے اس میں تازگی اور ندرت پیدا کر دے گا۔ کوئی لفظ اور کوئی مضمون محض پہلے برتے جانے کی وجہ سے فرسودہ نہیں ہو جاتا، اچھا شاعر اپنے نفس گرم سے مضمون اور مردہ لفظوں میں بھی نئی روح پھونک سکتا ہے۔ غزل گو شاعر کے لئے لفظ محض علامتیں ہیں جو ذہن کو حقیقت کی طرف متقل کرتی ہیں۔ تنزل کا یہی طلسم یا اعجاز ہے جو اس صنف سخن کو ہمیشہ باقی رکھے گا۔ اور جو شاعر اس قسّم کا بنیاد و جگہ سکے گا، اسی کو استاد کی کامرانی نصیب ہوگی۔ کوئی مضمون کسی شاعر کی ملکیت نہیں ہو جاتا۔ وہ اسی کا ہو جاتا ہے جو اسکو بھی طرح برت سکے۔ اس باب میں تقدم و تاخر کوئی سمجھ نہیں سکتا۔

اگر کسی شاعر نے کسی مضمون کو پہلے برتا اور دوسرے شاعر نے اسی کو کچھ عرصے بعد
 اخذ کیا اور اپنے پیشرو کے مضمون کے مقابلے میں اس کو زیادہ بلند کر دیا یا اس
 میں کوئی نئی صفت پیدا کر دی تو وہ مضمون اس کا ہو جائیگا۔ نظمیری کا مشہور شعر ہے۔
 ہوسے یار میں ازین سست نہ خامی آید حکم از دست بگریز کہ از کارشدم
 سود آئے تھوڑے سے نقد سے مضمون کے کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔
 کیفیت جیٹم اس کے سمجھے یا بے سودا مگر کومرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں
 موتن خاں کا شعر ہے

نہ جاؤں گا کبھی جنت کو میں نہ جاؤں گا اگر نہ ہوں نہ نقشہ نہایت نکمر کا سا
 غائب نے اسی مضمون کو دوسری طرح سے پیش کیا ہے اور اس کو اور زیادہ بلند کر دیا۔
 کم انیس جلوہ گری میں تے کوچے بہشت وہی نقشہ ہے وے اس قدر آباد نہیں
 سودا کی شعر ہے۔

ساقی ہے یک تبسم گل موسم بہار ظالم بھرے ہے جام تہ جلدی سے بھر نہیں
 غائب نے اسی مضمون میں کیا طرزہ کاری دکھائی ہے۔

عمر بچہ کہ ہے برق حسد ام دل کے خون کرنے کی فرصت ہی ہی
 غائب کا شعر ہے۔

وے از میرا انصاف عشر میں نہ ہو اب تلک تویر توقیے کہ وہاں بجا بیگنا
 ذوق نے اسی مضمون کو زیادہ بلند و بلند انداز میں ادا کیا ہے۔

اب بچہ کہ یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے مر کے بھی چین نہ دیا تو کہ مر جائیں گے
 راجہ بیر تو وہ کہتے ہیں کہ حضور یار میں انسان ہی نہیں غیر جاندار اسٹیا بھی
 محبوب حسن سے متاثر ہوتی ہیں۔

راست بلبس میں تے مسی کے شے کے حضور شے کے نہ یہ ہوتے تو کبھی نور نہ تھا
 دماغ نے اسی مضمون کو اپنی شوخ بیانی سے بڑا بڑا کھلا کر دکھا دیا ہے۔
 روشن روشن کے آگے شمع کھڑوہ کہتے ہیں۔

غالب نے شوقِ پابوسی کے مضمون پر معاملہ بندی کا نہایت اعلیٰ درجہ کا شعر کہا ہے۔
 لے توں سوئے میں اس کے پائوں کا بوسہ مگر ایسی باتوں سے وہ ظالم بہرِ گمان ہو جائیگا
 حسرت نے اسی مضمون کو اور زیادہ نکھار دیا ان کا شعر ملاحظہ ہو۔
 وہ خوابِ نازیں تھے اور نہ تھے شوقِ پابوسی

نہ سبھی پستی ہست تری اس لطیف ایما کو

اگرچہ طرزِ ادا معنوی خصوصیات سے عبارت ہوتا ہے لیکن اس کی تاثیر لفظی ہستمال
 کے بعض مخصوص طریقوں سے پیدا ہوتی ہے۔ دراصل غزل ایک طرح کا طلسم ہے۔
 غزل نگار شاعر اس طلسم کے بھیڑیوں کو جانتا ہے اس کو لفظوں کے ہستمال کے
 ذریعہ ایسی قوتیں مطاقی میں جنھیں دوسرے نہیں سمجھ سکتے شاعرانہ لفظ ان کی
 ذہن کو اس کی جہنموں سے رہا کرتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر اثرِ تاثیر کی کوئی
 ذریعہ نہیں۔ بعض ایسے لفظ ہیں جن سے رمز کی کیفیت کی اثر آفرینی ایک خاص
 صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مثلاً وہ لفظ جن سے رنگ و بو کے محرکات کی تخلیق
 ہوتی ہے اور وہ غزل میں خاص تاثیر پیدا کر لیتے ہیں۔ غزل گو شاعر پر ایسا معلوم
 ہوتا ہے جیسے نشہ کی سی کیفیت طاری نہ ہوتی ہے جس طرح نشہ کی حالت میں رنگ
 اور بو دونوں کی شدت زیادہ محسوس ہوتی ہے وہی طرح داستانِ شوق بیان کرنے
 والے پر ان دونوں محرکات کا اثر دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔

تحلیل معنی کا ماہر اس کی چاہے کچھ بھی توجیہ پیش کرے لیکن توجیہ سے حقیقت کی
 تاثیر و تاثر تو نہیں بدلتے۔ رنگ اور بو دونوں میں بے پناہ ایمانی اور طبعی خاصیت
 باقی باقی ہے جو دراصل اندرونی بہار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اردو کے غزل گو
 شاعروں نے اس لطیف حقیقت کو ہر زمانے میں محسوس کیا۔ جدید شاعروں میں
 حسرت کے یہاں اس محرک شری کی تاثیر کثرت سے ملتی ہیں۔ بعض دوسروں
 کے یہاں بھی یہ احساس ملتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔
 یہ گل ہے گاہ رنگ گے باغ کی ہے بو آتا نہیں لفظِ لفظ ایک طرح
 دوسرے

دیکھ کے دست وپائے نگارین چپے سے رہ جاویں نہ کیوں
منہ بولے ہنر پار و گویا ہندی اس کی رچ سائی ہوئی

(میرا) —————
کیا کوئی اس کے رنگوں گل باغ میں کھلا ہے شور آج بیلوں کا جاتا ہے آسمان تک

(میرا) —————
مشک منبر طبلہ طبلہ کیوں ہو کیا کام ہے ہم : مانع آشفۃ ہین لٹ مغبر کے تری

(میرا) —————
بہکت خوش اس کے پنڈے کی سی آئی ہے مجھے اس سبب گل کو بہن کے دیریں نے ہو کیا

(میرا) —————
گل پیر ہن نہ چاک کریں کیونکہ رشک ہے کس مرتبہ میں شوخ ہے اکی قہار رنگ

(میرا) —————
موتے دلبر سے مشک بوہے نسیم حال خوش اس کے خستہ حالوں کا

(میرا) —————
میر صاحب نے گل کے رنگ و بو دونوں کو دنیا کی ناپائیداری اور اس کی

بے وفائی کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے اور ان سے شعری تحرک کا کام لیا ہے۔
خضر ہے۔ بوئے گل اور رنگ گل دونوں میں دلکش نے نسیم

ایک بقدر یک نگاہ دیکھئے تو وفا نہیں

ایک دوسرے شعویں گل کی بے وفائی کا ذکر کرتے ہوئے اس کی بو

سے اپنی بے خودی کے پیدا ہونے کی توجیہ کی ہے کہ اس سے کسی کی یاد تازہ
ہوتی ہے۔ گویا بو (مقتضائی ذہنی کے لیے ایک وسیلہ کا کام دیتی ہے
خضر ہے۔

سحر پائے گل بے خودی ہم کو آئی کہ اس سست پیاں میں بوتھی کسو کی
اسی مضمون پر مصحفی کا شعر ملاحظہ ہو۔

دیکھا ہے تجھے جلوہ کناں جبے چمن میں ہر گل کا اڑاتی ہے نسیم سحری ہرنگ
جرات کے افسار ہیں۔

کہاں ہے گل میں صفائی تیرے بدن کی سیا بھری سہاگ کی تسبیح بوداہن کی سی

بو محبت کی نسیم آہ سے کھلتی ہے وہا گر چہ سو پردوں میں غنچہ چھپا لجا بیٹے

سنگما بدن کو کہا کس منہ سے چتون میں رבודگی یہ کسی عطر کی بھی دیں نہیں

مک لگ گیا نکلے سے جو وہ گل قواب مجھے جوں بوئے گل کے بے زخود رفتہ بو مجھے

جعفر علی حسرت کا شعر ہے

بہار ہو چکی اور شور و ملبوں کا گیا مرے دماغ سے اس گل کی ہائے بوز گئی

غائب کے خیال میں پھول رنگ کے نشہ سے مست ہو کر اپنی بند قبا حسینوں کی
طرح کھول دیتا ہے۔ حسن ثقیل لا جواب ہے۔

نشہ رنگ سے چمے واشد گل مست کب بند قبا باندھتے ہیں
غائب کے اسی مضمون پر دوسرے شعر ملاحظہ ہوں۔
میں نے جنوں میں کی جو اسد التماس رنگ خون جگر میں ایک ہی غوطہ دیا مجھے

شاعر کو اندیشہ ہے کہ کہیں رنگ کی گرمی چمن کی تباہی کا موجب نہ بن جائے
سایہ گل میں اسے داغ اور نہکت گل میں موج درد نظر آتی ہے۔ رنگ
بو کے دونوں محرکات شعری کو اس شعر میں ایک ہی جگہ جمع کر دیا ہے۔

سایہ گل داغ وجوش نہکت گل موج درد
رنگ کی گرمی ہے تاراج جن کی فکر میں
(نسخہ حمید)

نظر کا شر ہے
شمیر برہنہ مانگ غضب بالوں کی چمک پھر ویسی ہی
جوڑے کی گنہ حادث قہر خدا بالوں کی ہبک پھر ویسی ہی

رنگ۔ بتا بلو بہ غالب رنگ کے شعری محرک سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ یہ بات اس کے دو مخصوص رجحانوں کی آئینہ دار ہے۔ ایک تو اس کے احساس و ذہن کی لطافت اور دوسرے اس کا رنگی کاحر کی نقطہ نظر۔ رنگ میں یہ نسبت بوزیادہ لطافت ہے۔ رنگ کا احساس روشنی کی موجوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ گویا ہماری نظر کو کسی مادی تو سٹ کا بہار انہیں مینا پڑتا ہے۔ غلاف اس کے بویں مادہ کے ذرات فضا کے ذریعہ ہم تک پہنچتے ہیں۔ چرخہ رنگ امواج کے توسط سے ہماری نظر تک پہنچتا ہے اس لئے وہ سراسر حرکت ہے اور بونکی طرح اس میں مادیت مطلق نہیں فطرت میں ہر طرف رنگ ہی رنگ ہے۔ اگر کائنات کو صرف عالم رنگ کہیں تو بجا نہ ہوگا۔

اس پر تعجب نہیں کہ رنگ کی طلسماتی و لفری نے غالب کو متاثر کیا۔ اس کے دیوان میں ایسے شعر کثرت سے ہیں جن میں شعری محرک متا ہے جو اس کی لطافت طبع پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن یہ اشعار زیادہ تر بیدل کے رنگ میں ہیں۔

شرر فرصت ننگ سا مان یک عالم چراغاں ہے
پوچھت رسوائی انداز استغنائے حسن
دیرنگ اے ناقوانی ورنہ ہم نا آشتیاں نے
زبس آتش نے فصل رنگ میں رنگ دو گر یا یا
نفاقانی ہے تماشا فی عمر رفتہ
بقدر رنگ یاں گردش میں ہے پیانہ مصل کا
دست مرہون حار خساہ رہیں غارہ نقا
جلد رنگ میں بانہ سا تھا جہد استوار ایسا
چراغ اگل سے دھو بیٹھے ہے چین میں شمع زانیا
رنگ نے آئینہ آنگوں کے تماشا بنا لیا

رند کہتا ہے :-

خال عارض ہنگامں عنبر اشہب کا ہوا سونچھ کر زلف کی بوشک ختن یاد آیا
ذکی مراد آبادی کا شعر ہے :-

عشق ہے رنگ خاک کو یکس غبی سے بوسہ لینا ہے تیرے ہاتھ کی زیبائی کا
حرک ہو کا مضمون تیسرے لکھنوی کے یہاں ملاحظہ ہو۔

چارہ گر سودا ہے لئے زلف برہم کا مجھے قید کر زنجیر موج نہکت برباد میں

بیلہ حافیہ ص ۱۲۱

دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا
جنون برق نشتر ہے رگ ابر ہساری کا
یہ وقت ہے شگفتن گہائے ناز کا
صید زدام جتہ ہے اس دام گاہ کا
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستان ہوتا
آج رنگ رفتہ دور گردش ساغر ہوا
خون آوینہ سے رنگیں ہے دستان میرا
خم رنگ سیاہ از حلقہ ہائے چشم آہو تھا
رنگ روئے شمع برق خرمن پرواز تھا
رنگ شب وندی دو در چراغ خانہ تھا
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہوا دروں کا
یہ زلف یار کا افسانہ ناقص ہوا
اڑے رنگ گل اور آئینہ دیوار ہو ایسا
ہے شکست رنگ گل آئینہ پرواز نقاب
رنگ گل آتش کہ ہے زیر بال عذاب
(بقیہ ص ۱۲۲)

خائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
بہار رنگ خون گل سے سالن اشک باری کا
رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
بزم قدح سے عیش قنارہ رکھ کر رنگ
لے گئے خاک میں ہم داغ تنائے نشاط
نشیں گم کردہ راہ آیا ہست قنہ خو
عیش بازی کدہ حسرت جاوید رسا
غم مجنوں غوا داران لیلی کا پریش گر
رات دن گرم خیال جلوہ جانانہ تھا
وصل میں نجات رسانے سنبلتاں گل کیا
پھر وہ سوئے چن آتا ہے خدا خیر کرے
شکست رنگ کی لائی سحر شب سبیل
حرک باغ میں وہ حیرت گزار ہویدا
بسکہ شرم عارض رنگیں سے حیرت جلوہ ہے
ہے بہار ان میں خزاں پر در خیال عذاب

برق نے رنگ و بو کے مضمون کو اس طرح پیش کیا ہے۔

ہنکت زلف سے اسے یہی مہر میں دماغ
دم عینی ہیں مجھے یاد صبا کے جھونکے

بندہ حیات ص ۱۴۲

حیرت حسن چمن پیرا سے تیرے رنگ گل
عمریری ہو گئی صرف بہار حسن یار
ہر غنچہ و گل صورت یک قطرہ خون ہے
مازلطف عشق باوصف توانائی عبت
گل صبح و لیلی غزل پوری کی پوری رنگ و بو کے محکات کے تحت لکھی گئی ہے لیکن بوسے زیادہ
رنگ کا محرک غالب ہے رنگ کے ساتھ گل اور صبح کی تازگی بھی معنی غزل کی حیثیت رکھتی ہے۔
ہیں رقیبان ہم دست و گریبان گل و صبح
جامہ زیبوں کے سدا ہیں دوامان گل و صبح
بسکہ ہیں بخود و وارفتہ و حیران گل و صبح
غفلت آرامی یاران پر ہیں خندان گل و صبح
چوتا ہے ورنہ شعلہ رنگ خالہ مند
شعب و گل تانکے و پروانہ و بلبل تا چند
برا انداز خواہے رونق دست خیار آتش
بسکہ سے وہ قبلہ آئینہ محو احتساح
بے دم سر و صبا سے گرمی بازار باغ
خوں کے مری نگاہ میں رنگ لائے گل
اے لائے نالہ لب خونین لوائے گل
ہے چمن سدا یا بایدن صدر رنگ دل
اب طائر پریدہ رنگ حسا کہوں
(بقیہ دیکھو ص ۱۴۳)

دھوئے عشق بیتاں سے بگشتان گل و صبح
ساق گل رنگ سے اور آئینہ زانو سے
وصل آئینہ زخان صحن چستان یکسر
زندگانی نہیں بیش از نفس چند اسد
موقوف کیجئے یہ بکلف تنگاریاں
بزم دایح طرب و باغ کشادہ پر رنگ
ہوئی ہے بسکہ صرف مشق تمکین بہار آتش
جوں پر طاؤس جو ہر تحتہ مشق رنگ ہے
آتش رنگ رخ ہر گل کو بجھتے ہے فروغ
سلوت سے تیرے جدا حسن غبور کی
جو قسا و موج رنگ کے دھوکے میں مر گیا
گرچہ ہے یک بیضہ طاؤس آسا تنگ دل
معتدل و متصل ہاتھ نہ آیا مگر اسے

ماتا ہے بوئے گل سے نشان بوئے یار کا نقشہ ہے بوئے گل میں گل بوئے یار کا
 مہج نیم سے نہ پریشان ہو کیوں دماغ دیوانہ ہوں میں نہکت گمبوسے یار کا
 (برق)

بلکہ حاشیہ ۱۴۲
 کس جرم سے ہے چشم تجھے نہ قبول برگ حنا گر مرہ خون نشان نہیں
 اس شعر میں رنگ اور بودوں کے معنوی حرکات کو بڑی خوبی سے سمایا ہے۔
 نہکت گل کو موج درد کا تشبیہ سے ظاہر کرنا اور رنگ میں گری مٹوس کرنا غالب
 ہی کا حصہ ہے۔

سایہ گل داغ و جوش نہکت گل موج درد رنگ کی گری ہے تاراج ہیں کی فکر میں
 خیال سادگی ہائے تصور نقش حیرت ہے پر عقاب رنگ رفتہ سے کھینچی ہیں تصویریں
 ضعف سے اسے گریہ کچھ باقی مے تن میں نہیں رنگ ہو کر اڑ گیا جو خون کد اُن میں نہیں
 اٹھاوے کب وہ جان شرم تہمت تلخ غن کی کہ جس کے ہاتھ میں ماند خوں رنگ خانم ہو
 رہن خاموشی میں ہے آرائش بزم وصال ہے پر پرواز رنگ رفتہ خوں گفٹ لگو
 رنگ طرب ہے صورت عہد و فگارو تھا کس قدر شکستہ کہ ہے جا بجا گرو
 عرض بساط انجن رنگ مفت ہے موج بہار رکھتی ہے اک بوریا گرو
 برق آبشار صفت رنگ دیدہ ہوں جوں غل شمع ریشہ میں نشود نما گرو
 یقیناً سیر دل ہے سر ناخن نگار یاں لعل ہے بہ آتش رنگ خانگرو
 چنانچہ ہے یہ سیلی خارائے لالہ رنگ غافل کو میرے شیشہ پر ملے کا گمان ہے
 دامن رنگ ہایہ پردہ تدبیر میں ہنوز یاں شعلہ چراغ ہے برگ حشا بکھے
 میں نے جنوں میں کی جو اسد اتھاس نگ خون جگر میں ایک ہی غوطہ دیا مجھے
 ہے رنگ لالہ و گل و سرین جدا جدا ہر رنگ میں بہار کا اشاعت چاہئے
 وقت آرام غش ہستی ہے بحران عدم ہے شکستہ رنگ ایک سال گرد غشی پہلو تجھے
 قص غاہری رنگ کمال طبع نہیں ہے کہ بہر مدحائے دل زبان لالی تداں ہے
 (بقیہ کچھ وقت صرف)

مٹی سرشت پاک میں یہ کس چین کی ہے پھولوں میں بر تمام تمہارے بدن کی ہے

رنگ اس شمع کا شرمی سے چوڑا پڑتا ہے پاؤں جس خاک پر رکھتا ہے خواہتی ہے

بسم اللہ حامیہ ص ۱۴۳

تصور بہر تکین طعین ہائے طفل دل
غضب شرم آفرین ہے رنگِ زری ہائے خود بینی
صبح ناپیدائے کلفت خانہ اودبار میں
نشہ ہاشاداب رنگ و ساز ہاست غرب
تا کجا اے آگہی رنگ تماشا باضن
یاور کھلے ناز ہائے التفات اولیں
حیرت طعین ہا خون بہائے دیدن ہا
تماشا ہے کہ ناموس دفا رسوائے آئیں ہے
سودائی خیال ہے طوفان رنگ و بو
چمن زار تما ہونکئی صرف خزاں لیکن
خدا یا خوں ہورنگ امتیاز اور نالہ موزوں
صبح دم وہ جلوہ ریز بے نقاب ہوا گر
شفیٰ بدعوئے عاشق گواہ رنگیں ہے
کرے ہے بادہ ترے لیے کب رنگِ نزع
شرم طوفان خزاں رنگِ طرب گاہ بہار
بہارِ نالہ اور زنجیں فغاں کی ترکیب اور مستعار
خزائے چھپا دیے ہیں۔

طلوت آخر آجیسا دی اثر یک سو
درو آئینہ کیفیت کند رنگ ہے یارت
دوست جانان کہ شیاں گم کردہ آتی ہے
بہارِ نالہ و زنجیں فغاں تیرے
خیالِ زہ طرب ساء زخم جگر آت
تماشا ہے کہ رنگِ دھڑ پر گردنی جانے

بڑھ گیا اور جنوں بوجھنہاری آئی بن کے زنجیر بلا بایہ بہاری آئی

مکن نہیں کہ رنگ جیسے آفتاب کا رنگ بہار عارضِ زیبا کے سامنے

داغ کے اشعار ہیں :-

کیا صبا کو چہ دلداری قاتی ہے مجھ کو اپنے دل گم گشتہ کی بواقی ہے

غور کیوں نہ ہو جب دل ہی چیز ہاتھ لگے بڑا داغ تری زلف مشک بونے کیا

اس کی گلی سے آئے کیوں نہ بھٹ لائے کیوں

مجھ کو صبا سے ہے امید مجھ سے صبا کو کیا غرض

جہاں نے بھی اسی مضمون کے شعر کہے ہیں -

زلف یار کا تصور جنوں شوق کیسے لئے کس طرح سامان بہار ہیا کرتا ہے -
بعد مدت اسے جنوں تیر ہی بہار آنے کو بھتی ہوش تھے جانے کو بونے زلف یار کی بونوئی
جہاں نے ایک جگہ بوجھنہاری کی حیثیت سے بڑی خوبی سے برتا ہے -
تحلیل فنی کے قائل مکن ہے اس سے جتنی طلب و تکمیل کی توجیہ کریں - لیکن اگر
ایسا ہے تو یہی شعر کی اعلیٰ شریعت کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھ جاتی ہے - وہ کہتا ہے :-

اے امامِ فزل حاتمیشادی کے اشعار میں بھی بوجھنہاری کوک جابر جاتا ہے - بھٹ زلف کے
متعلق سان انیب سے سینے -

صبا تو نکلت آن زلف مشکبوداری صبا دگار چانی کہ بونے او داری

زمانہ نہ رہد مشکِ شبنم دہر بر باد فدائے تو کو خط و خال مشکبوداری

بوجھنہاری زلف درختی سے بھٹی آئند صبا پہ غامیہ سائی و گل پر جلوہ گری

وحشی وہ ہیں کہ ہم کو لگا لانی بوئے گل پوچھی بہار میں نہ کسی سے چین کی راہ
ایکے دوسرے شعر میں گل نودایغ عشق میں رنگ و بو کے خاک کو اس طرح
نحوہ سے کیا ہے۔

کیا چھل ہے جلال گل دایغ عشق بھی کہہ سکی بوئے مست ہوں کہ غش ہوں نگ پر
دوسری جگہ کہتے ہیں۔

ترے وعدوں نے بدلتے چھوٹے بے اعتباری کی
بھی اگلے وفا پھرے، کبھی رنگ خاک پھرے

باد صبا کی بد دماغی کی شکایت ملاحظہ طلب ہے۔
گئی تھی کہہ کے میں ماتی ہوں لہر یار کی، پھر تیرا دصبا کا دماغ بھی نہ ملا

حسرت نے رنگ و بو کے رمزی اور حاضراتی اثر (ان و دیکشن) کو جس خوبی سے
اپنے مانتھانہ کلام میں استعمال کیا ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ رنگ
دیا، خوشبوئے حیا، خوشبوئے حسن، خوشبوئے آرزو، بوئے وفا اور خوشبوئے
دہری کے استعاروں اور رمزی علامتوں میں بلا کی ایمانی قوت ہے جس سے
حسرت نے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

حسرت کے ہاں خیال یار میں بھی رنگ و بوئے یار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو
عشق شیریں کار کا کرشمہ ہے۔
خیال یار میں بھی رنگ و بوئے یار پیدا ہے یہ رنگس مایہ رائے عشق شیریں کار پیدا ہے

۱۔ میر صاحب کو بھی باد صبا کی بد دماغی کی شکایت ہے فرماتے ہیں۔
لگ نکلی ہے کسو کی ٹگر بکھری زلف سے آنے میں باد صبح کو یاں اک دماغ ہے
شاید اس زلف سے لگی ہے میر باؤ سے اک دماغ نکلے ہے

۱۳۷
اب رنگ دلو کے استعاروں کی رنگا رنگی ملاحظہ کیجئے۔

جاں فزا تھی نس قدر یارب ہوائے کوئے دوست
بس گئی جس سے مشام آرزو میں بونے دوست
خوچکی اب ہم گرفتاراں فرقت کو نصیب
آہ وہ خوشبر کہ تھی پروردہ گیونے دوست

اس پوری غزل میں بونے کے شعری محکمہ کی لطیف موجود ہیں۔
جس نے سوچھی ہو تری زلف سینہ کار کی بونے
آج تک جس سے مسطر پہ محبت کا مشام
بے پناہ محبت کے دیتی ہے بے پناہ
ہوئے انگریز جتنا ہے لب یار کا رنگ
دلہ ہی سے بھی آری رچ کے ہے کچھ وزدن
کیا پسند آئے اسے تافہ آتا ہر کی بونے
آہ کیا چیز تھی وہ پیر ہن یار کی بونے
سے رستہ کو ترے ساغر شرار کی بونے
روشنی بخش نظر ہے سے گلزار کی بونے
دلنوازی میں ترے نامہ دلدار کی بونے

بحر ساقی میں رعایت ہے کہ لب بونے پروردہ
بونے سے وجہ غم یادہ کشاں بھری ہے

لہر زور ہے دل حسرت زہے نصیب
اک حسن مشک فام کے شوق تمام کا

آشنا ہو کے بونے یار سے ہم
سخت بینرا ہیں قرار سے ہم

میں اُس طرہ زلف مشکیں کو حسرت
پئے غارت جان دو تا چاہتا ہوں

گیونے دوست کی خوشبو ہے دو عالم کی
آہ وہ بھکت برباد کہ برباد نہیں

رونق پیرہن ہوئی خوبی جسم نازین اور بھی شونخ ہو گیا رنگ۔ تے لباس کا

رنگ سونے میں چمکتا ہے طہ جادری کا خرقہ عالم بہ ترے حسن کی بیداری کا

یاد شہرہ کوئے یار آسنے لگی آرزو کو بوسے یار آسنے لگی
شوق محو رہو ہوئے ہوئے لگا نہمت گیسوئے یار آسنے لگا

ہیرہن کوئی آرا نہ انھوں نے مستتر وہا کہ خوشبوئے محبت ہم آغوش نہ تھا

ہے بوئے شوق سے جو معطر مشام بہا ارمان نہیں ہوئے جنان کی شیم کا

خوشبو ترے بوس کی لافنی ہے کہاں ہے تجھ تک نہ ہوا تھا جو گزر باد صبا کا

سو گھی مٹی جو ایک بار وہ خوشبوئے گریبا اب تک یہ اسی بوئے گریباں کا نشا ہے

کیا کیجھے ریاں اس تن نازک کی حقیقت خوشبو میں ہے کل بو تو لطافت میں شائبہ رنگ

پائی ہے جگہ پاکئی دامن نظم میں خوشبوئے حیا نے تری چادر سے کل کر

ایک بار پس گیا جو کس ان کی باسو میں خوشبوئے حسن برسوں ہی اس لباس میں

رفہ رفہ مٹ رہی ہے صرصر بیداوے رنگ ہیں بوئے وفا میں نہکت برباد کے
خوشبوئے حیا کے علاوہ رنگ حیا کا مضمون اس طبع باندھا ہے۔

غزوة دل فریب کو اور بھی جان نثار بنا

بیکر ناز حسن پر رنگ حیا زیاد کر (احسرت)

دوسری جگہ یوں کہا ہے۔

آنکھیں تری جو ہوش ربائی میں نہ رہیں
ان میں سجدہ کاری رنگ جاہے کیسا (حسرت)

خوشبوئے دلبری کی ترکیب واسطہ طلب ہے۔

محتاج ہونے عطارد خدا جہنم خوب یار خوشبوئے دلبری بخجی جو اس پیر میں نہیں تھی

محبوبی نہ رنگینی ہیں جزو بدن تیری مہر شاد محبت ہے خوشبوئے دین تیری

پیرا میں ان کہ ہے سادہ رنگین یا نکس جسے یہ سستہ پیشہ گفائی

کیا کیا مرئی کو آتی ہے خوشبوئے آئندہ آنکھیں جہاں اپنی سطر میں انکی درایہ ہم

کھول کر ال جو رہتے ہیں شب کو حشر کھڑے ہیں انہیں راغبت محبت کیا خوب

تم نے بال اپنے جو چھوڑیں میں بسا کیوں شوق کو اور بھی دیوانہ بنا کھاسب

بص میں برسے جسم یار کو آج شوق سے پردہ تہا نہ رہے

مشک عنبریں یہ تفریق کے سامان کہاں پیر میں ان سبھی کچھ بڑھ کے ہے خوشبو تیرا

دامن حسن ترا خون شہادت نے مے عطر خوشبوئے محبت میں بسا کر دیکھا

یہی لانی ہے اڑا کر ترے بلوں کی بو بے خودی ہائے تنہا کی صبا ہے باعث

صرت بے بھاتی ہے پریشانی دل بھی آئی ہے جو اس گیسو دیر کے بھل کر

تو ریب بیشک ترے بے بس راہ کی بو نسیم ہائے جودنی کو شکر کرے

رنگ و بو کے ہر کائنات نامزدی ہر شاعر و شاعرین کی زبانوں میں جیتے ہیں۔ اس
 میں شہرہ میں کہ اور غرضی ہر خیال کی جو دنیا میں آگے اور آگے نکلا آتا ہے وہ
 بہت کچھ ہے۔ یہی شاعر کی کہ اس سے کہے۔ اپنی اپنی کسی چیز کی تعریف کا کمال ظاہر
 کرنے کے لئے رنگ و بو کے لفظ استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ قرطوبی نے اپنی فنون
 لفظوں کو اس میں بیان کیا ہے وہ آج کی قریب ان نادر کتبوں میں ہے۔

طرح بیان کرتا ہے۔
 کہ شہر ایران ہوا و تر و تازہ سیاہی ہواں گونہ یار رنگ و بو کے
 رنگین و آبی اور رنگین۔ یہانی و غیرہ کی ترکیبیں بھی اردو میں فارسی سے آئیں۔
 ان کے علاوہ رنگ و بو کے ساتھ اور دوسرے لفظ واداد سے اردو میں استعمال
 ہونے لگے۔ لیکن سب میں خوبی اور کمال کا یہ ملو جو رہا۔

شیخ سعدی نے بونے شغری حرکت کو انصافی غرض کے لئے اپنی اس
 تعلیم سکایت میں استعمال کیا ہے جو قیاس و الیگری کے انداز میں انھیں
 دست محبوب سے بوجہ جودار منی ملی اور اس نے ان سے جو گفتگو کی وہ
 ان لفظوں میں تھی جو بلاغت کی جان ہیں۔

مجھے خوشبوئے در حجام روئے
 فتاد از دست محبوبے بد ستم
 بد و گفتم کہ مشکلی یا عیری
 کہ از بوئے دل آویزے تو ستم
 بگفتا من آگے ناچینہ بودم
 ولیکن مدتے با گل شستم

جمال ہنشیں درمن اثر کرد وگر نہ من ہمہ خاکم کہ ہستم

۔ رنگہ دیوئے شعری حرکات کی مثالیں سعدی، حافظ اور دوسرے
استاذہ کے کلام میں موجود ہیں۔ لیکن غالباً اتنی کثرت سے نہیں جتنی اردو میں ملتا ہے۔
مکمل ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ ایران کے مقلدین میں ہندوستان گرم ملک ہے
یہاں کے باشندوں کو ان حرکات کا احساس جتنی شدت سے ہوتا ہے وہ ہمسایہ
تہذیبوں کے لوگوں کو نہیں ہوتا۔ لیکن اس احساس کی شدت کسے لئے
صرف گرم آب و ہوا کافی نہیں۔ اس کے ساتھ شعری ذوق و امتیاز کی صلاحیت
بھی ضروری ہے جو ہندوستان میں اہل ہند کی خصوصیت رہی ہے۔ سنسکرت اور
ہندی شاعری میں اور سندھوستان کے ان شاعروں کے ذہن تخیلوں نے فارسی میں
شہر کیا اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ غنی کشمیر نے تو کہا ہے کہ محبوب کا رُباب
خامیری فکر نگاہیں کے لئے محرک ہوتا ہے۔

جوہ حسن تو آورد مرا بستر فکر تو خا بستی دین سنی رنگین بستم
اردو کے شاعروں کے کلام سے چند اور مثالیں ملاحظہ طلب ہیں۔

ہم بے دوست تجھ کو گھٹائیں شیفہ محشم طرہ بندہ قشاں نہ ہو
(شیفہ)

بے گلہ ہی ہے تو یار کی بیکہ بدلے اس تری چھیر کو ہم باد صبا جانتے ہیں
(مجموع)

کیا جن میں ہے گئی بوئے گریباں اسکی
آج غنچہ کوئی کھلتا جو گلستان میں نہیں (مجموع)

لا کے اس کی شمیم عطر آگئیں مجھ کو ترپا دیا صبا تو نے
(مجموع)

وہ نو نہال خوبی نازک ہے دل ربا ہے عالم ہے اس کی بویں گل کی تخیم کا سا
(زخمی بوی)

کاکل جان فزاک بوسونگھ چکی ہے لے صبا کچھ تو سمجھ کے نوکر کر معبر و مشک و عود کا
(شاہ عظیم آبادی)

طرہ گیسوے جانان باتری بخت کی قسم میں نے دیکھا تھا مگر مشک ختن یا وہ نہیں
(ہم قہ لکھنوی)

جذب شبیم زلف ہے داندہ و ام سے سوا سینکڑوں دل کھینچ آئے ہیں گیسوے شکبار میں
(شہنشاہ لکھنوی)

مرے لہو سے اگر جو کے سر خر و آئے ملو تو برگ حایں وفا کی بو آئے
(شاہ قہ لکھنوی)

اوپر کے شعر میں خیال اکل چھوٹا ہے کہ حاسے بچا ہے رنگ دفا کے بوئے وفا پیدا ہوگی
معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے نزدیک بو متبادل رنگ زیادہ قوی حرکت شعری ہے مثلاً عروا
اشا بھی لطف سے خالی نہیں کہ عوا میں رنگ ہی نہیں ہوتا بلکہ بھی ہوتی ہے جس کی لہو میں روح

سستی اپنی تسکین کا سامان بہم پہنچاتی ہے - زحمت تو بھول کی ہے مگر وفا کی ہے جلیل
دل ہے عجیب گل چمن روزگار میں

محب ادا سے چمن میں بہار آتی ہے کھلی کلی سے سمجھ بٹے پار آتی ہے
(جلیل)

سرتے میں کھل گئی ہے جو وہ زلف شکوہ کیا کیا غار ہا ہوں نسیم حسد کو میں
(جلیل)

چمن کے بھول بھی تھے ہی خوشی میں نکلے کسی میں رنگ ہے تیرا کسی میں بوتیری
(جلیل)

مرزا لگانہ کے اس شعر میں رنگ تماشا اور بوئے تنہا کی ترکیبیں ایسا ہی تازگی
سے لبریز ہیں -

جہاں ہیں نظر والے، بیتاب ہیں دل والے
کچھ رنگ تماشا سے، کچھ بوئے منت سے

یگانہ کے اور شہر ملاحظہ ہوں :-
حریم ناز میں کبتاک گھٹے ٹکی بوئے پیر میں ہوائے شوق میں لازم ہے اک نثر شوق

یا آئی بوئے پیر میں بارِ ناصحا پنا و مانع اب کسی قابل نہیں رہا

بوئے یوسف خود دلیل منزل مقصود ہے جذب صادق غائبانہ رونما ہو جائیگا

بچہ نکمت آوارہ کن نازک دماغوں میں مبارک ہستی برباد پر مفرد ہو جانا

کیوں نکمت آوارہ جاے سے نہ ہو باہر کس دن کو وفا کرتی پیرا میں رسوا سے

جگو کے کلام میں رنگ و بو کے محرکات ملاحظہ ہوں
ہائے یہ حزن تصور کا فریب رنگ و بو میں یہ سمجھا جیسے دو بیان بہار ہی گیا

جا بھی اے ناصح نادان نہ کر اس کچھ بنام ان جفاؤں سے تو خوشبرے وفا آتی ہے

خوام رنگیں، نظام رنگیں، کلام رنگیں، پیام رنگیں
قدم قدم پر روش روش پرستے نئے گل کھلا رہے ہیں
شباب رنگیں جاں رنگیں وہ سرے پانک تمام رنگیں
تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں تمام رنگیں بنا رہے ہیں

اصغر کے اشعار ملاحظہ ہوں :

لے دل شوق و حیلہ جو زیرِ نگین رنگ و بو طائرِ قدس کو بھی لے دام گرجا میں

فریبِ دام گرجا رنگ و بو مسافرِ اشد یہ اہتمام ہے اور ایک شت پر کے لئے

تھکی ہوئے دوست کو قہقہہ تھیم کر کے ہاتھ یہ اور لے اتری مرحلے مشیتِ غبار کو

مورچہ نیم صبح کے قربان جا بیٹھے آئی ہے بوسے زلفِ مہنر نے ہوئے

جلوئے رنگین اتر آیا نکلا شوق میں ہم لطافتِ جسم کی نسیم تن و کھانکے

مٹی جاتی تھی بلبلِ جلوئے گلابِ رنگین پر چھپا کر کس نے ان پردوں میں قیاسِ کھدی

شعرِ غزل میں حسنِ ادا کا انحصار لفظوں کے خاص استعمال پر ہوتا ہے۔ مثلاً بعض اوقات واحد کے بجائے جمع کا صیغہ لانے سے حسنِ ادا کو چار چاند لگ جاتے ہیں مولانا حسرت موہانی نے اپنے رسالہ ”نجاتِ سخن“ میں جمع کے استعمال کو محاسنِ سخن میں شمار کیا ہے (صفحہ ۱۶۲)۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں بتلایا کہ ایسا کیوں ہے ؟ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل کے لئے رمزی اور ابہامی کیفیت ضروری ہے۔ صیغہ واحد کے استعمال سے تغیر اور تعین کی صورت پیدا ہوتی ہے اور خیال ہو سکتا ہے کہ شاعر نفس واقعہ کو بیان کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اس کے پیش نظر لفظوں کے معمولی معنی کے بجائے اشتباہ کا رمزی اور ایمائی اثر ہوتا ہے صیغہ جمع سے چونکہ یہ مقصد بہتر طور پر حاصل ہوتا ہے اس لئے اس سے کام کی تاثیر اور حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ خود حسرت کی غزلیں ملاحظہ کیجئے۔۔۔ جمع کے حسن

استعمال نے ان کو کس قدر بلند کر دیا ہے۔
 غمخواریوں سے یاریاں نہ تھیں
 دل کی بے اختیاریاں نہ تھیں
 عقل صبر آزما سے کچھ نہ ہوا
 شوق کی بے قراریاں نہ تھیں
 تھے جو ہر رنگ ناز ان کے ستم
 دل کی امید داریاں نہ تھیں
 حسن جب تک رہا لطف رہا خوش
 صبر کا سہو مساریاں نہ تھیں

جنم پہ بھی مثل غیر میں کیوں مہربانیاں
 اے بد بختان یہ خوب نہیں بد گانیاں
 ہر رنگ سے بے نیاز رہا، نگاہ زان خون ہنر
 باقی ہیں شوق، یاد کی نہ پتہ نشانیاں

خاک و چھپرہ کو رہا بے نیاز پا سگئے
 گم رہا سے سرخ خیال کی جأت نہ ہو سکی

نہ سہ سے چشم یار کی فوجی کہ خو و بخود
 رنگینوں میں ڈوب گیا ہر بن تمام
 فشو و نماک سبز و گل سے بہا رہا
 نہاد ایدوں نے پھیر لیا ہے چمن مقام

میرزا بہرہ یار شوق جأت از رکھیں گی
 میرا شوق تہم ظالم خیال امتحان تک ہے

رنگینوں کی جان ہے وہ بائے نازین
 اپنی نگاہ شوق جہاں سر کے بل گئی

۴۔ جمع کا حسن استعمال ہر دور کے شاعروں کے یہاں ملتا ہے۔ قدما میں خاص طور پر

میر صاحب کے کلام میں اس کی کثرت سے مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً

جب تک ملے جلے سی جفائیں بھٹیں اٹھ سکیں

کرنے لگے ہوا تو ستم گاریاں بہت

یہ بے قراریاں دیکھو ان نے دیکھ لیا جان کا میاں باری بہت سہل جانیاں

نہ بھائی ہماری تو قدرت نہ ہمیں کھینچیں تیرے تجھ سے ہی یہ خواریاں

کھینچتا ہے دلوں کو صدمہ کچھ ہے مزا جوں میں اپنے سوز کچھ

جھانپیں دیکھ لیا ہے وفا نیاں دیکھیں بھٹکا ہوا کو تری سب باتیاں دیکھیں

یارِ اودھدوں کی راتیں آئیاں طالبوں نے بیچ کر دکھائیاں
پاس مجھ کو بھی نہیں ہے میر آسودہ دور پہ پہنچی ہیں مری رسوائیاں

دیکھیں تو تیری کہ بات کس پرچہ دیکھیں اب ہم نے بھی کس سے آنکھیں لٹایاں

مومن کے اشعار ملاحظہ ہوں :-

لکھ نہ زلف سے جو پریشانیوں میں ہسم

کرتے ہیں اس پہ ناز ادا دانیوں میں ہم

ثابت ہے جرم شکوہ نہ ظاہر گنہ رشک

حیراں ہیں آپ اپنی پیشانیوں میں ہم

مارے خوشی کے مرتکب صبح شب قصداً

کتنے بک ہوئے ہیں گراں جانیوں میں ہم

نسیم دہلوی کا شعر ہے :-

نسیم غفلت کی چل رہی ہے اس قدر ہی ہیں قضائے نیندیں
کچھ ایسے سوئے ہیں سونے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے

ڈارغ کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

خدا ہوتے ہو کیوں عہد وفا کے فکر پر پرج ہے

نہ تم وعدہ خلافوں میں نہ ہم بے اعتباروں میں

سرخوردہ کو تسکین دہیں ہوتی ہے مجھ پہ احسان ہے اس کوچے کی دیواروں کا
دوش پہ اپنے جو صیاد نے زلفیں چھڑیں اور جی پھوٹا گیا آج گرفتاروں کا

جگر کے شعر ملاحظہ ہوں جن میں جمع کے استعمال سے کلام کا حسن دو بالا ہو گیا :-
دل میں باقی نہیں وہ جو شر جنوں کی نہ نہ دامنوں کی نہ کمی ہے زگریبانوں کی

میں نے جب ستم سے شر میں جھک لی گردن بختوانے کو بٹھے میری خطائیں آئیں

اللہ اللہ اعتبار راست نظر اور پھر ان سب کی بے بنیادیاں
اس نگاہ ناز ہی سے پوچھئے اک اسیر شوق کی صیادیاں

نقل قول کے حسن استعمال سے بھی کلام میں بجائے تعین کے رمز و ابہام پیدا
کرنا مقصود ہوتا ہے۔ حالانکہ نشریں اس کے بالکل خلاف ہے۔ نشر میں نقل
گول مطالب کی صفائی اور تعین کا سب سے زیادہ موثر ذریعہ ہے۔ غزل میں
اس سے رمز کی کیفیت کو وسعت حاصل ہوتی ہے۔ اور شعر کی بے تکلفی اور
تازگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اساتذہ کے کلام سے یہاں چند نمائیں پیش کی
جاتی ہیں :-

ایک ہر بان قافہ سے کہہ دے اے صبا اے ہی گر قدم ہیں تمہارے تو ہم ہے
(سودا)

کہتے تو ہو "یوں کہتے" یوں کہتے جو وہ آتا

کہنے کی ہیں سب باتیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

(میر)

دل چاہے جوں رو کر شبنم نے کہا گل سے اب ہم تو پھنے یاں سے رہ تو جو رہا چاہے

(میر)

ٹھیرے ہیں ہم تو مجرم نکہ پناہ کر کے تم کو تم سے جو اکٹری ہو چکے تم کیوں ہوئے پیارے

(میر)

کیوں صبا کہ جس کو تو بھلا گیا تھا سحر جوں نقش پا پڑا تری اچھے ہے راہ وہ

(میر حسن دہلوی)

جب میں چلتا ہوں تم سے کو... سے کر کے بھی دل بچھے پھر کے کہتا ہے "ادھر کو چلے"

(میر حسن دہلوی)

پہنا جو میں نے جامہ دیر انگی تو عشق بولا کہ "بدن پہ تر سے سج گیا لباس"

(مصحفی)

پرڑے ہے بزم میں جس شخص پر نگاہ تری وہ منہ کو پھر کے کہتا ہے "اف پناہ تیری"

(جرات)

کہے گر کوئی اس سے ملے کہ جرات تمہارا طلب گار پیدا ہوا ہے

تو کہتا ہے وہ از رہ طعن ہاں جی یہی تو خریدار پیدا ہوا ہے

(جرات)

جناؤں و در محبت تو کس اداسے کہے مکرو نہ مجھ سے یہ باتیں دیوانہ بن کی سی

(جرات)

اس چشم پہ آنکھ پڑتے ہی ہم نے کہا "جادو برحق ہے کرنے والا کافر"

(جرات)

اسد بیل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے عتو شش ناز گر خون دو عالم میری گردن پر

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں کہ ”آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں
(غالب)

میں جو کہتا ہوں کہ ”ہم لیں گے قیامت میں تمہیں“
کس رعوت سے وہ کہتے ہیں کہ ”ہم حور نہیں“
(غالب)

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی“ سن کے تم طریف نے مجھ کو تھا، یا کہ اول
(غالب)

”سمجھو کہ رستے ہیں بازار میں وہ پریش حال کہ یہ کہے کہ ”سر رہ گذر ہے کیا کہیے“
(غالب)

”رشتہ کہتا ہے کہ ”اس کا غیر سے اخلاص نہ“ عقل کہتی ہے کہ ”وہ بے ہر کس کا آشنا“
(غالب)

”نہ کہو طعن سے چہرہ کہ ”ہم ستمگر ہیں“ مجھے لو خوب ہے کہ جو کچھ کہو ”بجا“ کہئے
(غالب)

ہنس کے بولے سوال بوسہ پر ”ایسی باتوں کا یاں جواب نہیں“
(مجدوح)

”نقش پائے رفتگاں سے آ رہی عریضدا“ ”دو قدم میں اٹے ہے خوق منزل چاہئے“
(آتش)

”بانغ میں آج جو اس گل کی سواری آئی“ ”شوریل نے کیا ”باد بہاری آئی“
(ناسخ)

”اٹھتے ہی تیری بزم سے اٹھا یہ غفلد“ ”بہتوں کا دل کشاکش محفل میں رہ گیا“
(عینی)

”امیر اس ناز سے ظالم نے دیکھا“ ”نگاہیں بول اٹھیں“ وہ لے لیا دل“
(امیر میاں)

کہہ رہی ہے حشر میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی "مائے کیسی اس بھری مجلس میں رسوائی ہوئی"
(امیر خٹائی)

مرے نصیب یہ کہتے ہیں میرے نالوں سے "رہے خیال بیماری بھی نارسانی سے کا"
(امیر خٹائی)

یہ کہتی ہیں ہم سے جنائیں تمہاری "نہیں باز آتیں وفا میں تمہاری"
(جلال)

نکاح شوق بہت اضطراب خوب نہیں "بہر، وہ آپ ہی پردہ اٹھائے دیتے ہیں"
(جلال)

کہاں کہاں دل شاق دیدنے یہ کہا "وہ چمکی برق تجلی وہ کوہ طور آیا"
(داغ)

لب تک آئی تھی شکایت کہ محبت نے کہا "دیکھ پھٹکے گا خاموش یہ دستور نہیں"
(داغ)

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں "اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر روپا نہ آتا ہے"
(داغ)

یہ کیا کہا کہ تیری بلا بھی نہ آئے گی "کیا تم نہ آؤ گے تو فضا بھی نہ آئے گی"
(داغ)

نگاہِ ناز یہ کہتی ہے تیرا نکلن کی "کہ تیں ہوں دل کیلئے تیرے گلہ کیلئے"
(جلیل)

نقاب کہتی ہے "میں پردہِ قیمت ہوں اگر یقین نہ ہو دیکھ لو اٹھا کے مجھے"
(جلیل)

تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں "وہ قدم کو چسُ رسوائی سے"
(جلیل)

عقل سے راہ جو پوچھی تو پکارا یہ جنوں "وہ تو سبکی ہوئی خود پھرتی ہے رسمِ ہم ہیں"
(شاہِ عظیم آبادی)

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموشی کھڑا ہوں ساحل پر
 دریاۓ محبت کہتا ہے ”آکچھ بھی نہیں پایا میں ہم“
 مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
 ”آجاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم“
 (شادِ عظیم آبادی)

”محبت کیوں کرو گر پو نہیں سکتی وفا مجھ سے
 یہ تم نے کیا کہا مجھ سے یہ تم نے کیا کیا مجھ سے
 (حسرت)

”دیکھ نہ ہیں کوئی محبت کی نظر سے“ کیا خوب یہ اندازِ حکم ہے تمہارا
 وہ اب یہ چھیرے کہتے ہیں ”میں غم نے تجھے نہ بے قرار کیا ہے نہ بے قرار کرے“
 (حسرت)

”حالِ دل سے تمہیں آگاہ کئے دیتے ہیں اب کبھی ہم کو خبر کیا تھی“ نہ کہنا دیکھو!
 (حسرت)

”دل سے اربابِ وفا کا ہے بھلانا مشکل ہم نے یہ ان کے نفاق کو نہ رکھا ہے
 (حسرت)

”عشاق کی جانب سے تعاضے غبار کہتے ہیں وہ جھگڑا یہ نکالا ہے کہاں کا“
 (حسرت)

”کوئی شکوہ سنج ستم اور ہوں گے وہ کہتے ہیں حسرت ہمارا نہ ہو گا“
 (حسرت)

”یہ کہہ کر دیا اس نے دردِ محبت جہاں ہم رہیں گے یہ سامان ہو گا“
 (حسرت)

”کہتی ہے یہ اب دستِ دیوانگی شوق“ منزل بھی جو آجائے تو منزل نہ سمجھنا“
 (جگر)

اس مجسم کے تصدق اس تجاہل کے نشار

خود گنجی سے پوچھتے ہیں کون یہ دیوانہ ہے

(جگر)

بزم سے یا چشم تراٹھ گئے کہتے ہوئے ”ہم سے تری داستان اب: سنی جائیگی

(جگر)

آ رہی ہے یہ صداکان میں دیرانوں سے نکل کی کج بات کہ آبار تھے ویوانوں سے

(مرزا یگانہ)

ردمہ کے جیسے کان میں کہتا ہے کوئی ”ہوں گے قفس میں کل جو میں آج آشیانے میں

(مرزا یگانہ)

شاعر بعض اوقات غیر ذی روح اشیاء اور مجرد کیفیات کو ذی روح فرض کر لیتا ہے یا ان میں ایک طرح کا تشخص پیدا کر دیتا ہے۔ بادی النظر میں تشخص سے ایک طرح کا تعین لازم آتا ہے لیکن غزل گو شاعر کا مقصد اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے جس طرح نقل قول کے ذریعے بظاہر مطالب میں تعین پیدا ہونا چاہیے۔ لیکن غزل میں اس کا الٹا اثر ہوتا ہے اسی طرح تشخص سے بھی رمزی اثر بڑھانے کا کام لیا جاتا ہے اکثر اوقات اس قسم کا تشخص ندرت استعارہ کا کرشمہ ہوتا ہے۔ مجرد کیفیات کے تشخص کی مثالیں قدمائے کلام میں نہیں ملتی یا اگر ملتی ہیں تو شاید دو تادور۔ غالب نے اس اسلوب کو برتا ہے۔ خاص طور پر جدید زمانے کے غزل کے استادوں کے یہاں اس کی مثالیں بہت کثرت سے ہیں۔ غالب کے کلام میں سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اے باغیت کنارہ کراے انتظام صل سیلاب گریہ در پئے دیوار و درہے کج

پھر نکاح ہے کس نے گوش محبت میں لے خدا افسون انتظار متا کہیں جسے

شوق کو یہ ت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائے دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرائے ہے

ہے کہاں تنہا کا دوسرا قدم یا رب ہم نے دشت امکان کو ایک نقش پایا یا

رد عا جو تماشاے شکست دل ہے آئینہ خانہ میں کئی لئے جاتا رہے مجھے

یعنی مایوسیوں کی وجہ سے دل کئے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور آئینہ خانہ کی صورت

پیدا ہو گئی۔ اب یہ عا اس آئینہ خانہ کا تماشا دیکھنے میں مصروف ہے۔ یہ وفا کا

تماشا دیکھنا خاص لعف رکھتا ہے۔ شاعر نے مجرہ کیفیت کو بھی خوبی سے شخص

عیا کر دیا ہے۔

غالب کے دو شعر در نظر کیجئے اور وارز کیجئے۔

سے نے کیا ہے حن خود آرا کو یہ حجاب اسے شوقیاں اجازت تسمیم و ہوش ہے

ویدار بادہ حوصلہ ساقی، تنکا ہست بزم خیال میکہ، بے خبر دستاں ہے

اس آخری شعر میں شاعر نے اپنے قصورات کی دنیا کو ایک میکہ فرض کیا ہے

جس میں شربت ویدار شراب کا حکم رکھتا ہے، حوصلہ کے نئے ساقی گری ہے، اور تنکا

میخواری میں مست ہے۔ اب سب کیفیات کے شخص نے کام میں عجیب لطف

بیدا کر دیا ہے۔

دوسرے غزل گو اسافزہ کے کلام میں ہے چند خیالیں رخیہ طلب ہیں

روہ سادگی سے بقا فہل کو ناز کتے ہیں

مگر سکھائی ہے خوخی کہ دستاں کیے

تم آوجب سوار تو سن ناز قیامت ہم رکاب کئے نہ آئے

تسخ قاتل پہ ادا لوٹ گئی رقص سہل پہ تضاوٹ گئی

واع (اور یہ کیا ہے)

اچھا ہوا کہ شرم و شرات میں چل گئی

(قافی)

دل کی نبضیں جھپٹ گئیں اور جا و گزر دیکھنا

(قافی)

تمہاری یاد کو عادت ہے بھول جانے کی

(قافی)

رنگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لے گئے

(اصغرا)

جب بچہ شوق تڑپی پردہ عمل دتھا

(اصغرا)

تھرا رہا ہے شعلہ عریان آرزو

(اصغرا)

ایسا حجاب چشم تاباں کہیں جسے

(اصغرا)

ہم نے یہ ان کے تغافل کو سنا رکھا ہے

(حسرت)

طرفہ عالم ہے ترسے حسن کی بیداری کا

(حسرت)

اس قدر اہتمام شرم و حجاب

(حسرت)

مل کے رویا خوب ابرو بہار ابکی برس

(حسرت)

آئین وفا مد نظر لے کے گئی ہے

(حسرت)

تم کیوں گئے تھے آئینہ خانہ میں بے حجاب

یاس جب چھائی، سیدیں ہاتھ مل کر گئیں

مگر ضرور نہیں حال بے خودی معلوم

میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں

عشق کی بتایوں پر حسن کو رحم آگیا

اب طور پر وہ برق تجلی نہیں رہی

اس جلوہ گاہ حسن میں پھایا ہے ہر طرف

دل سے ارباب وفا کا ہے بھلا، نکل

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرہ داری کا

عشق سے کہاں روا ہے حسن

فرقت ساقی میں ہم حسرت کشان بارہ سے

ہم بزم سے آزد وہ نہ گھٹتی محبت

تمنا نے کی خوب نظارہ بازی مژو دے گئی عین کی بے مشوری

(استعارہ)

تری محفل سے ہم گئے گرجا حال ناز گئے
تاشا کا سیاب آگے آتا ہے قرار آئی
ہوس نے کام جان پایا عین شہ سار آئی
یہ کیا اندھیر ہے لے دشمن اہل وفا تجھ سے

(حسرت)

ترے حسن مغرور سے نسبتیں ہیں کہیں ہم نہ رہ جائیں مفسد و مہر ہو کہ

(انگڑ)

عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں تھی ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشہ نقاب ان کا

(جگر)

فراق حسن و تکلیف تجھی لے موا داندہ بس اب رسوا نہ کرے بخود شی قی پشیا کو

(جگر)

کنایہ بھی کنایہ اور استعارہ کی طرح رمز و ایما کو نکھالتی ہے۔ اس میں بھی
کنایہ کی طرح لازم و ملزوم میں واسطہ برقرار رہتا ہے جس کی لطافت کا یہ
اقتضا ہے کہ تعقید نہ پیدا ہو۔ کنایہ کی طرح طبع بھی مقصود بالذات نہیں ہوتی
بلکہ سادہ اس کے ایما کی اثر کی تازگی کا متوقع رہتا ہے۔ مثلاً

بے ستون کیا ہے کوہ کن کیسا عشق کی زور آزمائی ہے
مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میر کیا دوانے نے موت پائی ہے

(میر)

اے سجادہ نشین قیس ہوا میرے بعد نہ ہی دشت میں خالی مرا جا میرے بعد

(میر)

میں نے مجنوں پہ ترکین میں اسد سنگ اٹھایا تھا کہ سسور یاد آیا

(غالب)

عشق و مروت دہریٰ عشرت کلا بخیر کیا خوب ہم کو تسلیم نکو نامی مسد ہا و نہیں

(غالب)

غزل میں بعض اوقات استفہام سے بھی حسن کلام پیدا کیا جاتا ہے
 استفہام بالعموم اشیائے محلوں کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے جو جملوں کے
 مفہام میں ڈیالو لطافت اور بناغت رکھتے ہیں۔ استفہام میں منہم وضاحت
 کے لئے مخاطب سے کچھ دریافت کرتا ہے لیکن غزل میں اس کے ذریعہ شعر کے
 مزید اثر میں اضافہ ہوتا ہے۔ شاعر ایک طرح کا جمال عارفانہ برتن ہے۔ حقیقت
 وہ استفہام سے کبھی اپنے اندر زنی تھیر کو ظاہر کرتا ہے اور کبھی دیدہ و دانستہ
 اپنے تجربات کی پیچیدگی اور الجھاؤ کو نمایاں کرتا ہے۔ استفہامی شعروں کی
 مثالیں بڑے شاعر کے یہاں ملتی ہیں۔ یہاں چند مثالوں پر گفتا گیا جائے گا
 یہ صاحب کے دیوان میں کثرت سے اس قسم کے اشعار ہیں اور بعض غزلیں پوری
 کی پوری استفہامی رنگ میں ہیں۔ فرماتے ہیں۔

نہ پتا نقش پئے نادر چا جاتا ہے تہ محبوں بیاباں میں وہ سیلی کا کدہ برعل ہے کیا جانے؟

یشون میں شب کے ڈوئی زنجیر میر صاحب اب کیا مرے جنون کی تدبیر میر صاحب؟

ہے اس سے سے یار و اجڑی داس میر تک اقلیم عاشقی میں آبا و مگر کہاں ہے؟
 جاتا نہیں اگر وہ مسجد سے مسکدہ کو پھر خیر جمعہ کی شب دودو پہر کہاں ہے؟

ہے عرصہ تیرا ہی جو تنگ نہیں آتا کس سے یہ ستم ورنہ اسے تیرہا جاوے؟
 فاقہ کے یہاں بھی متعدد غزلیں استفہامی انداز میں ہیں۔ مثلاً۔
 دوست غمخواری میں میری سی فرمائیں گے کیا
 زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟

دونوں جہاں سے کے وہ سمجھے یہ خوش ہا یاں آپڑی یسٹرم کہ تھوڑا کیا کریں؟

غم عشاق نہ ہو سادگی آموز بستاؤں کس قدر خانہ آئینہ ہے ویران مجھ سے؟

آئینہ کیوں نہ روں کہ تماشا کہیں جسے
ایں کہاں سے تلاؤں کہ تجھ سا کہیں مجھ سے؟

بیکھری جنن ہے سرو پٹنے کا شعل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی؟

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کو تو کیا ہے؟
مہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

کہہ دو حال تو کہتے ہو مدعا کیسے
تہیں کہو کہ جو نظم یوں کہو تو کیا کہیے؟
نذر سے مشہور شاعروں کے کلام سے چند مثالیں لائے گئے ہیں۔

گر مہیاں پھانڑ کر دیو اسے نے نہ بکیر کیوں پر ہنسی
کرے کیا نقل دخل اس میں جنون کا کارخانہ ہے؟

(آتش)

کون وہ دل ہے جو مویخ جاناں نہ ہوا
کون ذی ثنہ ہے جو دیہہ حیدر ایں نہ ہوا؟

(ناتواغ)

نستا ہی نہیں وہ بت گمراہ کسی کی
ایسا نہ ہو سن لے کہیں اللہ کسی کی؟

(رند)

زند کے اس شعر میں نقل قول اور استفہام کا دونوں خوبیاں موجود ہیں۔
دیوانوں سے کہہ دو کہ چلی ماہِ بزاری
کیا اب کی برس چاک گریبان نہ کریں گے؟

(رند)

داغ نے اس شعر میں بھی نقل قول اور استفہام دونوں ساتھ ساتھ موجود ہیں۔
مینا نے کے قریب تھی مسجد جہلے کو داغ
برایک پوچھا ہے کہ حضرت ادم کہاں؟

مہروم بھر آیا سو مینا نے سے واعظ
رندان قیح خواہی ہت کو ہکلیا (مالی ہوی)

انس ہے غارِ صیاد سے گلشنِ کیسا؟ نازِ پروردِ قفسِ ہوں میں نشہ کیسا؟
(نشتہ)

حسرت کے یہاں بھی استغنامی اشعار کثرت سے موجود ہیں اور بعض غزلیں پوری کی پوری اس رنگ میں ہیں۔ طوالت کے خوف سے چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

کبھی کی تھی جواب دوا کیجئے گا؟ مجھے لڑچھ کر آپ کیا کیجئے گا؟

حالِ مجبوریٰ دل کی نغراں بھیری ہے دیکھنا وہ نگہ ناز کہاں ٹھہری ہے؟

سب سے شوخی ہے اک ہمیں سے حیا اسے فریبِ نگاہ یار یہ کیسا؟

حسرت کے اس شعر میں نقلِ قول اور استغنام دونوں ہیں۔
محبت کیوں کرو گز بونہیں سکتی وفا مجھ سے یہ تم نے کیا کہا نہ کو یہ تم نے کیا کیا مجھ سے

ان دونوں شعروں میں استغنام سے تاثر کہاں سے کہاں پہنچ گئی
ویسے کہنے کو معاط کے شعر ہیں

سرگرم نازِ آپ کی شانِ جفا ہے کیا؟ باقی ستم کا اور ابھی حوصلہ ہے کیا؟

نظر پھرنے کی اس پیدلِ حس کا پھینا نعمت کا یہ بھی بہت کوئی قرینہ؟

جگر کے بھی چند شعر ملاحظہ ہوں :-
محبت کیا ہے؟ تاثرِ محبت کس کو کہتے ہیں؟ ترا مجبور کر دینا، مرا مجبور ہو جانا

کہاں ہم اور کہاں ابسانہ غم عشق؟ وہ اوقات نہ رہتے تو کچھ بیان ہوتا

اس ایک دل کی حقیقت کو کوئی کیا جانے؟ جو لاکھ بار بنا اور پھر خراب ہوا

کیا غصہ نہ گھڑا تو اسے دل پہ اثر ہے کہ نہیں میں پرستار محبت ہوں خبر ہے کہ نہیں؟

وہ کون ہے ایسا کہ تری شکل دکھائے؟ احسان ہے اس کا جو مجھے مجھ سے ملا دے

جگر کی بعض پوری غزلیں استہنامیہ انداز میں ہیں مثلاً۔
عشق کی یہ غلو پیہم کیا؟ ہو نہیں تم اگر تو پھر ہم کیا؟

سن تو اسے دل یہ برہمی کیا ہے آج کچھ درد میں کمی کیا ہے؟

یہ مے کشی ہے تو پھر شانِ مکی کی کیا ہے؟ بہک نہ جائے جو بی کر وہ رنڈی کیا ہے؟

بنگاہ شوق جگر و تنف چار سو کیا ہے؟ جو دل حسین ہو تو دنیاے رنگ دبو کیا ہے؟

دل جھپایا بڑا ہے کیا کہیے؟ آپ کا نقش پڑا ہے کیا کہیے؟

اسی طرح غزل کے یہاں بھی استہنامیہ غزلیں ملتی ہیں اور منفرد اشعار
تو بے شمار ہیں مثلاً

وایہی یہ عشق پیہم کیا؟ یاس و امید شادی و غم کیا؟

اس نور مجسم کے افسانے کو کیا کہیے؟^{۶۰} ہے شمع بھی پروانہ پروانے کو کیا کہیے؟

نظموں کی ٹکڑوں بالعموم نثر اور شعر دونوں میں بھڑبھڑا جاتی ہے
لیکن اگر نظموں کی تکرار اور اسٹ پھیر ایک خاص سیاق سے کی جائے
اور وہ رمزی اور ایجابی احساس کو بڑھانے میں مدد دے تو کلام کی
بلاغت اور حسن میں اضافہ ہو گا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

قطرہ قطرہ آئینو جس کی طوفاں طوفاں شدت ہے
پارہ پارہ دل ہے جس میں تو وہ تو وہ حسرت ہے
(ذوق)

رہے اس شمع سے آلودہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک انداز بنوں وہ بھی
(غالب)

لاکھوں لگاؤ ایک چسپاں نگاہ کا لاکھوں بناؤ ایک بگڑا عتاب میں
(غالب)

کس تجا بل سے وہ کہتا ہے کہاں رہتے ہو
تیرے کو چہ تیرے گار تیرے کو چہ میں
(شفیقہ)

ہوئے ہیں عاشق بھی کن گلوں کے کہ خود ہی شاکی ہیں جن گلوں کے
نہیں ہے وعدہ میں ان گلوں کے وفا کی بواہ تاز کا رنگ
(جلال لکھنوی)

بھلا بھلا کے جتا ہے ان کو راز بننا
چھا چھا کے محبت کو آشکار کیا
(داغ)

ان کو بے تاب کیا کچھ نہ کہا نا دل
یہ تو کچھ بھی نہ ہوا، یہ تو اشرکچہ بھی نہیں
(داغ)

ٹھہر گئے وہ جہاں سرو باغ تھے گویا اگر چلے تو نسیم بہار ہو کے چلے

(د آغ)

دعا سے کچھ نہ ہوا النہا سے کچھ نہ ہوا
بتوں کے عشق میں یا وعدے کچھ نہ ہوا
پتھری تو تھی، مگر اپنے اثر کو لانہ سکی
گئی تو تھی مگر آؤ رسا سے کچھ نہ ہوا

(مضطر)

کہاں نگہوں کے وہ تھے وہ لالہ زار کہاں
بہار میں تو نظر لگ گئی بہار کہاں

(شا و غنیم آبادی)

دریا سے محبت بے ساحل اور ساحل بے دریا بھی ہے

جو موج ڈبو دے ساحل ہے یور، نام کا ساحل کوئی نہیں

(فانی)

حکم و حشمت ہے کہ زنداں کو بھی صحرایان
دل وہ آزاد کہ صحرایان کو بھی زنداں سمجھے

(فانی)

کوئی ان کی بزمِ جمال سے کب اٹھا خوشی سے کہاں اٹھا۔

جو کبھی اٹھا بھی اٹھائے سے تو اسی طرف ننگراں اٹھا

(حسرت)

جب بے کے گئی ہے ہیں تاکوئے ملا
مجبوری دل خاک بسرے کے گئی ہے

(حسرت)

اے وہ یاد کہ اس یاد کو ہو کر مجبور
دل مایوس نے مدت سے بھلا رکھا ہے

(حسرت)

تازگی بیان اور ندرت مضمون کا بعض دفعہ یہ اقتضا ہوتا ہے کہ شعر
کے چند لفظوں کو غیر مذکور رکھا جائے اور مطلب کو اس طرح بیان کیا جائے کہ
سامع کا ذہن خود بخود اس گمی کو پورا کرے مثلاً

موئے دلبر سے مشکبو ہے نسیم حال خوش اس کے خستہ حالوں کا

(میر)

اس نقش پاکے سجدے نے کیا کیا ذلیل
میں کو چہ رقیب میں بھی سر کے جلی گیا
(مومن)

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
عیاد کی نگاہ سوئے آشاں نہیں
(مومن)

شکوہ ہے غیر کی کہ درست کا
سو میرے قاتل کے میں مٹانے کو
(مومن)

سلطنت دہست بدست گامی ہے
جامائے خاتم جمشید نہیں
(غالب)

کیوں رد و قدح کرے ہے زاہد
مٹے ہے یہ تمس کی قے نہیں ہے
(غالب)

ہم بھی اسید و صل سے خوش ہیں
ہے زمانے کو انقلاب بہت
(مخرج)

کل تک یہی گلشن تھا صیاد بھی بجلی بھی
دیا ہی بدل دی ہے تعمیر نشین نے
(غالی)

بعض اوقات صدف کرنے کے بجائے مضمون کو دیدہ و دانستہ طول
دیا جاتا ہے جو مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ اس سے ایمائی اثر

حاصل ہوتا ہے اس لئے کلام کی تازگی اور حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً

غالب کہتے کہنا ہے کہ فلک کے ظلم معشوق کے ستم سے کم نہیں فلک کے ظلم
دیکھ کر معاً معشوق یاد آتا ہے اس مضمون کے لئے یہ انداز اختیار کرتے ہیں۔

فلک کو دیکھو کسے مگرتا ہوں اس کو یاد اسد
جفا میں اس کی ہے انداز کا رنہ رما کا

اسی مضمون کا صبا لکھنوی کا شعر ہے جو کسی طرح غالب کے شعر سے کم
نہیں۔

پرخ کو کلب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
 کوئی مشوق ہے اس پردہ زنگاری میں
 جھڑجھڑنے بھی اسی مضمون کو سیدھے سادے طور پر ادا کیا ہے جو لطف سے
 خالی نہیں۔

ملتی ہے اس کی وضع زبیں غمے یار میں
 آئے نہ کیوں مزا ستم روزگار میں
 مومن خاں جذبہ رشک کے تحت اپنے محبوب سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غیر سے
 سرگوشیاں نہ سمجھئے بلکہ میری طرف التفات فرمائیے۔ لیکن بظاہر معلوم ہوتا ہے
 کہ یہ کہہ رہے ہیں کہ غیر کی طرف پہلے متوجہ ہو لیجئے۔ حالانکہ ان کا مدعا اس
 کے بالکل عکس ہے۔

غیر سے سرگوشیاں کر لیجئے پھر ہم بھی کچھ
 آرزو ہائے دل رشک آشنا کہنے کو ہیں
 مقصود صرف اپنے گریبان کے چاک کی دست بتانا ہے لیکن اس ضمن
 میں دست جنون کے صدقے جاتے ہیں اور یہ انداز بیان اختیار کرتے ہیں۔
 دست جنون کے جائے صدقے کہ چین سے

پھیلائے پاؤں ہم تے گریباں کے چاک میں
 رمزی اور ایمائی اثر آفرینی کے ضمن میں شاعر قبض وقت ایسا انداز بیان
 اختیار کرتا ہے جس سے سامع کا ذہن کبھی حکم سے کفایت کی طرف کبھی غیبت
 سے حکم کی طرف کبھی خطاب سے حکم کی طرف اور کبھی خطاب سے غیبت کی طرف
 خوب جھجھکتا رہتا ہے۔ کبھی مفرد اور جمع کے صیغے ایک ہی شعر میں برتے جاتے ہیں۔
 دراصل یہ سب رمزی طبع کے کرشمے ہیں اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ شریں
 یہ سب باتیں عیب ہیں لہذا غزل میں انھیں حسن ادا کی سند حاصل ہے۔ چند
 مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اب کے جو تیرے کوچے جاؤں گا تسنیو پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا

(میسر)

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا کیا خوب آدمی تھا خدا منقبت کرے

(ذوق)

وعدہ آنے کا وفا کیجئے یہ کیا انداز ہے تم نے کیوں سوچنی ہو اپنے درگی درباری مجھے

(غالب)

عجیب اٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے

کبھی بات کی جو سیدھی تو بلا جواب اٹا

(انشاء)

ترے در سے اب ہم سفر کر چلے جو تم کہ اب ہسم گزر کر چلے

(میر سوز)

فصل بہار آئی پیو مونس شراب بس بوچی ناز مصلی اٹھاپئے

(آتش)

پھنس گئے تم نہ سنی حضرت دل بات میری بندگی آپ کو اے قبیلہ حاجات مری

(امیر)

ادھر آؤ اس بات پر بوسہ لے لوں مرے سر کی جھوٹی قسم کھانے والے

(داغ)

تحمل کبھی معمول کے خلاف مستقبل کے معنی ماضی کے ساتھ وابستہ کو تیلہ تاکہ

اہام و رموز پیدا ہو۔ مثلاً یوں ہی گرد و تار غالب لے اہل جہاں دیکھنا ان سبکیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

مجھ گہنگار کو جو بخش دیا تو جہنم کو کیا دیا تو نے

(داغ)

ایک ہی شعر میں مفرد اور جمع کے استعمال پر بحث کرتے ہوئے مولفہ سرسرت سوبانی نے ”نکات سخن“ (ص ۹۸) میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے استاد منشی امیر لہندہ تسلیم لکھنوی کو ابتدائی منشی کے زمانے میں اپنی ایک غزل اصلاح کے لئے بھیجی تھی جس کا مطلع یہ تھا۔

ملتے ہیں اس طرح سے کہ گویا خفا نہیں کیا آپ کی نگہ سے میں آتش نہیں
منشی صاحب مرحوم نے پہلا مصرع بدل کر یوں کر دیا
ملتے ہو اس اداسے کہ گویا خفا نہیں

اور دوسرا مصرع جیسا تھا ویسا رہنے دیا۔ گویا ان کے نزدیک تم کے ساتھ آپ کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ اگرچہ حسرت کا خیال ہے کہ تم اور آپ اور تو اور تم کا اجتماع قابل اعتراض ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس باب میں ان کے استاد کا مسلک غزل کی تکنیک کے نقطہ نظر سے بہتر اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مفرد اور جمع کے صیغوں کے اجتماع سے شعری رمزی کیفیت بڑھ جاتی ہے اور کبھی قسم کی اعتقید نہیں پیدا ہوتی۔ مطلب میں تعین کے بجائے ایک قسم کا ابہام اور پھیلاؤ آ جاتا ہے جس سے شعری احساس لطف اندوز ہوتا ہے۔ لیکن رمزی علامتوں کو برتنے میں اگر خفا سے سلیقے سے کام نہیں لیا گیا تو لطف سخن حاصل ہوتا تو کجا وہی بات ذوق پر گراں گذرے گی۔

۔۔۔ ہی حال رعایت لفظی کا ہے۔ اگر اس سے شعری رمزی اور ایمانی کیفیت بلا کسی تکلف کے بڑھ جائے تو سامع اس سے لطف اندوز ہوگا۔ ورنہ اگر احساس پیدا ہو کہ شاعر نے تکلف اور تصنع سے کام لیا ہے تو طبیعت اس کی طرف کبھی بھی مائل نہ ہوگی۔ ایسی لفظی نایتوں سے بچائے کو فت اور بے بطنی کے کچھ حاصل نہیں۔ یہ ضلع جگہ سے روح تغزل کا خون کرتی ہے۔ لکھنؤ اسکول نے اسکی جانب زیادہ توجہ کی جس کے سبب سے کلام میں طرز تصنع نے راہ پائی۔ بعض دلی سکول کے غزل گو شاعر بھی اس مرض میں مبتلا ہیں۔ چند عام مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

تو زدل کا نہ مرے مار کے پتھر شیشہ
 شگدل ہم نے بنایا ہے یہ مر مر شیشہ
 (شاہ فقیر دہلوی)

کیا ہے تازہ نخل غم کو آہیں سر و بھر بھر کر
 بڑی محنت سے میں نے یہ ٹر جانے میں پالا کر
 (امانت لکھنوی)

کر رہا ہوں شام سے میں انتظار اس کا
 دید و بیدار ہر ایک آج اختر ہو گیا
 (امانت لکھنوی)

دے دوپٹہ تو بہنا ٹل کا
 نا تو اں ہوں کفن بھی ہو ہلکا
 (ناسخ لکھنوی)

شعلے اٹھے جو آتش رخسار یار کے
 بالے کی مچھلیوں کو سمندر بنا دیا
 (برق لکھنوی)

بھاتا ہے نہایت دل کو خط رخسار جاناں کا
 گھیسے گا مجھے کانٹوں میں سبزہ اس گلستان کا
 (آتش لکھنوی)

سرخ رو دیکھئے کس کس کرے گاف اٹل
 سر پہ باندھے ہوئے مقتل میں کفن لاکھوں ہیں
 (دائع دہلوی)

چلو گھر خاک ڈالو اب حنا کا خون ہوتا ہے۔
 کف افسوس ملنے ہو کھڑے گنج شہیداں میں
 (سلیم لکھنوی)

ان مثالوں کے خلاف ایسی مثالیں بھی ہیں جن میں رعایت لفظی حدت
 اور ایس جان فدا دیتی ہے اور شعر کا معنوی اور رمزی اثر کہاں سے کہاں
 پہنچ جاتا ہے۔

میرے سنگ مزار پر نہ ہاد رکھ کے نیشہ کہے ہے "یا استاد"

(میر)

گرچہ آوارہ چوں صبا ہیں ہم لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم

(میر)

بکلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں تب نہ تقریر بھی تھا

(غالب)

عمر ہر چند کہ ہے برق خدام دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی نہیں

(غالب)

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں ہر چند اس میں ہاتھ ہائے قلم ہوئے

(غالب)

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھانے

(غالب)

یہ عمر بھڑ جو پریشانیوں اٹھائی ہیں ہم نے تہائے آئو لے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

(غالب)

اس قسم کی مثالوں سے غالب کا دیوان بھرا پڑا ہے اور دوسرے شاعروں

کے ہاں بھی کثرت سے ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں رعایتِ لفظی سے کلام

کی شگفتگی، بلندی اور تاثیر میں اضافہ ہوا ہے۔

جس طرح حسن کو محسوس کیا جاتا ہے لیکن اس کی تعریف نہیں کیا جاسکتی

اسی طرح شعر کے حسن ادا کو بھی محسوس کرنا ممکن ہے۔ خیال میں محسوسات کی

جو صورتیں جمع ہوتی ہیں ان کے اظہار پر جب تک پوری قدرت نہ ہو

اس وقت تک طرزِ ادا میں جدت اور دلکشی نہیں آسکتی۔ حسن ادا کے لئے

لفظی اور معنوی دونوں خوبیاں درکار ہیں۔ وہی معمولی باتیں ہیں جنہیں

سب کہتے ہیں۔ ایک کے کہنے کا اثر ہوتا ہے دوسرے کے کہنے سے کان پر

جوں تک نہیں رہی تھی۔
 قطرہ اشک کا مضمون پیش پا افتادہ ہے۔ لیکن غالب نے اسی مضمون میں
 ندرت اور نزاکت کی رنگارنگی سودی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قطرہ اشک کی قدر
 و قیمت گہرے زیادہ ہے۔ اس مضمون کو صاف طور پر بیان کرنے کے بجائے
 پہلے یہ دعویٰ پیش کیا کہ جتنی ہمت ہوگی اتنی ہی توفیق ہوگی۔ یہ قطرہ کی پست
 ہمتی ہے کہ وہ گہر بننے پر قناعت کر لیا۔ اگر اس کا حوصلہ بلند ہوتا تو اس کو
 انسانی آنکھ میں جگہ مل سکتی تھی جو اس کے رہنے کی معراج ہوتی۔ شعر میں
 دعوے سے زیادہ اہمیت ثبوت کو حاصل ہے جس میں رمزیت کوٹ کوٹ کر
 بھری ہے شعر ہے :-

توفیق باندازہ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گہر نہ بولایا
 اس میں شبہ نہیں کہ غزل میں حسن ادا کی خوبی کے لئے لازمی عنصر
 ایامی اثر آفرینی ہے۔ چاہے لفظوں سے کوئی بلند یا گہرے معنی نہ نکلے ہوں
 یا خود لفظ خوشنما نہ ہوں لیکن اگر شاعر اپنے فکری اور جذباتی محسوسات کی
 صورتوں میں ذہنی تصرف پر قادر ہو گیا تو ضرور ہے کہ وہ ایامی اثر پیدا
 کر سکے گا۔ محسوسات کی مختلف صورتوں میں ذہنی تصرف اس واسطے ضروری
 ہے کہ وہ انھیں حقیقت سے مجاز کی طرف اور تصریح سے کنایہ کی طرف
 لے جانا چاہتا ہے کہ بغیر اس کے شعری بلاغت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ لیکن
 اس کے ساتھ اس کا اہتمام بھی ہونا چاہیے کہ رمزی اور مجازی معنی حقیقت
 سے بالکل منقطع تو نہیں ہوئے۔ مجاز و رمز کی دنیا میں جس سے غزل
 عبارت ہے امر عقلی میں تصرف جائز ہی نہیں فرض ہے تاکہ حسن ادا جلوہ گر
 ہو۔ غزل کے لفظوں کے ظاہری معنی کبھی بھی مقصود بالذات نہیں ہوسکتے
 اور نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر ان سے رمزی اثر پیدا ہو جائے تو پس اس
 سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے۔

طرز ادا کی اعلیٰ کسوٹی پر اردو غزل نگاروں میں غالب کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ وہ پست مضمون کو بھی ایمانی زور سے اوپر اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیتا ہے۔ یہ ایک نئی زور کہاں سے آیا؟ اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ معنوی اور رمزی اثر بہر حال لفظوں ہی کا رہن منت ہوتا ہے۔ اپنی اپنی جگہ سب لفظ بلند اور پست احوال کی طرف ذہن کو منتقل کر سکتے ہیں۔ دراصل لفظوں کی ترتیب و ترکیب ان کی فطرت کو بدل دیتی ہے اور معمولی باتیں سحر بن جاتی ہیں۔

غم کا مضمون بیان کرنا مقصود ہے۔ موت اور کفن کی شعری علامتیں پیش کی گئی ہیں۔ اس فضا میں کیا بلا کی شوخی لفظوں کی مناسب ترتیب نے پیدا کر دی۔ غالب کا شعر ہے۔

اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤں ہیں

پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پر حور کی

مرزا یگانہ اسی مضمون کو ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کا شعر غالب کے شعری گرد کو بھی نہیں پہنچتا۔ کہتے ہیں۔

جامہ زمیوں پہ کفن نے بھی دیا وہ جو بن

دوڑ کر بے کلمہ سے رنگا نا چا

سوال یہ ہے کہ مرزا یگانہ کے شعر میں کس چیز کی کمی ہے جس کی وجہ سے اس کی تاثیر پچیس پچسی رہ گئی؟ سارا طلسم لفظوں کی صحیح ترتیب اور حسن استعمال میں پوشیدہ ہے۔ غالب نے کفن کی مناسبت سے شہیدوں اور حور کے جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان کے اندر رمز و ایما کا خزانہ چھپا ہوا ہے۔ برخلاف اس کے مرزا یگانہ نے اپنے شعر کو غلط غلط سے شروع کیا اور آخر تک غلطی میں مبتلا رہے۔ جامہ زیب اور جو بن کے لفظ اس رمزی فضا میں بے سود پیدا کرنا چاہتے ہیں کھٹکتے ہی نہیں بلکہ ذوق سلیم پر گراں گذرتے ہیں۔

کتنے کے مضمون کے ساتھ اس قسم کے لفظوں کا تکلف یا چوچلا پن اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ چونکہ لفظ مقتضائے حال کے مطابق نہیں اس لئے ان کا شعر بلاغت اور تاثیر کے دربار میں بارز یا سکار تیر صاحب فرماتے ہیں۔

ہم نے جانا تھا کہ گے گا تو کوئی حرف اے میر
پیر ترانا مہ نواک شوق کا دفتر نکلا
تھوڑی سی تبدیلی کے بعد مصحفی نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

مصحفی ہم تو سمجھتے تھے کہ ہو گا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بڑا کام رفو کا نکلا
مصحفی کے دوسرے مصرع میں رفو کا لفظ ایمائی اثر پیدا کرنے کے بجائے نفس واقعہ کے بیان کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے جس کے باعث شعر بے اثر اور کمزور ہو گیا۔ برخلاف اس کے تیر کے شعر میں جدت ادا بلاغت اور سادگی کی دل نشینی معمولی ذوق رکھنے والے کو بھی محسوس ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ رفو کا مضمون غالب نے بھی باندھا ہے اور اپنے الفاظ کچھ انداز میں باندھا ہے۔ وہ محبوب کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ زخم کو جو میں رفو کار ہا ہوں تو اس کا مطلب چارہ جوئی یا پاس درد سے غفلت انہیں بلکہ زخم سوزن سے لذت گیر ہونا۔ مرزا کے یہاں ایمائی اثر آفرینی نے مضمون کی خرابیت کو اپنے دامن میں چھپا لیا اور وہ عیب جو مصحفی کے شعر میں نظر آتا ہے مرزا کے شعر میں نہیں۔

رفوے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی
سمجھناست کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے
دوسری جگہ اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غم سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

رفو کے مضمون سے ملتا جلتا مضمون پیوند یا جوڑ لگانے کا ہے۔
 ابر مینائی نے اس مضمون کو عجیب و غریب ندرت سے ادا کیا ہے۔ کہتے ہیں
 شب وصال بہت کم ہے آسمان سے کہو
 کہ جوڑ دے کوئی اکھڑا شبِ جدائی کا

اس غرض ایک تو نقل قول کی خوبی ہے جس میں رمز و کنایہ کا
 خزانہ چھپا ہوا ہے اس کے علاوہ یہ کہ شاعر نے ایک تیر میں دو نشانے
 اڑائے ہیں۔ وہ فلک سے شکایت کرتا ہے کہ شب وصال بہت کم ہے
 اور شبِ فراق اتنی طویل کہ کائے ہمیں کٹتی۔ شکایت کے ساتھ اپنے طلب
 مدد کا فلک پر کو ایک ترکیب بھی بتائی ہے کہ شبِ جدائی کی درازی میں
 سے ایک میچہ اکٹ کر شب وصال میں جوڑ دے تو کیا خوب ہو۔ اس طرح
 شبِ فراق کی درازی میں کمی پیدا ہو جائے گی اور شب وصال کی مدت کچھ
 بڑھ جائے گی جو عین مقصود ہے۔

شاعر نے یہ سب باتیں اتنے کم لفظوں میں اور اس سلیقہ سے ادا کر دی
 ہیں کہ بلاغت ناز کرتی ہے۔ شعر سن کر سامع کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا شب
 وصال اور شبِ فراق زندگی کی دائمی کیفیات ہیں جن میں ایک لطیف اور
 مبہم سا غلط ہے جو تغزل کی جان ہے۔

خواجہ میر درد کا شعر ہے۔
 کرتی ہے پوئے گل تو مرے ساتھ اختلاؔ پر آہ میں تو موج نسیم وزیدہ ہوں
 بہت بلند شعر ہے۔ اسی مضمون کو ذرا بدل کر رند نے یوں ادا کیا ہے۔
 میں مسافر ہوں اتر جاؤں گا پاراک دم میں

تجھ کو اے موج مبارک رہے دریا تیرا
 بلاشبہ رستم کے شعر کا ایمائی اور رمزی اثر جو لطافت جذبات کی ترجمانی کرتا ہے
 خواجہ میر درد کے شعر سے بھی بڑھ گیا۔ لفظوں کی ترتیب نے مضمون کی

دلاویری میں اور اضافہ کر دیا سیدھے سادے لفظ ہیں لیکن ان کا مجموعی اثر پڑا ہوا طور پر ذہن میں عجیب و غریب یادیں برانگیختہ کرتا ہے۔
میر تقی میر کا شعر ہے۔

کچھ زرد نہ رو چہرہ کچھ ناغری بدن میں کبا عشق میں ہوا ہے لے بیحال تیرا
اگرچہ شعر میں تفصیل زیادہ آگئی ہے لیکن چہرہ بھی ہنر سے خلوص نکلتا ہے جس کی بدولت
تفصیل کا عیب بڑی حد تک چھپ گیا ہے۔ حسرت موہانی نے اسی مضمون میں اپنے
ایجاز بیان سے اور زیادہ نزاکت پیدا کر دی۔ دوسرے مصرعے میں استغناء م کما
لفظ خاص طور پر ملاحظہ طلب ہے۔ شعر ہے۔

عشق تباں کو جی کا جنمال کر لیا ہے حسرت یہ تو۔ اپنا کیا حال کر لیا ہے؟
سعدی شیرازی کا مشہور شعر ہے۔

دوستان منع کفندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی
میر تقی میر نے بالکل اسی مضمون کو ذرا سی تبدیلی سے ادا کیا اور پہلے مصرع
میں گناہ کے لفظ کو لا کر لطف کو دو بالا کر دیا۔ شعر ہے۔

پیار کر کے کا جو خوبان ہم یہ رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی تو پاؤ چھتے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے۔
دوسری جگہ اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

ٹھہرے ہیں ہم تو مجرم ہمک پیار کر کے تم کو
تم سے بھی کوئی بوجھ تم کیوں ہوئے پیارے
میر صاحب کا شعر ہے۔

دین و مذہب عاشقوں کا قابل پریش نہیں
یہ ادھر سجدہ کریں ابرو جدھر اس کی ہے
خواجہ میر درد نے بالکل اسی مضمون میں ذرا سی تبدیلی کر کے مضمون کو اور زیادہ

نکھار دیا۔ ان کا شعر ہے

ہم جانتے نہیں ہیں اے درد کیا کعبہ جیدھڑے وہ ابرو اور دھرمناز کرنا
اردو غزل میں غالب جدت ادا کا امام ہے۔ تیر اور مومن بھی لفظوں
پر قدرت رکھتے ہیں لیکن غالب انھیں فاتحانہ انداز میں برستا ہے۔ ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ گویا وہ جن لفظوں کو برت رہا ہے وہ اسی کے لئے بنے ہیں۔

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب

شعر خود خواہش آن کر دکھ گرد و فن ما

باوجود تیر صاحب کی استادی کو ماننے کے غالب کو خود بھی اپنی خوش ادائی
کا احساس ہے اور وہ جانتا ہے کہ جو حسن ادا اس کے کلام میں ہے وہ اردو
کے کسی اور شاعر کے یہاں موجود نہیں۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

اردو میں مرزا کی غزل میں رمزی اور ایمائی انداز بیان اپنے کمال پر پہنچا۔
ذوق کی رسمی معاملہ نگاری کے سمجھنے والوں کے لئے یقیناً غالب کا کلام
سمجھنا دشوار ہوا ہو گا جس نے اپنی ابتدائی شاعری میں بیدل کا تفتح کیا تھا۔
چنانچہ انھیں لوگوں کی خیالی پستی کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا ہے۔

مشکل ہے زبں کلام میرا دل سن سن کے اسے سخنوران کا بل

آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمایش گویم مشکل و گونہ گویم مشکل

سطحی علم و نظر رکھنے والے نکتہ چینیوں کے جواب میں اس کو کہتا پڑا۔

نمائش کی تنانہ صلے کی پروا گر نہیں ہے مے اشعار میں مہنی زہنی

گر خاموشی سے فائدہ اٹھائے حال ہے خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

بیدل کے متبع کا زمانہ بہت جلد ختم ہو گیا اور مرزا نے اپنے ندرت بیان اور جدت تخیل کے لئے اپنا علمزدہ طرز ایجاد کیا جو اس کے لئے مخصوص رہا اور آج تک کوئی اس کی پیروی نہ کر سکا۔ اس طرز نے مرزا کو اردو زبان کا عظیم المثال اور کامل شاعر بنا دیا۔ مرزا نے آخری زمانے میں اس طرز کے غریب اور تفصیل الفاظ اور پچیدہ ترکیبوں سے احتراز کیا لیکن مضمون کا رمزی اور طلسمی شکل باقی رہا۔ یہ اشکال مضمون کے اچھوتے پن ایمانی اسلوب بیان کا لازمی نتیجہ تھا اس کے علاوہ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مرزا صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ حکیم، محکمہ دان بھی تھے۔ انھوں نے تغزل میں حکمت و فلسفہ کو بڑی خوبی سے سمجھا اور اس طرز زندگی کی بصیرتوں میں اضافہ کیا۔ مرزا کی ان غزلوں کو بھی جن کوئی شکل لفظ نہیں آتا ہر ایک نہیں سمجھ سکتا۔ انھیں سمجھنے کے لئے ایک خاص علوئے ذوق و اعتیاز اور علمی بصیرت درکار ہے جس کی کاوش و کماہل کے بغیر رموز و معانی بے نقاب نہیں ہو سکتے۔ مرزا کا تغزل اردو زبان میں رمز نگاری کا آخری نقطہ ہے۔ وہاں صرف انھیں کی رسائی ہوتی ہے جو اس کے سمجھنے کی خاص وجدانی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس کے ہسل متبع کی ایمانی کار فرمائوں میں رموز و معانی کی گہرائی برقرار رہی اس لئے کہ اس کے تخیل کی پرواز کا انداز ہی نرالا اور اچھوتا تھا۔ اس کی نواہائے راز کو محرمان باز ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اپنی رمز نگاری کی جانب کیا خوب اشارہ کیا ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردے ساز کا
غائب نے عامیاء خیالات اور متبذل محاوروں سے ہمیشہ احتراز کیا اگرچہ اس نے رعایت نفی سے اپنے کلام کے حسن کو دو بالا کیا لیکن اس باب میں بھی اس کی راہ دوسروں سے الگ رہی۔ ایک لطیفہ مشہور ہے کہ کسی نے اس شعر کی بہت تعریف کی اور اسد شاگرد سودا کا یہ شعر پڑھا۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی مرے شیر شاہش رحمت خدا کی

اسد کے تخلص کی وجہ سے دھوکا ہوا کہ یہ شعر شاید مرزا کا ہوگا۔ مرزا شعر کو سن کر
برا فروختہ ہوئے اور کہنے لگے ”اگر یہ کسی اور اسد کا شعر ہے تو اس کو رحمت
خدا کی اور اگر مجھ اسد کا شعر ہے تو مجھے لعنت خدا کی“

لیکن مرزا غالب نے حسن ادا کو چھکانے کے لئے جہاں مراعات لفظی برتی ہیں
وہاں شعر کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

پھر مجھے دیدہ تریا د آیا	دل جگر تشنہ فریا د آیا
دم بیا تھا قیامت نے تنور	کیوں تو وقت سفر یا د آیا
سادگی ہائے تمنا یغی	پھر وہ نیرنگ نظر یا د آیا
زندگی یوں بھی گزری جاتی	کیوں ترا را گذریا د آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی	گھر ترا خلد میں گریا د آیا
پھر ترے کوچہ کو جاتا خیال	دل گم گشتہ مگریا د آیا
گوئی ویرانی سی ویرانی ہے	دشت آلود بیکھ کے گھریا د آیا
میں نے مجنوں پر لڑکین میں اسد	سنگ اٹھایا تھا کہ سر یا د آیا

اس غزل کے ہر شعر میں لفظی اور معنوی رعایت موجود ہے لیکن تصنع نام کو نہیں۔
ہر لفظ اپنا مقام رکھتا ہے اور کس خوبی کے ساتھ رمز و کنایہ سے ہم آہنگ ہے۔
پوری غزل ایمانی تاثیر میں رچی ہوئی ہے۔ روانی کا یہ عالم ہے کہ ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ لفظ معافی کے لئے اور معافی لفظوں کے لئے بنے ہیں۔ یہ تغزل
کا کمال ہے۔

مندرجہ ذیل غزل میں کوئی لفظ مشکل نہیں لیکن مرزا کے اچھوتے طرز ادا نے
معمولی لفظوں کو بے پناہ تاثیر و قوت اور وسعت عطا کر دی ہے۔ ظاہر ہے کہ
اس غزل کا اشکال لفظی نہیں رمزی ہے۔

نہ گل نمٹے ہوں نہ پردہ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرایش حشم کا کل میں اور اندیشہ ہائے اور دراز

لاف تمکین فزیب سادہ دلی ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز
ہوں گرفتار الفت صیاد و راز باقی ہے طاقت پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے ناز کھینچوں بجائے حسرت ناز
مرزا کے نعروں میں حقیقت جمالی کا انکشاف مختلف پیرایوں میں
ہوا ہے۔ اس کے کلام میں ہمیں حسن و عشق کی واقعہ نگاری اور اس کے
سارے لوازمات ہیں، انہیں رندانہ جہازوں کی بلند آہنگیاں اور شوخی
ہیں اور کہیں رموز حیات کی حکیمانہ تعبیر و توجیہ۔ مرزا کے ہاں داخلیت اور
خارجیت دونوں ایک دوسرے میں سموی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس نے
اس باب میں انتہا پسندی سے پرہیز کیا۔ نہ ایسی دروں بینی ہے کہ غیر خود
کا وجود ہی نہ رہے اور نہ ایسی خارجیت ہے کہ جس کی وجہ سے اپنی ذات
کے اندرونی تجربوں اور تاثرات کی دنیا بے رنگ و بو ہو جائے۔ خارجیت
جب غزل میں برتی جاتی ہے تو محبوب کے ضد و خال چال ڈھال زلف و رخسار
اور قد و قامت کے بیان میں شاعر اتنا مہمک ہو جاتا ہے کہ داخلی زندگی
کے احوال پیش کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ مرزا غالب کی خارجیت جرأت
ناسخ اور لکھنؤ کے دوسرے شاعروں کی خارجیت سے بالکل مختلف ہے
رمزی اثر آفرینی کی وجہ سے اس میں اندرونی تجربہ کی جھلک ہمیشہ برقرار
رہتی ہے۔ اسی طرح مرزا کی درون بینی میں اگرچہ بعض جگہ ماورائیت
پائی جاتی ہے لیکن بالعموم وہ اپنے مجازی رنگ کے باعث اسی دنیا کی
چیز معلوم ہوتی ہے۔ چاہے مضمون کچھ ہی ہو مرزا کے لب و لہجہ کی مسامت
اور سنجیدگی، لفظوں اور بندشوں کی موزونیت اور رمزی اثر آفرینیاں دلوں
کو تسخیر کئے بغیر نہیں رہتیں۔ بعض دفعہ انسان حسرت میں پڑ جاتا ہے کہ
سیدھے سادھے لفظوں میں یہ تاثیر کہاں سے آگئی۔ مرزا غالب کے ہاں
جذبہ وجدان اور تخیل کا ایسا لطیف امتزاج ملتا ہے کہ اردو کے کسی اور

شاعر کے یہاں اس کی نظیر نہیں۔ غزلوں میں سب ہی بحریں برتی گئیں ہیں لیکن کہیں بھی موسیقیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا کہ شعر کا جادو اسی سے جگایا جاتا ہے۔

حسن و عشق کی داستان سرائی میں غالب نے تصنیف سے احتراز کیا۔ صنائع و بدائع ویسے بھی اس کے کلام میں کم ملتے ہیں لیکن واقعہ گزاری میں ان سے اور بھی بچنے کی کوشش کی ہے۔ اگر کہیں کوئی سنفٹ یا رعایت آگئی ہے تو وہ بالکل فطری معلوم ہوتی ہے اور ذوق کہیں بھی انگشت نمائی نہیں کر سکتا واقعہ گزاری کے ضمن میں دوسرے شاعروں کی سی معاملہ بندی کی توقع مرزا سے نہ کرنی چاہیے۔ اس باب میں بھی اس کا انوکھا پن اور اچانک نمایاں ہیں۔ تحسین حسن اور حقیقت محبت کو بڑی دقیقہ سنجی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ عشق و حسن کے سارے نازک پہلوؤں پر ترزا کی نگاہ پڑی۔ چنانچہ کہیں عجز و نیاز کا اظہار ہے تو کہیں دامن محبوب کو حریفانہ کھینچنے کی دعوت دے دیتا ہے۔ عجز و نیاز سے تو آیا وہ راہ پر دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچنے ایک اور جگہ محبوب کے دامن کو کھینچنے کا ذکر کرتے ہوئے اپنے گریبان کی طرف بھی بلوغ اشارہ کر رہا ہے۔ خود بالکل معصوم بن کر اپنے ہاتھوں کو بے اعتدال کہتے ہیں کہ انھیں کسی طرح نہیں پڑتا۔ ان کی کھینچا تالی کی عادت نہیں جانی کبھی میرے گریبان کو چاک کرنے کے رہے ہیں اور کبھی جانائے کے دامن کو کھینچتے ہیں اس شعر میں فی تنزل اپنے ساری شوقیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں کہ خدا شرمائے ہاتھوں کو رکھتے ہیں تاکہ میں کبھی میرے گریبان کو کبھی جانائے کے دامن کو جذبہ رشک کی عجیب و غریب توجیز نہ کرتے ہیں۔ رشک دوسروں سے زیادہ خود اپنی ذات سے ہے۔

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے مرنے ہیں دے ان کی تمنا نہیں کرتے دوسری جگہ اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پر رشک آجائے ہے
 میں اسے دیکھوں بعد اکب مجھ سے دیکھا جائیگا
 باوجود محبت کی مایوسیوں کے مرزا پُر امید رہتے ہیں۔ ان کے کلام میں
 محبت اور امید دو توں پہلو پہلو نظر آتی ہیں۔ کہتے ہیں
 اس لب سے لہ ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں

شوق فضول و جرات زندانہ چاہیئے
 معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بعض اوقات جرأت زندانہ آہ و بکا کے مقابل میں
 حصول مدعا کے لئے زیادہ مدد و معاون ہوتی ہے۔ فریاد کی بے اثری کے متعلق کہتے ہیں۔
 وفائے دلبرن ہے اتفاقی ورنہ بے ہدم
 اثر فریاد و دہائے حزن کا کس نے دیکھا ہے
 دوسری جگہ اسی مطلب کی طرٹ اس طرح اشارہ کیا ہے۔

کس نے دیکھا نفس اہل وفا آتشِ نیر
 کس نے پایا اثرِ نالہ و دہائے حزن
 چاہئے وفا اتفاقی ہو یا نہو لیکن ایک لگاؤ ہمیشہ باقی رہنا چاہیئے۔ محبت
 نہیں تو عداوت ہی سہی۔ بغیر لگاؤ کے زندگی دو بھر ہو جائے گی
 وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
 مجھے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو
 پھر کس سادگی اور پُرکاری سے اس مطلب کو ادا کرتے ہیں۔

قطعِ مجھے نہ تعلقِ ہمس سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
 ہم بھی تسلیم کی خورِ ایل گے بے نیازی تری مادت ہی سہی
 یا رے چھیڑ چلی جائے اسد گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی
 کبھی آرزو اس لئے کی جاتی ہے کہ ناکامی کی حسرت سے دل لذت اندوز ہو۔
 طبع ہے شاق لذت ہائے حسرت کیا کرو آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

اسی بات کو دوسرے پیرایہ میں یوں کہتے ہیں۔

ہوں میں بھی تماشا فی نیرنگ تما

مطلب نہیں کچھ اس کے مطلب ہی برآوے

معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنی تما کا سفر کسی منزل پر ختم نہیں کرتا۔ جب ایک منزل پر پہنچ جاتا ہے تو آگے کی منزل کی روشنی اسے دور سے نظر آنے لگتی ہے اور وہ اپنا قدم اس طرف بڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ اس بلند اور حکیمانہ مضمون کو اس خوش اسلوبی اور سادگی سے ادا کیا ہے کہ حکمت و نغمہ ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔

ہے کہاں تما کا دوسرا قدم یارب ہم نے دشت امکان کو ایک نقش پایا
جس منزل پر پہنچ گئے وہ نقش پایے رہرو کے محاش ہو گئی۔ جب نقش کی طرح اس میں خمود ہے تو دل اس پر کیسے رنجھے۔ دل تو دائمی حرکت چاہتا ہے۔ کس خوبی سے سوال کرتے ہیں کہ دشت امکان جب نقش پاکے مثل ہے تو اب تما دیکھو اپنا دوسرا قدم کدھر بڑھاتی ہے؟ تما کے لئے دشت امکان کے علاوہ اور دوسرے بہت سے جہاں ہیں جن کی تسخیر اس کا مقصود و مقصد ہے اور جہاں اسباب و علل کی دنیا کی طرح مجبوریاں نہیں۔

غالب کے کلام کا بیشتر حصہ مجاز کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ لیکن اس مجاز سے حقیقت کا دامن نکلا ہوا ہے۔ یہ بھی رمز نگاری کا کمال ہے کہ سامع حقیقت اور مجاز کے دونوں پہلو اپنے ذہن کے مطابق کلام میں سے ڈھونڈ نکالے اور اس سے لطف اندوز ہو۔ کبھی خاص حالات میں ایک پہلو مزہ دیتا ہے اور دوسرے حالات میں اسی شعر کا دوسرا پہلو لذت یہم پہنچاتا ہے۔ سعدی حافظ اور دوسرے غزل کے اساتذہ کے کلام میں بھی آپ یہ صفت پائیں گے جس کے باعث ان کے کلام کی ہمہ گیری آج تک مسلم چلی آتی ہے۔ غالب کے یہاں بھی عشق مجازی کی شورش اور

مستی اور عشق حقیقی کا جذب و عرفان بدرجہ اتم ملتا ہے۔ دونوں صورتوں میں
تحلیل اور اصلیت ایک دوسرے سے وابستہ و آپوستہ رہتے ہیں۔ اُس کی
دنیا ئے خیال میں تنوع ہے، اس لئے کہ اس کا اندرونی تجربہ نہایت وسیع
ہے۔ حقیقت کے اس پہلو کو جو نامعلوم اور غیر مرئی ہے اور جس کا احساس
صرف وجدان کر سکتا ہے غالب نے رمز و کنایہ کی زبان میں بیان کیا
چنانچہ اس طرف یوں اشارہ کرتے ہیں۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفت گو

نتی نہیں ہے بادہ و ساغر کے بغیر

غالب کی اس ہمہ گیری میں اس کی عظمت مضمر ہے۔ لیکن بعض جگہ نہایت
واضح طور پر مجازی سے گفتگو کی ہے۔ اور اس میں بھیج جان کر کے حقیقت
کے پہلو کا نا ذوق سلیم کے لئے گراں ہے۔ مثلاً یہ شعر سوائے مجاز کے اور
کوئی پہلو اپنے اندر نہیں رکھتے۔ لیکن ان میں آپ کہیں عریانی یا ابتذال
کا نشان تک نہ پائیں گے۔

آئینہ دیکھ اپنا سامنے لے کے رہ گئے صاحب کو دل نہ دینے پر کتنا غور تھا

نظر لگے نہ ہمیں اس کے دست و بازو کو یہ لوگ کیوں مے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

کیونکہ اس بت سے رکھوں جان عزیز کیا نہیں ہے مجھے ایمان عسزیر

گرچہ ہے طرز تغافل پر وہ دار راز عشق پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہی
اسی مضمون کا مومن خاں کا شعر بھی خوب ہے۔

کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرائے کھوئے گئے ہم ایسے کا غیار پاس گئے

غالب کے واقعہ گذاری کے چند اور شعر ملاحظہ ہوں جن کی خوش ادائی پر بلاغت بقنا ناز کرے کم ہے۔

ذکر اس پری و ش کا اور پھر بیان اپنا بن گیا رقیب آخر تھا جو رادواں اپنا
مئے وہ کیوں بہت پیٹے بزمِ غیر میں یارب آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا لاکھوں بناؤ ایک بگردِ ناعتاب میں
ہجر و انتظار کی کیفیات غزل گو شاعروں کا ایک عام اور پیش پا افتادہ مضمون
ہے جسے غالب نے اپنے ندرت بیان اور حسن ادا سے بالکل دوسرے ہی
پیرائے میں پیش کیا ہے۔

تا پھر ز انتظار میں یمند آئے عسبر بھر
آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے خط ایک اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
انتظار اور تمنا کو کس خوبی سے آغوش و آغوش کیا ہے۔

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں بے خدا افسون انتظارِ متنا کہیں جسے
محبت بیکر انتظار و متنا ہے۔ آرزو جب تک پوری نہ ہو اس وقت تک انتظار
کی زحمت گوارا کرنا محبت کے آداب میں داخل ہے۔ محبت کی فطرت میں صبر
و انتظار کے عناصر موجود ہوتے ہیں تاکہ وہ اپنی تکمیل کر سکے۔
دوسری جگہ انتظار کے مضمون کو اس طرح باندھا ہے۔

سچ آ پڑی ہے وعدہ دلدار کی مجھے وہ آئے یا نہ آئے یہاں انتظار ہے
تجربہ کو کس خوبی سے سمجھاتے ہیں کہ میرا نالہ شکوہ بیدار نہیں بلکہ تقاضا ہے
ستم ہے تو غلط مت سمجھ۔ یہ شعر رمز نگاری اور واقعہ گذاری دونوں کا اعجاز
ہے۔ کہتے ہیں۔

نالہ جز من طلب اے ستم ایجاد نہیں ہے تقاضائے جفا شکوہ بیداد نہیں
 اسی مضمون کو دوسرے طور پر یوں بیان کیا ہے۔
 گو سمجھتا نہیں پر حسن تلافی دیکھو شکوہ جو رے سرگرم جفا ہوتا ہے
 شکوے شکایت کے مضمون کو مختلف انداز سے اس طرح بیان کرتے ہیں۔
 پڑھوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا

اک فوراً پھیرے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے
 اسی خیال کو دوسری جگہ یوں باندھا ہے۔
 ہوں سراپا ساز آہنگ شکایت کچھ نہ پوچھ
 ہے ہی بہتر کہ لوگوں میں نہ پھیرے تو مجھے

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو

حذر کرو مرے دل سے کہ اسیں آگ دہی ہو
 محبوب جب خصوصیت کے ساتھ پردہ کرتا ہے تو اس کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ
 ایسا کرنا چھوڑ دو ورنہ خواہ مخواہ لوگوں کو اس طرف متوجہ ہونے کا موقع ملے گا۔
 دوستی کا پردہ ہے۔ یہ گمانگی منہ چھپانا ہم سے چھوڑا جائیے
 جب وہ پردہ نہیں کرتا اور سامنے آتا ہے تو نظارہ کی تاب نہیں۔
 کبھی خود نظارہ کرنے والی نگاہیں رخ جانان پر بکھر کر پردہ بن جاتی ہیں۔
 کبھی بہار کی زنگارنگی حجاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور کبھی نمود حسن
 برق نظارہ سوز بن جاتی ہے۔ کہتے ہیں۔

نظارہ نے بھی کام کیا وہاں نقاب کی مستی سے ہر نگاہ رے رخ پر بکھر گئی

نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا جوش بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

لے کم و بیش اسی مضمون کو ہتھرنے بھی بڑے دل آویز طریقہ پر ادا کیا ہے۔
 تھیں خود نمود حسن میں شائیں حجاب کی جھکو خبر رہی نہ رخ بے نقاب کی

انکامی منجگاہ ہے برق نظارہ سوز تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
غرض کہ عجیب شاعرانہ کشمکش ہے۔ اگر محبوب پر وہ کرتا ہے تو وہ ناگوار ہے مگر وہ
پر وہ نہیں کرتا تو اب نظارہ نہیں۔ تنافل کا لگا کر کے گئے اور اس نے ذرا
توجہ کی تو ایک ہی منجگاہ میں فنا ہو گئے۔

کرنے گئے تھے اس سے تنافل کا ہم محم کی ایک ہی منجگاہ میں فنا ہو گئے
کبھی عشق کی منجگاہ کرم نقاب حسن کے سب بند ایک ایک کر کے کھول دیجی
ہے۔ سب پر دے اٹھنے پر حال کو یہ شکایت باقی رہتی ہے۔ بے کہ منجگاہ کا پردہ سب
بھی باقی رہ گیا۔

دا کر دینے میں عشق نے یہ تھا سب حسن تیار نہ منجگاہ سب کوئی عامل نہیں رہا
کبھی نظارہ کی تاب لگتا ہے لیکن اور نہ طلب کے لئے زبان بند ہو جاتی ہے
پریا، نہ کہ آستہ بول سکتے ہی نہیں۔ غالب نے بہت جھگڑا ہے مگر یا اللہ
شوق وصل اور شکوہ ہجران کا مفصل ذکر کرنے کی خواہش دل ہی دل میں ہے
مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوہ ہجران
خدا وہ دن کرے اُس سے کہ میں یہ بھی کہوں وہ بھی
غالب کے طرزِ اداسی، بلا کی شوخ نگاری ملتی ہے جس کی نظرِ اردو کے کسی اور سے

لے اس جلوہ گاہِ حسن میں چھایا ہے ہر طرت
حیران منجگاہ سے حسرتِ جمال یار
لے اسی معنوں کے تیرے متعدد شعر ہیں۔
کہتے تھے کہ یہ کہتے وہ کہتے مرودہ آتا
کہتے تھے اس سے ملے تو کیا کیا نہ کہتے تیرے
جی میں غما اس سے ملے تو کیا کیا نہ کہتے تیرے
دل میں کتنے مسودے تھے تیرے

ایسا حجاب چشمِ نقاشا نہیں ہے راضی
تھا پردہ حجاب میں گوبے نقابِ نقاشا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ ہی نہ کہا جاتا
وہ آگیا تو سامنے اس کے نہ آئی بات
بب ملے تو وہ گئے ناچار و بچہ کو
ایک پریشی اس کے تیرے دہانیاں

شاعر کے یہاں نہیں۔ یہ شوخی عشقیہ مضامین تک محدود نہیں بلکہ دوسرے مسائل کو بھی بڑی خوبی سے مس کرتی اور ان کے متعلق ہماری بصیرتوں میں اضافہ کرتی ہے۔ شوخی اور البیلاپن داغ کے یہاں بھی ہے لیکن اس میں بعض جگہ خفیف سوقیانہ پن آگیا ہے۔ غالب کی شوخی کا معیار بہت بلند ہے اور اس کے طرزِ اداس نے اس بلند کی میں خاص دلکشی پیدا کر دی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہئے غیرے تہی سن کے ستمِ ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یو

جاتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر جمیعتِ ادھر نہیں آتی

زنہ گئی اپنی جب اس صبح سے گذرنا ہے ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ حذر رکھتے تھے

چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی سائل ہوئے تو عاشقِ اہل کرم ہوئے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہر لحظہ نگاہ جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہر

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہر وقت عزیز سوائے بادۂ تکلفِ ام شک ہو گیا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

جس میں لاکھوں پس کی حوریں ہوں ایسی جنت کا کیا کرے کوئی

طاعت میں تار رہے نہ سئے انگلیں کی لاس دو فوج میں ڈال دو کوئی لے کر رشتہ کو

رندانہ مضامین میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے لیکن اس کے ساتھ متانت اور سنجیدگی کو بھی قائم رکھا ہے۔ اس طرح شعر کی نزاکت اور باریکی اور زیادہ اجاگر ہو جاتی ہے۔
جب میکدہ چھٹا تو چہرہ کیا جگہ کی قید مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

کیوں روقدح کرے ہے زاہد سے ہے یہ مگس کی تے نہیں ہے

واعظ نہ تم بیونہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمہاری شراب ٹھور کی

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے یہ بے گم کہ کم ہے بے گلفام بہت ہے
کہتے ہوئے ساتی سے جیا آتی ہے ورنہ ہے یوں کہ مجھے دردِ تہ جام بہت ہے
یعنی دیسے تو میرے لئے پیمت ہی کافی ہے لیکن یہ بات ساتی پر ظاہر کرتے ہوئے
شرم آتی ہے کہ کہیں وہ نہ سمجھے کہ کیسا کم حوصلہ آدمی ہے۔
اس شعر کا اطلاق حقیقت اور مجاز دونوں پر ہو سکتا ہے۔

منا ترا اگر نہیں آسان تو سہل ہے دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
یعنی ترا منا اگر دشوار ہوتا تو ہم مایوس ہو جاتے اور تیری جستجو ترک کر دیتے
لیکن طبری دقت یہ ہے کہ نہ دشوار ہے اور نہ سہل۔ یہ احساس کہ تیرا منا
دشوار نہیں ہے شوق کو مروتہ نہیں ہونے دیتا اور یہ احساس کہ آسان نہیں
ہے سہی آرزو کے لئے ہمیں زکا حکم رکھتا ہے۔

غالب نے اپنے حکیمانہ انداز کے اشعار میں بھی طرزِ ادا کی جدت سے
تغزل کی خوبیوں کو قائم رکھا ورنہ یہی مضمون بالکل روکھے پھیکے ہو جاتے
اس کے کلام میں واعظانہ مقدمات نہیں ملتے۔ ہاں حکمت و اخلاق کے

مسائل کو رعب و دینامی کی زبان میں ادا کیا۔ ہے۔ چنانچہ بسج جگہ اس کی شاعری خالص
تصورات کی شاعری بن گئی ہے جس کو لطافت اور دل نشینی کی رنگ آمیزی نے
پارچاند لگا دیے ہیں۔

قبیلہ مقصود بالذات نہیں بلکہ محض قبلہ نما ہے مقصود و منتہا کی طرف
اس سے رہبری ہوتی ہے اور بس۔

ہٹ پر سے سرحد ادراک کے اپنا مسجود قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

لنرت آرائی و صحت ہے پرستاری و ہم کردیا کافران اسنام خیالی نے یہ

ہاں اہل طلب کون سے طعنے نایافت دیکھا کہ وہ مٹا نہیں اپنے ہی کو کھڑکے

طاعت میں تارہندے و نگین کی لگا رہ تیغ میں ڈال دو کوئی نے کر بہشت کو
حکمانہ رموز و اسرار کا کس خوبی سے انکشاف کیا ہے۔

عشرتِ قعر و دریائیں فنا ہو جانا ورد کا حد سے گذرنا ہے دو اہو جانا

ص۔ جھو رو رہے جو شرکان اٹھائے طاقت کہاں کہ دید کا احسان اٹھائے

منگنی دل کا گلہ کیا کہ وہ کافر دل ہے کہ اگر تنگ نہوتا تو پرستیں ہوتا

جدا ہوں تھوڑی دو بہر اک پتھر و کے ساتھ

پہچانتا نہیں جوں ابھی۔ اہر کو میں

قطر اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ہم کو تھلید تنگ ظرفی مسطور نہیں

دو نوں جہاں دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہہ شدم کہ تکرار کیا کریں

حد سے دل اگر افسردہ ہے گم تماشا ہو
کراچشم تنگ شاید کثرت نظارے وا ہو

وفاداری بشرط استواری اصل ایمان سے
مرے بت خانے میں تو بکے میں گاڑو برہمن کو

بے اعتدالیوں سے ہر سب میں ہم ہوئے
جتنے کڑیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

چمن میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشاں کیوں ہو

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشاں کے لئے
مرزا غالب کے کلام کی اصلی خوبی ان کے طرز ادراکی جدت اور انوکھا پن
ہے۔ انھیں معمولی بات بھی اگر کہنا ہے تو اپنے خاص رنگ میں کہتے ہیں
جو جذبہ کی تاثیر اور خیال کی دل کشی میں رچا ہوا ہوتا ہے۔ الفاظ کی بندش
میں اور تیشہوں اور استعاروں کے استعمال میں عام ڈگر سے ہٹ کر بہت
علوہ راہ اختیار کی ہے اور ضرورت کے وقت نقلی اور معنوی تصرفات سے
بھی کام لیا ہے۔ وہ اپنے اسلوب بیان کے خود موجد ہیں۔ ان کے مضامین

اور استعاروں کا اچھوتا پن ان کی شاعرانہ بصیرت پر دال ہے۔ بعض جگہ قدما کے مضمون میں تعجب انگیز نزاکتیں پیدا کر دی ہیں۔ دراصل کوئی مضمون کسی کی ملکیت نہیں ہوتا۔ جو اس کو دل نیش انداز میں باندھ دے وہ اسی کا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ غالب نے جب کبھی دوسرے استادوں کے مضمون مستعار لئے ہیں تو ان میں اپنے بیان کے پیرائے سے کوئی جدت ضرور پیدا کی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ طلب ہیں سعدی کا شعر ہے۔

یا وفا خود بنو و در عالم یا مگر کس دریں زمانہ نکرو
اسی مضمون کو مرزا نے اپنے حسن ادا سے اور بلند کر دیا۔

دہر میں نقش و قافو جہ تسلی نہ ہوا ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا
خسرو کا شعر ہے۔

جانان اگر شبیت دہن بردہن ہم خود را بخواب ساز و لگوئیں دہان کست
غالب اسی مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں۔

ہم سے کھل جاؤ یہ وقت ہے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھڑیں گے رکھ کر نذر مستی ایک دن
خسرو کا دوسرا شعر ہے۔

ز بے غم دراز عاشقان گر شب ہجران حساب عمر گیسر
غالب کہتے ہیں۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گہ حساب میں
اس میں شبہ نہیں کہ خسرو کے شعریں ایسا و اجمال کی جو خوبی ہے وہ غالب کے
شعریں نہیں۔ اس نے غیر ضروری تفصیل اور توضیح سے کام لیا جو خسرو کے
ہاں نہیں۔

خسرو کا ایک اور شعر ہے۔

اے گل جو آدمی زہ میں گوجھو نہ اند آں رویہا کہ در ہتہ گرد فنا شدند
میر تقی میر نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

ہر قطعہ چمن پر نگہاں کر نظر کر بگر میں ہزار شعلیں تب بچوں یہ بٹائے
غالب نے اس مضمون کو کہاں سے کہاں بنیادیا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا سورتیں مں گی کہ نہاں ہو گئیں
خسرو کا شعر ہے۔

جرات جگر خستگان چہ می پرسی ز غمزدہ پرس کہ اس شوخی از کجا آخت
غالب نے اسی خیال کو اور زیادہ شوخ کر دیا۔

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو یہ نگ کہیں مرے زخم بگڑ دیکھتے ہیں
حافظ دنیا کے غزل کا سب سے بڑا اداکار ہے اس کا تغزل بے مثل ہے۔ اس

کے مقابلے میں کسی دوسرے کو نہیں لایا جاسکتا۔ تاہم یہاں چند ہم مضمون شعر
پیش کئے جاتے ہیں جنہیں پہلے حافظ نے باندھا اور اس کے بند غالب نے

ان پر طبع آزمائی کی۔ حافظ کی متقیص مقصود ہمیں صرف یہ دکھانا ہے کہ قدیم
اساتذہ نے جو مضمون غزل میں باندھے ہیں ان میں بعض اوقات دُرُاسی تبدیلی

کر کے متقدمین نے اور لطافت میں اضافہ کر دیا اور سن ادا سے وہ مضمون گویا
انہیں کا ہو گیا۔ اس طرح پُرانے سے پرانے مضمون میں بھی اچھوتا

پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جدت ادا سے اس پر نئی چھاپ پڑ جاتی
ہے۔ اساتذہ غزل کے چند شعروں کا غالب کے شعروں سے اسی نقطہ نظر

سے مقابل کیا جاتا ہے۔ حافظ کا شعر ہے۔
آفرین بردل نرم تو کہ از پیر ثواب کشہ غمزدہ خود را بہ نسل آمدہ

غالب نے تھوڑے سے تصرف سے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے تو یہ

ہائے اس زود پشیاں کا پشیاں ہونا

بلاشبہ غالب کا شعر حافظ کے شعر سے بڑھ گیا ہے۔ دود پشماں کی ترکیب میں ایک جہان معنی پوشیدہ کر دیا ہے اور اس لفظ میں طنز کس غضب کا ہے کہ جسے بیان نہیں کیا جاسکتا صرف غموس کیا جاسکتا ہے۔ حافظ کا شعر ہے۔

من کہ حول گشتی از نفس زشتگان قال و مقال ملے میکشم از برائے تو
غالب کا شعر حسن اور تاثیر میں حافظ کے شعر سے کم نہیں۔ کہتے ہیں۔
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پلستند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

عرفی کا شعر ہے
نالہ می کشم بند درد تو گاہے لیکن تا لب می رسد از ضعف نفس می گرد
غالب نے اسی مضمون میں کیا خوب تراکت پیدا کر دی۔
تالے عدم میں چند ہمارے سیر دتے
جو واں نہ کھینچ سکے سو وہ یاں آکے دم ہو
فیضی کا شعر ہے۔

نوش داروے محبت را بر سر اجزا کہ صیبت
سودہ الماس در زہر ہلاہل می کنند
غالب نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا۔
خوبیہ نسخہ امر ہم جراحت دل کا کہ اس میں ریزہ الماس جزو اعظم ہے
میر تقی میر کا شعر ہے۔

عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں
لگ اٹھی آگ ناگاہی کہ گھر سب پھک گیا
بیر صاحب کے شعر میں ذوق شری کوئی گور کسر نہیں کمال سکتا۔ لیکن غالب نے
اپنے اعجاز بیان اور حسن اور اسے مضمون کو اور زیادہ بلند کر دیا۔ وہ اسی بابت

کو یوں کہتا ہے۔
دل میں شوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
میر صاحب کا شعر ہے۔

آوے گی اک جاترے سرس لے اے صبا زلفِ سیہ کا اس کے اگر تار جابجگا
غالب نے اسی مضمون میں ذرا سی تبدیلی کر کے اس کو اور زیادہ بلند کر دیا۔

کہتے ہیں تھے سن لے موجِ صبا بل تیرا اسکی زلفوں کے اگر بال پریشان ہو گئے
میر صاحب کا شعر ہے۔
اس نازکی سے گذرے کس کچھ خیال میں مرجھائے پھول سے ہو جو کچھ ملے دے تم
غالب نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔
شب کو کسی کے خواب میں آیا ہوں نہیں دیکھتے ہیں آج بت نازک دن پاؤں
میر صاحب کا شعر ہے۔

سرا ہا ان نے ترا تھ جن نے دیکھا زخم شہید ہوں میں تری تیغ کے لگانے کا
میر صاحب کے شعر میں رمزِ ہیئت اتنی نمایاں نہیں ہوئی جتنی نفیس
واقعہ کی نوعیت۔ اسی مضمون کو غالب نے تھوڑی سی تبدیلی سے زیادہ بلند اور
پر لطف بنا دیا۔ شعر ہے۔

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
میر صاحب جس بات کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں غالب نے اجمال سے وہی
کام بڑی خوبی سے نکال لیا اور استہنام کے ذریعہ رمزِ ہیئت اجاگر کر دی۔
میر صاحب فرماتے ہیں۔

بھاگے مری صورت سے وہ عاشق میں اس کی شکل پر
میں اس کا خواہاں یاں تک کہ مجھ سے بیزار اس قدر

غالب کا شعر ہے۔ ہم ہیں شتاق اور وہ بیزار یا الہی یہ ماجرا کیا ہے؟
تیر صاحب کا شعر ہے۔

جب درو دل کا کہنا میں دل میں ٹھانتا ہوں کہتا ہے بن نے ہی میں خوب جانتا ہوں
غالب نے اس مضمون میں اپنی خوش ادائی سے اور نزاکت پیدا کر دی
اس کا شعر ہے۔

زہے کرشمہ کہ یوں نے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کچے ہی نہیں سب تیرے کیا کہئے؟
لفظ کرشمہ کی ایجابی اثر آفرینی ملاحظہ طلب ہے۔ شعر کا اطلاق حقیقت اور
مجاز دونوں پر بلا تکلف ہو سکتا ہے اور دونوں صورتوں میں معنی کی دلاویزی
میں کسی طرح کمی نہیں آتی۔
تیر صاحب کا شعر ہے۔

جی ہے جلے ہے تیر جو اپنا دیر کی جانب کیا کرے
یوں تو مزاج طرے کعبہ کے بہترا ہم لاتے ہیں
غالب نے اسی مطلب کو اس طرح ادا کیا ہے۔
جانتا ہوں عوایط طاعت و زہد پر طبیعت ادا نہیں آئی
تیر صاحب کا شعر ہے

بہر فردوس ہو آدم سوالم کا ہے کو وقت اولاد ہے وہ باغ تو غم کا ہے کو
غالب نے فارسی میں اسی مطلب کو اس طرح ادا کیا ہے۔
ساتی بیار بادہ کہ از دودہ جسم زان پس رسد بہشت کہ میراث آدم است
تیر صاحب نے سیدھے سادے لفظوں میں ابتدائے محبت کا نقشہ کھینچا ہے
ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا آگے آگے دیکھے ہوتا ہے کیا
غالب نے اسی مضمون کو اپنی رمز نگاری کی بدولت اور زیادہ بلند کر دیا
ان دونوں شعروں میں تیر اور مرزا کا اسلوب بیان اپنے اصلی اور نکھرے

موتے رنگ میں نظر آتا ہے۔
 رنگ و بے میں جب اترے زہر غم تب دیکھئے کیا ہو
 ابھی تو تمنیٰ کام و دہن کی آزمائش ہے
 تمنیٰ کام و دہن کی آزمائش کے بعد زہر غم رنگ و بے میں اترتا ہے۔
 اگر کوئی تمنیٰ کام و دہن سے گھبرا اٹھے تو وہ منزل عشق کے اس سفر کے
 مثل ہوگا جو سفر کے شروع ہی میں تھک کر بیٹھ جائے اور اپنا حوصلہ ہٹ
 لے۔

طرز ادا کے انوکھے پن کی ایسی مثالیں سوائے غالب کے اور کسی
 کے یاں نہیں ملتیں۔ شعر ملاحظہ ہوں۔
 نہ رخصت سے نادان کیا ہو اگر اس نے شدت کی
 ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

بہت دنوں میں خاف نے تیرے پیداکے وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

بس ہجوم امیدِ خاک میں مل جائیگی
 وہ جو اک لذت ہماری سعیِ لاحاصل میں ہے
 طرز ادا کی رمزی کیفیت کو اجاگر کرنے کے لئے بعض اوقات غزل گو شاعر
 ایسے لفظ استعمال کرتا ہے جن سے عدم تعین مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً سہی تو
 اور سہی کے لفظ۔ ان وصفی اور ترنمینی کلمات کے استعمال سے رمزی اور
 ابہامی دونوں کیفیں بڑھ جاتی ہیں اور طلسمی اثر پیدا کرتے ہیں مدد ملتی ہے۔
 میر صاحب کے دیوان میں خاصکر ان لفظوں کے استعمال کی مثالیں کثرت
 سے ہیں میں سمجھتا ہوں اردو کے کسی دوسرے شاعر نے ان لفظوں کو اتنا
 استعمال نہیں کیا یہاں چند ملاحظہ طلب ہیں۔

جب گل کہے ہے اپنے نہیں یار کے روم
تب آنکھوں تلے میرے اترتا ہے لہوسا
تعبیر جے کرتے ہیں ہنگامہ محشر
وہ یار کے کوچہ کا ہے کچھ شور غلوسا

کعبہ کی یہ بزرگی شرف سب بجائے لیکن

دنکش جو پوچھے تو کب اس آساں سے

سمجھے تو ہم تو میرے کو عاشق اسی گھڑی جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہو
(میر)

دل دفعتاً جنوں کا ہیا سا ہو گیا دیکھی کہاں وہ زلف کسودا سا ہو گیا
(میر)

جلوہ تیرا تھا جب تیں باغ و بہار تھا اب دل کو دیکھتے ہیں تو صحرایاں ہو گیا
(میر)

لطف کہاں وہ بات کئے پر پھول سے بھرنے لگ عاویں
سج کلی بھی محل کی اگرچہ یار کے محل سے ہی ہے
تم کہتے ہو بوسہ طلب تھے شاید شوخی کرتے ہوں
میر تو چپ تصویر سے تھے یہ بات انھوں سے عجب سی ہے

زندگی اپنی خواب کی سی ہے یہ نمایش سراب کی سی ہے
ماز کی اس کے ب کی کیا کہئے پنکھڑی اک محلاب کی سی ہے
میران نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے
مصحفی کے شعر ہیں۔

آج کچھ سینہ میں دل ہے خود بخود بیتاب
کر رہا ہے بے قراری پارہ یساب سا

خوں گل تر کیا ہے اس سے جھلکے ہے اس کا بدن
وہ جو پیرا ہن گئے میں اس کے ہے اک آب سا

جرات کے شر ہیں ۔

بدشت خراب اپنے قدم کی برکت سے
جتاؤں درد غربت تو کس ادا سے کہے
قدم قدم پہ بہاریں ہیں سوچن کی سی
کرد لہ مجھ کے یہ پائیں دوا پن کی سی

دل ہے پار ویاخذ اچانے کہ کیا آفت ہے
موسن خاں کے اشعار ملاحظہ ہوں ۔
نملاتا ہے پڑا پہلے میں جو سیاب سا

نہ جاؤنگا کبھی جنت میں میں نہ جاؤنگا
بشوق یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت
اگر نہ ہوئے گا نقشہ ہمارے گھر کا سا
دعا سے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا سا
خبر نہیں کہ اسے کیا ہوا پر اس پر بھی
نشان پا نظر آتا ہے نامہ بر کا سا

نرکی دہلوی کا شعر ہے ۔

وہ تو نہال خوبی نازک ہے دل باہے
عالم ہے اس کی بومیں گل کی شمیم کا سا

ذائع کے شعر ہیں ۔

عرض وفا یہ دیکھنا اسکی ادا و انفریب
پوچھتے کیا ہو گون تھا ہو وہی ذائع تھا
دل میں کچھ اعتبار سا آنکھوں میں کچھ ملال سا
نہ پہ تہا ہے تھا مگر کوئی شکستہ حال سا

فانی کے اشعار ملاحظہ ہوں

اے وہ اب میں لب پہ جو تھو کے بٹنے سے ہیں
غم ہائے روزگار سے مکن نہیں گریز
آغوش اضطراب میں سے ہوئے سے ہیں
ہجرت سے ستم میں ہوئے سے ہیں

استعارہ کی لذت سے اور کبھی مراعات نفی اور صفات کے استعمال سے بظاہر معانی کا تعین مقصود ہوتا ہے لیکن دراصل اس طرح ایمانی اثر آفرینی کی طرف ذہن کو منتقل کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں تیس تشبیہ و کنایات کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً سودا نے ان شعروں میں پہلے مجنوں اور کوہکن کا مقابلہ کیا ہے اور پھر ان دونوں کا خود اپنی ذات سے۔

سودا قمار عشق میں مجنوں سے کوہکن بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز لے۔ وسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا میر صاحب بھی اپنا مقابلہ قیس و فرہاد سے کرتے ہیں اور بڑی آنہاں سے کرتے ہیں۔

قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور اب مرے عہد میں فسانے میں اپنا مقابلہ مجنوں سے اس طرح کیا ہے۔

گزار شہر وفا میں سمجھ کے کر مجنوں کہ اس دیار میں میر شکستہ پا بھی ہے سودا نے بالکل یہی مضمون اس طرح ادا کیا ہے۔

سمجھ کے رکھو قدم دشت خاں میں مجنوں کہ اس فوج میں سودا برہنہ پا بھی ہے میر صاحب کے کلام میں مقابلے کی مثالیں کثرت سے ہیں۔ کہیں جنت کا مقابلہ کوئے یار سے کیا ہے کہیں مسجد کا دیر سے اور کہیں بجلی اور اپنے خاشاک آشیان کی مٹ بچھڑا دی ہے۔

خوبی کی اپنی جنت کیسی ہی ڈینگیں مارے اسکی گلی کا ساکن ہرگز اُدھر نہ جھانکے

مہمور شرابوں سے کہا یوں ہے برب دیر مسجد میں ہے کیا شیخ پیالہ نہ نوالا

جب کوئد فی ہے بجلی تب جانب گھٹاں رکھنی ہے چھڑیے خاشاک آشیان ہے اپنی سیرِ رباب کی لذت کا مقابلہ کرتے ہوئے چھڑا کو کس خوبی سے

خطاب کیا ہے۔ اس شعر میں مقابلہ اور نقل قول کے محاسن نے شعر کی تاثیر کو بڑھا دیا اور سادگی نے سونے پر سیاہی کا کام کیا ہے۔

کس کی ہوا کہاں کا قل ہم تو قفس میں ہیں اسیر
سیر چین کی روز و شب تجھ کو بارگ لے صبا
محبوب کی جلوہ گاہ او۔ بہشت کا مقابلہ غالب نے اس طرح کیا ہے۔

نہتے ہیں جو بہشت کی تشریف سب درست لیکن خدا کرے وہ تیری جلوہ گاہ ہو
(غالب)

اپنا اور آدم کا مقابلہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ میں محبوب کے کوچہ سے نکلنے میں جو رسوائی نصیب ہوئی وہ آدم کو بھی جنت سے نکلنے وقت نہ ہوئی ہوگی۔
نکلنا اہل بیت آدم کا سنتے آئے تھے لیکن بہشت بے آبرو ہو کر تیرے کوچہ سے ہم نکلے
(غالب)

غالب کے اور شعر ملاحظہ ہوں۔

وفا مقابل و دعویٰ عشق بے بنیاد جنون ساختہ و فصل گل قیامت سے
ایک طرف محبوب کی وفاداری ہے اور دوسری طرف عشق و محبت کا جھوٹا دعویٰ
یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی بناوٹی جنون اپنے ادب پر طاری کرے۔ جس طرح
بہار کا یہ اقتضا ہے کہ جنون سچا اور حقیقی ہو اسی طرح وفا کا یہ اقتضا ہے کہ عشق
و شوق کا دعویٰ سچا اور بنا تصنع ہو۔

وفا اور عشق بے بنیاد اور جنون اور فصل گل کی لفظی رعایتوں اور
معنوی ناسبتوں نے حسنِ ادا کے جوہر کو چمکا دیا ہے۔ ہر لفظ اپنی جگہ پر
یگانگہ کی طرح بیٹھا ہوا ہے۔ اس سے شاعر کی قادر الگائی کا انداز ہوتا ہے۔
زلف کی درازی کا مضمون بہت پرانا اور پامال مضمون ہے۔ غالب نے
اس میں عجیب و غریب ندرت پیدا کر دی۔ وہ عیب کی زلف کا مقابلہ

اس کی سرفراستی سے کرتا ہے۔ وہ محبوب کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ اگر تیری زلف گرہ گیر کے بل کھل جائیں تو وہ تیرے قدم سے بھی زیادہ دراز ہے۔ یہ جو تیری سرفراستی کی دھوم ہے اس کی حقیقت زلف کی درازی کے سامنے آشکارا ہو جائے گی۔ محبوب کے قدم اور اس کی زلف کے مقابلے نے شعر کی بلاغت کو کس قدر بڑھا دیا۔ شعر ہے۔

بہر م کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا

اگر اس طرہ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے زلف کی درازی کا مضمون جو متن نے بھی باندھا ہے۔ لیکن وہ غائب کے شعر کی بھی رمز کی کیفیت پیدا کر سکا جو زلف و قامت کے مقابلے کی وجہ سے پیدا ہو گئی۔ مومن کے شعر کو سن کر نفس واقعہ کی طرف ذہن متوجہ ہوتا ہے جس کے باعث شعر کی دلآویزی اور بلاغت کم ہو گئی۔ شعر ہے۔

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف درازیں لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا
ایک جگہ غائب نے آنکھوں اور کانوں کے باہمی رشک کا مقابلہ کیا ہے۔ اگر بھی آنکھوں کو محبوب کا نظارہ نصیب ہو جاتا تو کانوں کو رشک ہوتا کہ ہم مردہ وصال سے محروم ہیں۔ یا اگر کبھی کانوں کو مردہ وصال ملتا تو آنکھیں رشک کرتیں کہ ہم دیدار کی ہوس پوری نہ کر سکیں۔ لیکن اب آنکھوں اور کانوں کا باہمی رشک باقی نہیں رہا اس لئے کہ مدت سے نہ تو نظارہ جمالی ہی میسر ہوا نہ مردہ وصال۔ دونوں کی محرومی نے ان میں موافقت پیدا کر دی۔

مردہ وصال نہ نظارہ جمال مدت ہوئی کہ آشتی و چشم و گوش ہے
غائب نے ایک موقع پر رشک اور عقل کا تقابل اور شاعر کے کان میں دو فونی کی سرگوشیاں بٹے بنے انداز میں بیان کی ہیں اور نقل قول کی بدولت شعر کی تازگی میں اضافہ کیا ہے۔

رشتہ کہتا ہے کہ اس کا غیرے اخلاص عقل کہتی ہے کہ وہ بے ہر کس کا آشنا
یعنی رشتہ کا یہ شبہ کہ وہ انکار کے ساتھ اخلاص برت رہا ہے بے بنیاد
ہے اس لئے کہ عقل اس شبہ سے پیدا ہونے کے ساتھ چپکے سے کہہ دیتی ہے کہ
بھلا وہ آج تک کس کا دوست ہوا ہے کہ اب کبھی کا ہو گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ
شاعر عقل کی رائے کو رشتہ کے شبہ پر ترجیح دیتا ہے اور اس طرح اپنے
لئے وجہ اطمینان پیدا کر لیتا ہے۔ اندرونی غلطی کی یہ داستان کس خوبی سے
ان دو مصرعوں میں آگئی۔

قامت یار اور فتنہ قیامت کا مقابلہ ملاحظہ ہو۔

ترے سرو قامت سے ایک قد آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
کہنا یہ مقصود ہے کہ تیری سرو قامتی کے آگے فتنہ قیامت بھی سچ ہے
اس کو غالب نے اپنے مخصوص طرز بیان میں ادا کیا کہ چونکہ قامت یار بھی فتنہ
قیامت سے بنا ہے اس لئے فتنہ قیامت ایک قد آدم کی حد تک کم ہو گیا۔ جو
جتنے کم ہو گیا اسی میں فتنہ کی ساری خاصیتیں جمع ہو گئیں۔ محبوب کے قد و قامت
کی یہ ایمانی تعبیر و توجیہ خاص لطف اور شعریت اپنے اندر رکھتی ہے۔

شب فراق اور قیامت کا مقابلہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ میں قیامت کا
مکر نہیں ہوں لیکن شب اہجر کے مصائب کے آگے اس کی پریشانیاں سچ ہیں
انکار اور ثبات نے شعر میں عجب لطف پیدا کر دیا ہے۔

غالب
نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں شب فراق سے روز جزا زیادہ نہیں
اپنے گھر اور بیاباں کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جنوں میں اگر گھر
برباد ہو تو کیا خدا لگے ہے۔ بیابان کی وحشتیں تو اتنے آگئیں۔ اس طرح یہ سوجھ
کسی طرح بھی گراں تو نہیں۔ اس شعر میں اپنے گھر اور بیاباں کا صرف مقابلہ ہی
نہیں بلکہ انتخاب بھی ہے جس سے شعر کا لطف دو بالا ہو گیا۔
غالب
فیقتان نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب دو گھر زمین کے بدلے بیاباں گراں نہیں

دوسری جگہ کہا ہے کہ اگرچہ گھر کی ویرانی بھی صحرا کی ویرانی سے کسی طرح کم نہیں لیکن صحرا میں جو آسودگی نصیب ہے وہ گھر میں کہاں اہمیت کی وجہ سے دشت کی ویرانی دشت کی پرورش کے لئے زیادہ سازگار ہے۔
 کم نہیں وہ بھی خرابی میق و مست معلوم دشت میں ہے مجھے وہ عیش گھر یاد نہیں کم و بیش ہی مضمون اس شعر میں بھی بیان کیا ہے۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
 غائب نے صرف اپنے گھر اور دشت کا ہی مقابلہ نہیں کیا بلکہ محبوب کے گھر اور بہشت کا بھی اپنے خاص انداز میں مقابلہ کیا ہے اور اس ضمن میں بھی ترجیح و انتخاب کا اظہار کیا ہے۔ شعر ہے

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوئی گھر ترا خلد میں سگریا د آیا
 دوسری جگہ اسی مضمون میں عجب ندرت پیدا کی ہے۔ عام طور پر ہمارے شاعر محبوب کے کوچے کو بہشت سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن غالب نے بہشت کو کوچہ پر سے تشبیہ دی ہے۔ محبوب کا کوچہ بہشت سے اس واسطے قابل ترجیح ہے کہ یہاں عاشقوں کے جھگڑنے کی وجہ سے ہر وقت آبادی رہتی ہے برخلاف اس کے بہشت آباد فقر نہیں آتی۔ مقابلہ اور وجہ ترجیح نے شعر کی ایمانی تاثیر کو کس قدر بڑھا دیا۔ پھر مزاد ادا کی طرف کی داد نہیں دی جا سکتی شعر ہے۔

کم نہیں جلوہ گری میں تے کوئے بہشت وہی نقشہ ہے دے اس قدر آباد نہیں
 غالب کی ایک پوری غزل مقابلوں سے پر ہے جن سے معافی کی مناسبتیں بڑی خوبی سے واضح ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ مزید اودایا کی اشکال کا ظاہر ہوتا ہے۔ غزل کی ردیف آزمائش ہے رکھی ہے۔ آزمائش میں یک طرح کا معنوی مقابلہ تو خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ جب کسی چیز یا شخص کی آزمائش کرتے ہیں تو کوئی سیار ضرور سامنے رہتا ہے جس سے مقابلہ مقصود ہوتا ہے۔

قیس اور فرہاد سے اپنا مقابلہ کس بلند آہنگی سے کیا ہے۔
قدو گیسو میں قیس و کوہن کی آزمائش ہے

جہاں ہم ہیں وہاں دارورسن کی آزمائش ہے
قیس و کوہن کو قدو گیسو سے واسطہ پڑا اور ہم جس محفل میں ہیں وہاں
قدو گیسو کے امتیازات کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہاں دارورسن سے کم
پر آزمائش ممکن نہیں۔ پھر خود فرہاد کے حوصلے اور اس کی نیروئے تن کا مقابلہ
کیا ہے۔

کریں گے کوہن کے حوصلے کا امتحان آخر ابھی اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے
یعنی نیروئے تن کی آزمائش میں تو اس کی کامیابی غیر مشتبہ ہے اس لئے کہ اس
نے جوئے شیر کھود ڈالی لیکن حوصلے کے امتحان میں وہ پورا ناترا اور شیریں
کے مرنے کی خبر سن کر بدحواس ہو گیا۔

دوسری جگہ اور مرزائے فرہاد پر چوٹ کی ہے کہ تیشہ مار کر مر جانا معمولی
بات ہے۔ اس کو چاہئے تھا کہ عام رسم کے خلاف شیریں کچھ جانیے کی خبر سن کر
زندہ رہتا اور جب تک زندہ تھا اس وقت تک شیریں کے تصور کو اپنا سرمایہ
غم بناتا۔

آیت بنیر مرد سکا کوہن اسے رگشتہ و خمار رسوم و قیود تھا
پھر فرہاد کو طعنہ دیا ہے کہ اس نے رقیب کے لئے عشرت کدہ تعمیر کیا اور
خود سر بھڑ کر مر گیا۔ ہم اس کی نیکو نامی کے غافل نہیں۔
عشق و مزہ و دینی عشرت کدہ خوش کیا تو ہم کو تسلیم نیکو نامی و سر ہاد نہیں
آزمائش عالی غولی کے چند اور شرط ملاحظہ طلب ہیں۔

نیم مصر کو کیا پیر کنٹاں کی ہو خواہی اسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے
نیم مصر اور یوسف کی بوئے پیرہن کا اس طور پر ذکر کیا ہے کہ گویا دونوں ایک
ہو کرے سے الگ آئے ملتے موجود ہیں۔ کہتے ہیں کہ نیم مصر کو پیر کنٹاں سے

بھلا ہمدردی کیوں ہونے لگی؟ تو محض ضمنی طور پر تھا کہ انھیں یوسف
 کی بوئے میوہن پہنچ گئی حقیقت میں نسیم مصر تو یوسف کی بوئے میوہن کی
 آزمائش کرنا چاہتی تھی کہ اس کے لقمہ فاق کی حد کیا ہے۔
 ایک طرف محبوب کی آمد ہے اور دوسری طرف اہل انجمن کے صبر و
 شکیب کی آزمائش۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا شاعر نے صبر و شکیب کو
 آزمائش اور مقابلے کی خاطر اشخاص کی صورت دیدی ہے کہ دیکھیں ان پر
 کیا گزرتی ہے۔

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ مفاصل تھے

شکیب و صبر اہل انجمن کی آزمائش ہے
 دل وابستہ کو محبوب کی زلف پر شکن سے اس طمع دست و گھڑیاں کیا ہے۔
 پڑا لے دل وابستہ بتابی سے کہا جاوے مگر پھر تاب زلف شکن کی آزمائش ہے۔
 شاعر دل وابستہ کو خطاب کرتا ہے کہ تو خواہ مخواہ رہائی کے لئے ہاتھ پاؤں مارا ہے۔
 اس کی زلف پر شکن کے پیچ و خم ایسے نہیں ہیں کہ تو ان سے رہائی پاسکے۔
 تو پہلے بھی آزمایا جا چکا ہے اور تمنا اب پھر اس کی آزمائش چاہتا ہے۔ تیری اس
 کوشش کا نتیجہ معلوم ہے یعنی تو بھی بھی کامیاب نہ ہو سکے گا۔
 مقطع میں ایک تو استغناء انکاری کی خوبی ہے اور دوسرے معشوق کی آمد
 اور چرخ کہن کے نئے فتنوں کا مقابلہ ہے۔

وہ آئیں گے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالب

نئے فتنوں میں اب چرخ کہن کی آزمائش ہے

وہ آئیں گے یعنی ہرگز نہ آئیں گے وہ ایسے وعدے تو ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔

(۱) اسی مضمون کا مرزا کا دوسرا شعر بھی ہے

تھا اگر نیران شرہ یار سے دل تادم مرگ دفع پیکان بلا کس قدر آہاں بجا

لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ محض ان کے وعدہ کی وجہ سے ہم پر اور کون کون سی
نئی مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ ایک طرف ان کے آنے کا وعدہ ہے اور دوسری
طرف چنچ کہن کے نئے نئے فتنوں کی آزمائش۔ استفہام الکاری اور مقابلہ
دونوں کے باعث شعر کی ندرت اور حسن ادا کی خوبی نمایاں ہو گئی۔

اس قسم کے مقابلوں کی غائب کے ہاں بیسیوں شاہیں موجود ہیں اور
محاسن کلام میں گرفتار ہیں۔ ایک جگہ فارسی میں اس ضمن میں عجیب و غریب
خیال ادا کیا ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ فارسی میں اور نہ اردو میں۔
مصنوع یہ باندھا ہے کہ دعویٰ گو رضا میں ہر شخص اپنے مقصود در نہیا کی جانب
رواں دواں چلا جا رہا ہے۔ گویا کہ اس منزل میں رشک و فاکا منظر نظر آتا ہے
حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے قصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ
باپ اور بیٹا راہ شوق میں مسابقت کے لئے کوشاں ہیں۔ اگر باپ آتش غرور
کی آزمائش میں اپنے کو ڈالتا ہے تو بیٹا بھی پیچھے نہیں رہنا چاہتا۔ وہ باپ کی
چھری کے تیلے اپنا گلارہ دیتا ہے۔ شاعر دو شعروں میں رمز ایما بلاغت و
ایجاز و حسن ادا کا کمال دکھا دیتا ہے۔ شعر ہیں۔

رشک و فامگر کہ یہ دعویٰ گو رضا ہر کس چہ گو نہ در پئے مقصود میرود
فرزند زیر تیغ پدری نہ بد گلو مگر خود پدر در آتش غرور می رود
غائب کے فارسی کلام میں اس قسم کی بہت مثالیں ملتی ہیں۔ یہاں صرف
ایک اور نقل کی جاتی ہے۔

حضرت ابراہیم کے آگ میں نہ جلنے کی تلمیح پیش کرتے ہوئے ان سے اپنا مقابلہ
کیا ہے کہ ان کا تو یہ معجزہ تھا کہ آگ میں نہ جلے لیکن میرا معجزہ یہ ہے کہ میں بغیر
شعد و شدر کے جل رہا ہوں۔

شعیدہ کہ ہم آتش نسوخت ابراہیم یہ ہیں کہ بے شدر و شعلہ می توانیم سوخت
شاعر نے یہ بات غیر مذکور رکھی ہے کہ آیا حضرت ابراہیم کا آگ میں نہ جلنا

بڑا معجزہ تھا یا میرا بغیر آگ کے جلا۔ اس تقابل کے علاوہ شفیقہ اور برہین کے لفظی تقابل نے بھی شعر میں لطف پیدا کر دیا۔

میر صاحب نے محبوب کے دہن سے غنچہ کا مقابلہ اس طرح کیا ہے۔
 سج پو جھو تو کب سے لگا اس کا سادہن غنچہ تسکین کے لئے ہم نے اک بات بنائی ہے
 دوسری جگہ اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

کیا غنچہ اس کے منہ کی لئے غنچہ نقل کر لے تو تو نہ بول نظام بآتی ہے وہاں سے
 محبوب کا مقابلہ گل سے اس طرح کیا ہے۔

ست محسن باغ بولے غیرت گلزار مغل کیا کہ جسے آگے ترے بات کر آئے
 غالب نے اپنے اسی مضمون کے ایک فارسی شعر میں عیب و غریب ندرت پیدا کی ہے۔

شعر ہے۔

گفت راؤ از رگست راناشا تو داری بہارے کہ عالم ندارد
 وہ محبوب کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ تیرا گل لطف گویائی رکھتا ہے
 اور تیری رگس لذت دید سے آشنا ہے۔ تیری بہار ایسی پُر کیف ہے کہ فطرت
 کی بہار میں یہ طر فگی کہاں!

اردو کے دوسرے شاعروں کے یہاں بھی تصورات کے مقابلے کی مثالیں
 ملتی ہیں جن سے حسنِ کلام کی زینت بڑھائی گئی ہے۔ یہاں صرف چند مثالیں پر
 اکتفا کیا جاتا ہے۔

دآغ نے محبوب کے چلنے اور ٹھہر جانے کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے
 کہ آپ خود دونوں حالتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس میں ماسلوب بیان کی
 بڑی لطافت پنہاں ہے کہ خود مقابلہ کرنے کے بجائے آپ کے ذوق پر اس
 کو چھوڑ دیا۔ شعر ہے۔

وہ جب چلے تو قیامت باقی چار طرف ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب تھا

دوسری جگہ محشر کا مقابلہ محبوب کی ٹھوکر کے فتنے سے کیا ہے۔

وصم ہے حشر کی سب کچھتے ہیں لڑ لڑ ہے یوں ہے

فتنہ ہے اک تیری ٹھوکر کا ٹکر کچے بھی نہیں۔
(دماغ)

بعد جزا اور شب بھراں کا مقابلہ ملاحظہ طلب ہے۔

آتا جو یہاں روز جزا سے شب بھراں بڑھ کر تو کہاں تیرے برابر بھی نہ ہوتا
(دماغ)

قافی نے محبوب کی رعنائی اور اپنی نگاہ کی شوخی کا مقابلہ کیا ہے۔

بگاہ شوق کی رعنائیوں کا کیا کہنا مگر خدا کی قسم آپ کا جواب نہیں
(قافی)

کبھی عاشق کدل کا مقابلہ محبوب کے جلووں سے کیا جاتا ہے۔

ترے جلووں کو دیکھیں اور میرے دل کی طرف دیکھیں
کہاں ہیں اتصال موج و ساحل دیکھنے والے
(جگر)

ہمارے غزل گو شاعروں نے بعض اوقات اپنی گنہ گاری اور رحمت

خداوندی کو ایک دوسرے کے مقابل کر دیا ہے اور اس طرح حن ادا کا ایک

خاص پہلو نکالا ہے۔ گویا کہ یہ دونوں صورتیں جو گفتگو کر رہے ہیں۔ اسی

ضمن میں زہد کی برائی اور رندی اور شراب و مسکدہ کی تعریف کی گئی ہے۔

یہ سب موضوع ایسے ہیں جو غزل کی ساخت میں نہایت خوبی سے

کچھتے ہیں۔ ایک تو اس لئے کہ رمز و ایما کی ٹیکنک کو ان سے خاص مناسبت

ہے اور دوسرے اس لئے کہ غزل گو شاعر کا دل انسانی مدد دی کے

جذبات سے ملو ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ پسیمی عرفان شناسی مذہبی جذبہ کو

سے بالاتر ہے۔ عارف کو ہر کہیں ذات بے ہمتا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ سب

کو اسی کی تلاش ہے اور سب اسی کی طرف قدم اٹھا رہے ہیں۔ مگر یہ ہے
رفتار میں فرق ہوا اور راستے بظاہر الگ الگ کہوں۔ بقول حافظ۔

جنگ چھٹا و دو دولت ہر اھل ربنہ چوں ندیدند حقیقت اس افسانہ زندہ
شاعر اور خاص طور پر غزل گو شاعر کا مزاج اور انداز طبع ادعا پسندی
کی کبھی حریف نہیں ہو سکتی۔ ادعا پسندی کا علمبردار زندگی کے ہر حلقہ
کو من مانے طور پر سادہ تصور کر کے صرف اپنے نقطہ نظر سے انھیں سمجھنا
چاہتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کے نقطہ نظر کو دیکھنا پسند نہیں کرتا اور نہ
سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ سب کچھ کرتا ہے موائے احتساب نفس کے کثرین اور
ادعا پسندی کے جلو میں تعصب اور تنگ نظری کا قافلہ چلتا ہے جو ہر اس
تصور کو اپنے پاؤں تلے روندتا جاتا ہے جس میں رواداری اور انسانی
محبت کی بو ہو۔ یہ ادعا پسندی ایک زمانے میں مذہبی رنگ لئے ہوئے تھی
اسی لئے ہمارے شاعروں نے زہد پر چوٹیں کیں اور اس کی چوریاں ایک ایک
کر کے دکھائیں اور تجریدی یا مذہبی اصول سے زیادہ محبت اور انسانیت کو اہمیت
دی۔ انھوں نے ہمارے ادب میں کم و بیش وہی کام کیا جو مغربی ادب کی
تاریخ میں ہیومن ازم کی تحریک نے انجام دیا تھا اس تحریک نے رواداری
و وسیع مشربی اور تودون خیال کی روایات قائم کیں جن سے اہل مذہب کے ذوق
کی تربیت ہوئی۔ ادعا پسندی اپنے رنگ ہر زمانے میں بدلتی رہی ہے۔ کچھ عرصہ
قبل اس کا رنگ مذہبی تھا اور آج سیاسی ہے۔ غزل گو شاعر کے اشاروں
کا دونوں پر اطلاق کیا جاسکتا ہے۔

گمناہ کے تصور کا تعلق جبر و اختیار کے اصول سے ہے جو نہ صرف اسلامی
علم کلام کا محرکہ آثار مسئلہ رہا ہے بلکہ قدیم اور جدید ادب عالمیہ میں کسی نہ کسی
نمط میں یہ مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہرگز بجلی میں جبر و اختیار اور خیر و شر
کی کشمکش ضروری ہے۔ غزل گو شاعر کو اس امر کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ

انسانی آزادی محدود اور مشروط ہے۔ انسان کو بعض دفعہ خود اپنی فطرت سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کو ورثہ میں خاص قسم کا مزاج ملتا ہے جو اس کی فطری زندگی پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کبھی انسان یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اگر اس کی قوت ارادی نہ ہوتی تب بھی وہی نتائج پیدا ہوتے جو ارادہ رکھنے کے باوجود وقوع پذیر ہوئے۔ خود ارادہ ان صلاحیتوں اور رجحانوں کا مدد و معاون بن جاتا ہے جو پہلے سے مقرر تھے اور جن کی وجہ سے وہ کسان کسان گناہ اور شر کے من میں پھنسا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ گناہ سے انسان متاسف اور پشیمان اس لئے ہوتا ہے کہ اس کا اندرونی اخلاقی احساس اس کو بتاتا ہے کہ تیرے ارادہ میں آزادی کی صفت موجود تھی لیکن پھر بھی تو نے اس کی روشنی میں قدم نہیں اٹھایا۔ اگر یہ تاسف کا احساس نہ ہو تو زندگی اپنی تکمیل کی کوشش نہ کر سکے۔ غزل گو شاعر گناہ نگار سے ہمدردی ضرور رکھتا ہے لیکن خود گناہ یا شر کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ لیکن کبھی حافظ کی طرح جب وہ شیخ نگاری پر آتا ہے تو کہہ اٹھتا ہے۔

گناہ اگرچہ نبود اختیار ما حافظ
تو در طریق ادب کوش گو گناہ من است
ہمارے شاعروں نے عالم گناہ میں بھی رحمت خداوندی کا دامن کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ گناہ کا احساس انسانی نفس کے تزکیہ کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے اور دل کی پاکیزگی اشک تداومت سے جلا پاتی ہے۔ ہر گناہ اپنے جلو میں درد و غم کی پرچھائیاں چھوڑ جاتا ہے جو غزل گو شاعر کے دل کو عزیز ہوتی ہیں۔ اس لذت الم کے باعث اسے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا اس کے گناہ اس کی ذاتی ملکیت میں جھینس کوئی بھی اس سے نہیں چھین سکتا۔ وہ ان کی یاد کو سنت سنت کے رکھتا ہے کہ اس کے نزدیک یہی حاصل حیات ہے وہ اس یاد کی بنیاد پر محبت کی عمارت بناتا ہے۔

عالم گناہ میں بھی ہمارے شاعر کو امید کی تجلیاں دور سے نظر آتی ہیں جو حسن عمل کی ضامن ہوتی ہیں۔

ترے کرم سے کیا سماں ہو عالم گناہ کا سیاہیاں امید کی تجلیاں لئے ہوئے
(قافیہ)

عالم گناہ اور اس کے مقابل رحمت خداوندی کے ضمن میں بعض نہایت لطیف شاعرانہ نکات و معانی ہمارے غزل گو شاعروں نے پیدا کئے ہیں۔ پند شاہیں ملاحظہ ہوں۔

غالب تو یہ ہے زاہد رحمت کے دور ہوئے درکار و ان گنہ ہیں یاں بے گناہیاں ہیں۔
(تیسرا)

رحمت اگر لیتنی ہے تو کیا ہے زہد شیخ اے بے وقوف جائے عبادت گناہ کر
(تیسرا)

مری نجات کچھ ان واعظوں کے ہاتھ نہیں بڑا کریم ہے جس کا گناہ گار ہوں میں
(معاذ)

کوسے غرور نہ طاعت پہ کہد و زاہدے مرے کریم کو مذر گناہ پسند ہوا
(اور یہ لکھنوی)

صبر لے زاہدنا ہم نے خواروں کا بخشے والا بھی دیکھا ہے گنہ گاروں کا
(داغ)

بخشا مجھے خالق نے فرشتوں سے یہ کہہ کر جرم اس نے کئے ہیں مجھے غفار سمجھ کر
(تیسرا)

لے حافظ کا شعر ہے۔ بیار بادہ بخور زان کہ پیر میکدہ دوش بے حدیث غفور و رحیم و رحمن گنت

مائل کوئی گناہ نہ رہ جائے دیکھنا کام آ پڑا ہے رحمت پروردگار سے
(مائل)

کیا کرے زاہد بیچارہ اسے کیا معفوم رحم کرتا ہے باندازہ عصیاں کوئی
(اصغر)

رحمت حق نے بہت دیکھ لی ایساں کی بہار

اسب ذرا سامنے رعنائی عصیاں کر دیں
(اصغر)

مری ہر معیشت پر مطلع انوار صد رحمت فضا دل گناہوں سے منور ہوتی جاتی ہے
(فانی)

اتید عفو ہے ترے انصاف سے مجھے شاہد ہے خود گناہ کہ تو پردہ پوش تھا
(فانی)

یہ کیا جانے زاہد کہ اے آب رحمت مے جام پترے کھنگلے ہوئے ہیں
(حسرت)

نہو اسکی خطا پوشی پہ کیوں ناز گزنگاری نشان شان رحمت بن گیا داغ سیکاری
(حسرت)

فرق رحمت ہو کے دیکھا جوش دریائے کرم عفو نے دھبہ چھوڑا دامن تقصیر میں
(شائبہ کھنوی)

مجھ سے گناہ گار پر یہہ بارش کرم منہ دیکھتا ہوں رحمت پروردگار کا
(جگر)

عصیاں کی بھی نہ ہو سکی تکمیل مجھ سے آہ کیا منہ دکھاؤں رحمت پروردگار کو
(جگر)

مبارک ہو مبارک ساحل رحمت پر دم لینا قدم مارا توڑ دیا پیر جاوے یا کھصیاں کو
(چنگانہ)

بعض شاعروں نے لطف گناہ کو بڑھا چڑھا کر یعنی یا مثالی شکل میں پیش کیا ہے۔ کبھی گناہ کی یاد دل میں ایسی چمکیاں لیتی ہے کہ سزائے موت کے بجائے شاعر حشر میں بھی اسے اپنے سینے سے لٹائے رکھنا چاہتا ہے۔
 سب اہل حشر جب اپنے گئے کرپائیں گے ہڑامزہ ہو جو مجھ کو مرگناہ ملے
 جگہ کا شمس ہے۔

بھڑکار ہا ہوں آتش عصیاں ہر ایک پھیلنا رہا ہوں رحمت پروردگار کو
 غالب نے گناہ کے معنوں میں بھی اپنی شروخی کی الگ راہ نکالی ہے۔ وہ باری تعالیٰ سے ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد چاہتا ہے۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
 یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

ایک اور جگہ اسی مضمون کو دوسری طرح ادا کیا ہے۔
 آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد مجھ سے سے گناہ کا حساب لے خدا نہ مانا
 گناہ کرنے میں اپنے حوصلے کی وسعت کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ کہتا ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی تک آبی سے خشک ہو گیا لیکن میرا دامن کا سرا بھی تر نہ ہونے پایا۔

دریائے معاصی تک آبی سے موا خشک میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
 (غالب)
 دوسری جگہ اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

بقدر حسرت دل چاہیے ذوق معاصی بھی بھروں یک گوشہ دامن گلاب ہفت دریا ہو
 ایک جگہ غالب ذات باری سے پوچھتا ہے کہ تیری رحمت کس پردہ میں بیٹھ کر آرایش میں مصروف ہے۔ ذرا وہ سانسے تو آئے۔ وہ خود ہماری مجبوریوں کی عذر خواہی کو بے گئی اس واسطے کہ اسی کے بھروسہ پر تو گناہ کر نیکی جرات ہوئی۔
 کس پردے میں ہے آئینہ پردہ ایلے خدا رحمت کہ عذر خواہ بے سواں ہے
 ایک جگہ غالب نے عذر گناہ اس خوبی سے کیا ہے کہ گناہ کی ذمہ داری خود

اس پر نہیں بلکہ خالق حیات پر پڑتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمنا شائے گلشن کا یہ
 لازمی اقتضا ہے کہ دل میں تمنا شائے چیدن پیدا ہو۔ اب اگر تمنا شائے چیدن
 گناہ ہے تو اے بہار کے پیدا کرنے والے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہم گناہگار ہیں
 تمنا شائے گلشن تمنا شائے چلب گن
 بہار آفرین گناہ گار ہیں ہم (نسخہ حمید یہ)

مسجد و میخانہ یا کعبہ و سیکرہ کی رمزی علامات بھی اس ضمن میں قابل
 ذکر ہیں کہ زہد و عتقاہ کے تصورات ان کے حلقہ وابستہ و پیوستہ ہیں
 ظاہر ہے کہ مسجد و میخانہ سے مسجد و میخانہ مراد نہیں اور دیکھیں
 و سیکرہ سے کعبہ و سیکرہ مراد ہیں۔ یہ لفظ رمزی اور ایمائی اغراض کے
 لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ہمارے غزل گو شعروں نے اپنے قلب و نظر کی
 وسعت کے اظہار کے لئے ان لفظوں کو علامات کے طور پر برتن ہے۔ چند
 مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائیگی۔
 میر صاحب کا شعر ہے۔

برخ جس کے حسن سے مسجد ہے اور دیر ایسا بتوں کے زیج وہ اند کوں
 غائب نے دیر و حرم کو واما ندگی شوق کی منزلیں قرار دیا ہے۔
 دیر و حرم آئینہ سکار تمنا واما ندگی شوق تراشے ہے بنا ہیں
 (نسخہ حمید یہ)

دوسری جگہ اہل کشت کو یقین دلایا ہے کہ اگر میں کعبہ میں ہوں
 لگا ہوں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں اپنے پرانے رقیبوں کی
 اہل کشت کے حق صحبت کو بھول گیا۔ استفہام انکاری سے شعر کی خوبی
 دو بالا ہو گئی۔

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
 بھولا ہوں حق صحبت اہل کشت کو؟
 (غالب)

داغ نے زاہد کو اس طرح طعنہ دیا ہے۔
 چلا ہے کعبہ کو تو خاک چھانے زاہد
 فقط خدا ہی خدا ہے حرم میں خاک نہیں
 (داغ)

کبھی کعبہ کی راہ اس لئے مجبوراً اختیار کی جاتی ہے کہ دیر کی راہ نہ مل سکی۔
 دیر کی راہ نہ ملتی ہو تو کعبہ ہی سہی کفر جب کفر نہ بنتا ہو تو ایمان کو دیں
 (اصغر)

اگر تقویٰ کی طرف طبیعت مائل نہیں تو پھر رندی ہی سہی۔
 دل گر نگاہ خیال سے وساعز ہی ہوئی مگر نفس جاوہ سرخسراں تقویٰ نہ ہوا
 (غالب)

عشق اور تقویٰ بڑی شکل سے ایک دوسرے کے ساتھ جیتے ہیں خصوصاً
 تقویٰ کا جو عمرانی پہلو ہے اس سے عشق کی اکثر ٹکڑ ہو جاتی ہے۔ سودی
 کا شعر ہے۔

ہر کجا سلطان عشق آمد نہاند قوت بازوئے تقویٰ را محل
 میر صاحب نے ایک موقع پر اہل مسجد کی غلط فہمی بڑے لطف سے
 رفع کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ میں دیدہ و دانستہ
 مسجد میں آیا ہوں بلکہ جا کہیں اور رہا تھا بہک مگر مسجد میں پہنچ گیا۔
 کہتے ہیں۔

مستی میں لہزش ہو گئی معذور رکھا جائیے اہل مسجد اس طرف آیا ہوں میں ہکا بکا
 چونکہ بے خانہ بند تھا اس لئے بدرجہ مجبوری مسجد میں رات گزار رہی جاتی ہے۔
 مائل ہیں قورات کہیں کے کائناتی مسجد میں جا پڑیں گے جو میخانہ بند ہے
 (مائل)

مغل و غلط اور میخانہ کی صحبت کا مقابلہ قابل ملاحظہ ہے۔
 مغل و غلط تو تا ویر رہے گی قائم یہ ہے خانہ ابھی پٹی کے چلے آتے ہیں
 (مائل)

۲۲۴

بعض اوقات کعبہ سے اکتا کر بت خانہ کی طرف قدم اٹھتے لیگتے ہیں مومن کا شعر ہے۔

کعبہ سے جانب بتخانہ بھڑ آیا مومن کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زہنار لگا
خواجہ میر درد نے جو اپنے زمانے کے بڑے صاحب باطن گذرے ہیں،
طریق زہد کا پول اس طرح کھولا ہے۔

غیر از طال زاہد کیا ہے طریقی زہد میں دل ہو منتفعہ جس جگہ کو چڑھے فروش ہے
غائب ہے بھی زہد پر چویش کی ہیں۔ اس کو زاہد سے یہ شکایت ہے کہ وہ
نیکی نیکی کی خاطر نہیں بلکہ صلہ کی توقع میں کرتا ہے۔ عبادت و اعمال کا
محرم دنیا کی فلاح یا اخروی نجات نہ ہونا چاہیئے بلکہ رضاۓ الہی۔ اجر
کی طمع خلوص کے منافی ہے۔

کیا زہد کو مانوں کہ نہو مگر چریائی یاداش عمل کی طمع خام بہت ہے
دوسری جگہ اسی مصنف کو اور زیادہ شوخی سے ادا کیا ہے۔
طاعت میں تار پٹے تھے و آنجیس کی گت دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کر
ایک موقع پر کہا ہے کہ زاہد جس باغ رضواں کی تعریف میں اس قدر رطب
اللسان ہے اسے ہم مدتوں سے بھلا نہ ٹھہے ہیں اور اس لائق بھی نہیں سمجھتے
کہ اس کا خیال بھی دال میں لائیں۔

تالش گرہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلہ سستہ ہے ہم بے خردوں کے طاق نیاں کا
چونکہ حور کی طمع زاہد کی عبادت کی محرک بنی ہے اس لئے کیا لطف ہو اگر وہ
جنت میں نہ جانے پائے اور اس کے ارمان دل کے دل ہی میں رہیں۔

حور کے واسطے زاہد نے عبادت کی ہے
سیر توجہ ہے کہ جنت میں نہ جانے پائے (دراغ)
کبھی غزل گو شاعر اپنی رندہ کو زاہد و داعیہ کی ریاکاری کے مقابل لے آتا ہے

اس مقابلہ سے دونوں کیر کڑا نکل واضح ہو جاتے ہیں۔ زاہد جو حسن و عشق کے مزے سے نا آشنا اور مشاہدہ فطرت کے کیف سے یکسر بیگانہ ہے اپنے تئیں وہ ظاہر کرتا ہے جو وہ حقیقت میں نہیں ہے۔ سوز و ساز حیات سے محروم ہونے کے باعث وہ اپنے عمل میں کبھی حقیقی ہم آہنگی نہیں قائم کر سکتا۔ محض عبادت روحانی تسکین کے لئے کافی نہیں جب تک عقیدت اور اپنے عمل کی تڑپ دل میں پیدا نہ ہو۔ زاہد کی روح نامکمل اور اس کی نظر مارا رہتی ہے اور وہ اپنے نفس کی قریح اور تہذیب پوری طرح نہیں کرنا چاہتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ریاکاری کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔ دنیا کی لذتیں اس کے دل میں چھپ چھپ کر چٹکیاں لیتی ہیں۔ وہ بھی غنا کا مرتکب ہوتا ہے لیکن وہ اس پر اپنے زہد و اتقا کا پردہ ڈال دیتا ہے۔ سیرت کی اس نامہموری کو حافظ نے یوں ظاہر کیا۔

واعظان کس جلوہ بر محراب و مہری کنند
 بچوں بخلوت می روند آن کار دیگر می کنند
 مشکے دارم ز دانشمند مجلس بازیگس
 توبہ فرمایان چرا خود توبہ کم تر می کنند
 اسی لئے اس نے زاہد کے قول و فعل سے پناہ مانگی ہے۔
 از قول زاہد گردیم توبہ
 وز فعل عابد استغفہ اللہ

غائب نے ایک جگہ واعظ پر کیا خوب چبھتی کسی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں حسب عادت میخانے کے دروازے سے نکل رہا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت واعظ وہاں داخل ہو رہے ہیں۔ کسی کے کہنے پر یقین نہ آتا لیکن جب خود اپنی آنکھوں دیکھی بات ہو تو انکار کیسے کیا جاسکے۔ شر ہے۔

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
برائتا جاتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہسم نکلے
داغ نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا۔

میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت ادھر کہاں؟

ہمارے غزل گو شاعر صرف دوسروں ہی کی تنقید پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ خود اپنا
احتساب نفس کرتے ہیں اور ضرورت ہو تو اپنے آپ کو بھی نہیں چھوڑتے۔
اپنی بات و حدیث دیگران بیان کرنے میں یقیناً بڑی بلاغت ہے لیکن اس سے
بھی بڑھ کر بلاغت اس میں ہے کہ آپ دوسروں کی بات اپنے اوپر ڈال کر کہیں
شیفہ نے اپنے اس شعر میں یہی انداز اختیار کیا ہے۔

وہ شیفہ کہ دھوم تھی حضرت۔ کئے زند کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر لے

میر صاحب ہوں یا غالب، مومن ہوں یا دوق، حسرت ہوں یا جگران سہول
میں تغزل کے بعض شرک اجزا ملتے ہیں۔ وہ سب اپنے دل کے اندرونی تجربے
کو بیان کرتے ہیں۔ تجربے کے لئے ضروری نہیں کہ وہ طویل ہو۔ ایک لمحہ کا تجربہ
اس سے زیادہ قیمتی ہو سکتا ہے جو کچھ زیادہ عرصے تک محسوس کیا گیا ہو اور
غیبی جذب کا نتیجہ ہو۔ غزل کا ایک شعر ایک خاص تجربہ کا اظہار ہے۔ تغزل کے
لئے زیادہ تر وہ تجربے قدر و قیمت رکھتے ہیں جو تن و عشق کی طلسمی دنیا میں
پیش آئیں کہ اس کے لئے یہی اہم اور ابدی حقائق ہیں۔ اندرونی تجربے
کو تفصیل اور وضاحت سے بیان نہیں کیا جاسکتا اور نہیں کرنا چاہیئے
چونکہ اثر آخری میں ایہام مقصود ہوتا ہے اس لئے تغزل میں رمز و ایما
کا اسلوب برتایا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ ہسم کیفیت اندرونی تجربے پر مبنی ہوتی
ہے اس واسطے اس کا اخلاص غیر مشتبہ ہے۔ بعض غزل گو شاعروں کے

ہاں دوسروں کے مقابلے میں خادجیت کا عنصر زیادہ شائبہ جیسے معنی
اور جرات وغیرہ۔ ان دونوں کا تفضل اعلیٰ پایہ کا ہے۔ لیکن ان کو وہ
رتبہ کبھی نہیں ملتا جو تیسری غالب کو نصیب ہوا۔ خادجیت لازمی طور پر
بیان کی صفائی اور منطقی تسلسل کی محتاج ہے، جو تفضل کے لئے سازگار
نہیں جس کا خمیر رمز و ابہام سے بنا ہے۔

غزل گو شاعر کے دل کو رمز و ابہام اس لئے عزیز ہیں کہ وہ جس
مقام کا اثر پیدا کرنا چاہتا ہے وہ انھیں سے ملتا ہے۔ دن کی روشنی کے
مقابلے میں رات کی چاندنی جذبات پرستوں کو کیوں پسند ہے؟ بقول
فرانسیسی مفکر گوئیٹس کی وجہ یہ ہے کہ جذبہ ابہام چاہتا ہے نہ کہ وضاحت
خارجی عالم کی اشیا جتنی ہوئی چاندنی میں عجیب و غریب پراسرار کیفیت
پیدا کر دیتی ہیں۔ ان کے اندر خیال ہی بدل جاتے ہیں۔ وہ شخص جو مکان کی
پیمائش کرنا چاہتا ہے یا درختوں کی نباتی خواص کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے
انہیں کو چاہیئے کہ دن کی روشنی میں انھیں دیکھے۔ لیکن وہ شخص جس کو مطلوب
انہیں وہ چاندنی رات میں مکاؤں اور درختوں کی مجموعی اثر آفرینی سے جتنا
لذت اندوز ہوگا اتنا دن کی روشنی میں نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جذبہ
حقیقت اور خیال کی دھوپ چھاؤں میں جھولا جھولنا پسند کرتا ہے۔ دھوپ
چھاؤں ہو یا فطرت کی کوئی دوسری بہم صورت جو دل کے تاروں کو ہٹے
اہل نظر کو محبوب ہوتی ہے۔ صبح پو پھٹنے سے قبل اور غروب کے چشتی
دھندلکے میں جب تاریکی اور روشنی ہم آغوش ہوتی ہیں دل کیوں برابر
کیفیت محسوس کرتا ہے۔ اسی لئے صبح اور شام کی مہم کیفیت روحانی تزکیہ
کے لئے موزوں خیال کی جاتی ہے۔ دنیا کے ہر مذہب میں ان اوقات کے
لئے عبادتیں رکھی گئی ہیں۔ فطرت کا پرسوں ابہام جذبات میں تحریر کی آمیزش
کرتا اور ان کی شدت کو بڑھاتا ہے۔ حسن و عشق کی رنگتوں اور کیفیتوں

کی تکمیل کے لئے سوائے اس فضا کے کوئی اور دوسری سازگار نہیں ہو سکتی اور چونکہ جذبات میں دل انہی طور پر مبہم سا تھیرا ہوتا ہے۔ ہوتا ہے اس لئے جذبات کی زبان کو بھی یہ زیب دیتا ہے کہ وہ مبہم ہی رہے۔ تعین جذبہ کی فطرت کو مجروح کرتا ہے۔ تنزل کے ایمانی ابہام کی بھی یہی توجیہ ہے۔ رمز و ابہام اس کا عیب نہیں، مزہ ہے۔ چونکہ ذوق حسن اور لطافت جذبات کا اظہار کما یہ دیا گیا ہے کہ ذریعہ اثر آفرین ہو سکتا ہے اس لئے ہمارے غزل گو شاعروں نے چون کا رانہ اسلوب اختیار کیا وہی اس صنف سخن کے لئے موزوں تھا اور اس سے غنائی اور عشقیہ شاعری کی قدیں معین ہو سکتی تھیں۔ لیکن ان قدروں کا معین ہو جانا کافی نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر زمانے کی تنقید اپنی نئی بصورتوں سے ان کی باز آفرینی کرتی رہے۔ اس باز آفرینی کی بدولت روح تنزل کبھی فرسودہ یا مردہ نہیں ہوگی اور اس کے سد ابہار پھول شام جہاں کو ہمیشہ معطر کرنے رہیں گے۔

انتخابات

ولی اور نگ آبادی

تجھ لب کی صفت لعلِ جُشاش کے کہوں گا
بے صبر نہ ہو لے ولی اس درد سے ہر گاہ
جادو ہے تیری نین غزالاں کے کہوں گا
جلدی سے ترے درد کے درماں کے کہوں گا

جس وقت لے سبز بجن تو بے حجاب ہو گا
مت آئینہ کون دکھلا انا جمالِ روشن
تجھ ہر ذرہ تجھ جھلک سون چوں آفتاب ہو گا
تجھ مُکھ کی تاب دیکھے آئینہ آب ہو گا
تجھ آنکھ دیاں کے دیکھے عالم خراب ہو گا
مجھ کو ہوا ہے معلوم لے مت جامِ خوین

آج تیری بھواں نے مسجد میں
ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا
آرزوئے چشمہ کوثر نہیں
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا
دیکھ رتبہ دیدہ دیدار کا
تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا
منہ گلِ مسندِ شبنم ہوئی

ملا ہو گلبدن جس کو اسے گلشنِ سوں کیا مطلب
جوپایا وصفتِ یوسف اس کو پیرا بن سوں کیا مطلب
ولی جنت میں رہنا ہی نہیں درکار عاشق کوں
جو طالبِ لامکان کا ہے اسے مسکنِ سوں کیا مطلب

اب جدائی نہ کر خدا سوں ڈر
اے ولی غیر آستانہ یار
بے وفائی نہ کر خدا سوں ڈر
جب سائی نہ کر خدا سوں ڈر

زلف تیری کیوں نہ کھا پیسج وٹا
 رحم کرا دس پر کہ آیا ہے تو جلی
 حال مجھ دل کا پریشاں بوجھ کر
 درد دل کا تجھ کوں سماں بوجھ کر

دل کو ہوتی ہے سخن بے تاب
 زلف کو پاتھ لگایا نہ کر

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شبِ خلوت میں گلِ روضوں
 خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

جسے عشق کا تیسرہ کاری لگے
 اوسے زندگی جاگ میں بھاری لگے

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کو
 کرتی ہے نگہ جس قدر نازک پہ عمرانی

کہاں ہے آج یارب عبودہ مستانہ ساقی
 کہ دل سے تاب جی سے صبر سرے ہوش لے جاوے

تاخیر سے ہوئے گلاب میں کچھ عرق سے
 ہرگز سخنِ سخت کو لائے زبان پر
 جس برتنے یک بار وہ گل سرہن آئے
 جس دھن میں یک بار وہ نازک بدن آئے

سمرانج اورنگ آبادی

موت سے گم ہوا دل بیگانہ سراج شاید کہ جا لگا ہے کسی آشنا کے ہاتھ

غیر تخیل عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ وہ تو رہا نہ وہ میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

خیر بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ نگری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

جلی سب غیب سے اک ہوا کہ جن سرور کا جل گیا
نہ ایک شاخ ہنال غم جسے دل کہیں سوہری رہی

نظر توافل یار کا گلہ کس زبان سے بیان کروں
کہ شراب حسرت و آرزو غم دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی یاد میں نسو عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جو دھری تھی سو وہ دھری رہی

ترے جوش حیرت حسن کا اثر اس قلب سے یہاں ہوا
کہ نہ آئینہ میں جلا رہی نہ پری میں جلوہ گری رہی

کیا خاک آتش عشق نے دل بے نوائے سراج کو
نہ خطر رہا نہ حذر رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شاہ شہارک آہرو دہلوی

نین میں نین جب ملایئے گا دل کے اندر مرے سہائے گا
آئندہ جسے بیچ مرتا تھا مجھ دکھا کر اسے جلائے گا

نیک باغ میں شتاب چلوئے بہارِ جن گلِ چشم ہو رہا ہے تہاے نظارِ کون

سرے لگا کے پاؤں تک لہو ہوئی یاں تک تو فنِ عشق میں کامل ہو ہوئی

نہ دیوے لے کے دل وہ جدِ مشکیں اگر باور نہیں تو مانگ دیکھو

افسوس ہے کہ مجھ کو نہ یارِ بھول جاوے وہ شوق وہ محبت وہ یارِ بھول جاوے
یوں آبرو بناوے دل میں مزارِ باتاں جب تیرے آگے آوے گفتارِ بھول جاوے

پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے وہ عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

کیا شیخ کیا برہن جب عاشقی میں آوے قسبی کمرے فراموش دِ تارِ بھول جاوے

ہرزا جان جانان منظر دہلوی

یہ حسرت رہ گئی کس کس سے زندگی کرتے
اگر موتا چین اپنا گل اپنا باغبان اپنا
قیسیاں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ غواہی کی
مجھے ناحق ستایا ہے یہ مشق بدگمان اپنا
مرا جی جلتا ہے اس لیل بے کس کی غربت پر
کہ جس نے آسے پر گل کے چھوڑا آئیاں اپنا

گرچہ الطاف کے قابل یہ دل زار نہ تھا
لیکن اس جو رو جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
لوگ کہتے ہیں مومن پھر بے کس افنوس
کیا ہوا اُس کو کہ اتنا بھی وہ بیمار نہ تھا

زخمی تری تلخ کا اک پل جیا تو پھر کیا
صیاو کی بغل میں ٹک دم لیا تو پھر کب

ہم نے کی توبہ اور دھو میں چاتی ہے بہا
ہم نے گل کی کھلی جاتی ہیں کلیاں دیکھو سب
پھر ان خوابیدہ فتنوں کو جگاتی ہے بہار
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار
شاخ گل ملتی نہیں پریدوں کو باغ میں
اتنے اپنے کے اشارے سے جاتی ہے بہار

اتنی فرصت دے کہ ہوں نصحت اے صیاد ہم
مذقوں اس باغ کے سائے میں تھے آزاد ہم

مت احتیاط کر لے نو بہار تو ہم سے
چمن میں ہونے کا اس خاک کو دماغ نہیں

اوس گل کو بھیجنا ہی مجھے خط صبا کے لئے
اس واسطے لگا ہوں چمن کی ہوا کے ساتھ

برگِ حنا اوپر لکھو احوالِ دل مرا شاید کہ جا لگے وہ کسی دلِ ہاکے ہاتھ
منظرِ چھپا کے رکھ دِلِ نازک کو اپنے تو یسٹیشہ بیچا ہے کسی میرزا کے ہاتھ

الہی مت کسو کے پیشِ رخِ انتظار آئے ہمارا دیکھے کیا ماں بویب تک ہمارا ہے

خاتیرے کفِ پاکو نہ اس شوخی سے سہااتی
یہ آنکھیں کیوں لہو روتیں اور غموں کی منہ کیوں جاتی
الہی درد و غم کی سرزمین کا حال کیا ہوتا
محبت مگر ہماری چشم تر سے منہ نہ برساتی

خدا کو اب تجھے سو پناہ سے دل یہ ہیں تک بھتی بیماری زندگی

شاہِ حاتم

ہاتھ مت کھینچ جنوں تجھ کو مرے سر کی قسم ایک جب تک بھی ہے تارِ گریبان کی پٹ
حسن اور عشق تے فیضِ قدم کے حد تے دونوں آباد ہیں ہم گلشنِ وہم ویرانہ
کہتے ہیں سبھی مہربتاں خوب نہیں ہے سنتا ہی نہیں یہ دل گمراہ کسی کی

میر عبدالحی تالپاں

میں اپنے دل کو غنچہ تصور کی طرح یا رب تجھ کو خوشی سے نہ دیکھا کھلا ہوا
— ہم بے کسی پر اپنی تہذیبوں کو لیا کریں دل سارے فتنے ہمارے جدا ہوا

حرم کو چھوڑ ہوں کیوں بنگہ میں شیخ کہیاں ہر ایک کو ہے مرتبہ خدا کی کا

اڈا اے صبا خاک میری اگر تو تو کو پے میں اس بے وفا کے ہی لے جا

— کس کس طرح کی دل میں گذرتی ہیں حسرتیں ہے وصل سے زیادہ مزا انتظار کا

کہتے ہیں اثر ہے گاروئے میں یہ ہیں باتیں اک دن بھی نہ یاد آیا روقمے ہی کس رایتیں

غم وصل میں بے ہجر کا ہجر میں وصل کا ہر گز کسی طرح مجھے آرام ہی نہیں

سن فصل گل خوشی ہو گلشن میں آیاں میں کیا بیلوں نے دیکھو دھو میں چائیاں میں
کہتے تھے ہم کسی سے تم بن نہیں ملیں گے اب کس کے ساتھ چایاں ہے دل بایاں میں

پھر بہار آتی ہے دیوانہ کی تدبیر کرو بے خبر کیا ہوتا سبانی اسے زنجیر کرو
ہوں مقرر میں گنہ گار کہ چاہا تم کو خوب رویاں مجھے من مانگی آغز یر کرو

مصل کے بیج سن کے مے سوز دل کا مال بے اختیار شمع کے آنسو ڈھلک پڑے

محمد امان نثار

ہے جو سینے میں مجھ دھجے ہے انگار ادا
دل جو پہلو میں ہے بیابان ہے وہ پار ادا
آنکھ لگتی ہے کوئی پل تو ہیں ایں اس کا
نالہ خواب میں جو جلتے ہیں نظار ادا
دل کہیں دیدہ کہیں انجی کہ کہیں جان کہیں
گوشِ چرخ میں بر لیک ہے اور ادا

امید مٹا ہے لبِ جان بخش سے اس کو
شمر سندھ عینی نہیں بیمار ادا
ہم عشق میں تم حسن میں مشہور ہیں نون
ہے ذکر ہمارا کہیں اذکار بیمار ادا

کھول کے بندہ قبا یوں نہ پھرایا کچھے
گل کی سنسلی پر بھی لک دیا کی کچھے
تجھ بن جہن کی سیر سے کیا یادے گئے
جوں لالہ داغ سینے پر دو چارے گئے

میر محمدی بیدار دہلوی

طلب میں تیری اک تہنا زبائے جستجو ٹوٹا
کنا یا بی سے تیرے تار تار آرزو ٹوٹا
کیا ہنگامہ گل نے مرا جوشِ جنوں تازہ
اودھرائی بہار ایدھر گریباں کا رنو ٹوٹا

اے رشک گل کہ ہے عبتِ جستجوئے عطر
یک شمع تجھ شمعِ بدن سے ہے بوئے عطر
ہو جس دماغ میں مرے گل پیرن کی بو
بیدار ہو نہ دسکو کبھی میل بوئے عطر

کیوں نہ لے گلشن سے باج اس ارغواں سیما کارنگ
گل سے ہے خوش رنگ تر اس کے خانی پاکارنگ

جو بنی من پرے اتحادی باغ میں کر نشا
اور گیارنگ چمن دیکھ اس رخ زریا کا رنگ
کج ساقی دیکھ تو کیا ہے عجب زنجیں ہوا
رخ سے کالی گھٹنا اور سبزے مینا کا رنگ

بھاتی نہیں ہے باس کسی گل کی لے صبا
کس کی ہوا ہے بوسے معطر دماغ دل

لے بہار گلشن ناز و نزاکت ہر طرف
تیرے آنے سے ہوئی ہے اور بھی سبائیں میں

جانبیں شتا قوں کی سب پر آئیاں
جیب تو کیا ناصحا دامن کی بھی
اس صنم اندام گل رخسار کی
سن کے یہ باد صبا نے باغ میں
بل بے ظالم تیری بے پروائیاں
دھجیاں کر غلجی نے دکھلایاں
جانفرا بہکت چراگر لائیاں
گھٹریاں غنچوں کی سب کھلوائیاں

کریں ہیں ناز گل ولالہ اپنی خوبی پر
تک ایک تو بھی تو یاں آکے جلوہ فرما ہو

اب تک مے احوال سے وال بے خبری ہے
لے نادر جاں سوز یہ کیا بے اثری ہے

میر تقی میر

کہا میں نے کتنا ہے گل کاشیات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
بجھ رہی میں یک قطرہ خونِ شکر شک
پلک تک گیس تو تامل کیا

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کا کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
عہد جوانی رور و کا نا پیری میں ہیں کھیں نہ
یعنی رات بہت تھے جائے صبح ہوئی آرام کیا
سعدی سی

چاہتے ہیں سو آپ کریں میں ہم کو بحث بنانے
کو سوں اس کی اور تجھے پر سجدہ ہر گناہ کیا
کو چو کے اس کے باشندوں نے سب کو بیس سے تمام
رات کو رو دو صبح کیا یاد ن کو جو ن شام کیا
نہ سے گل کو مول لیا قامت سے ہر غلام کیا
سحر کیا، عجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا
قشتہ چھینچا، دیر میں مٹیا، کب تک اس راہ کیا

باقی ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے غماری کی
سرد ہم سے بے ادبی تو دشت میں بھی گم ہی کیا
کس کا کعبہ، کیسا قبلا کون حرم ہے کیا، نزام
میاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دلا جھوٹا کیا
صبح چمن میں سحر کہیں تکلیف ہوائے آئی تھی
ایسے آجوتے رم خوردہ کی وحشت کھوئی شکر تھی
میر کے دین و مذہب کو اب بوجھتے کیا ہوانے تو

جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا
چمن کو بمن قدم نے ترے نہال کیا
جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

چمن میں گل نے جو کل دعوئے جمال کیا
بہار رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو
لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تو نے

آیا جو بخود صبح تو میں شام نہ آیا
جنون کی طرف ناقہ کوئی گام نہ آیا
پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا
اپنا قویہ دل تیر کسو کام نہ آیا

بے ہوش بے عشق ہوں کیا میرا بھروسا
سوار بیاباں میں گیا محل لبلی
اگے جو ترے گوجے سے جاؤں گا تو سینو
نے خون ہوا آنکھوں سے یہاں تک نہ ہوا داغ

اب سنگ مداوا ہے اس آشفۃ سری کا
مقدور نہ دیکھا کبھی بے بال و پری کا
آفاق کی اس کارگہ شیش گری کا
کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

زندان میں بھی خوش نہ گئی اپنے جنون کی
صد موسم گل ہم کو تہ بال ہی گزرے
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
تک میر جگو سوختہ کی جلد خبر لے

سبب چمن کا مفت میں پامال ہو گیا

وہ اک روش سے کھوے ہوئے بال ہو گیا

انجھاؤ بڑ گیا جو ہمیں اس کے عشق میں
دعویٰ کیا تھا گل نے سے رخ سے بان میں
دل سا عزیز بان کا جنجال ہو گیا
سلی لگی صبا کی سونہ لال ہو گیا
گل اک چین میں دیدہ بے نور ہو گیا
تیرے غم فراق میں رنجور ہو گیا
دیکھا جو میں نے یار تو وہ قیر ہی نہیں

وہ مایہ جاں تو کہیں پیدا نہیں ہو گیا
دل تاب ہی لایا نہ ٹکٹا اور متا نہیں
میں شوق کی افراط سے بیتاب ہو گیا
اب نہیں روز وصل کا رنج میں بھج لائو گیا
اب دیدہ ترکو جو تم دیکھو تو ہے گرداب سا
رہتا ہے اکثر یہ جواں کچھ ان فوں بیتاب سا
تھی عشق کی وہ ابتدا جو موج سی اٹھی کھجی
رکھ لہو دل پر میرے دریافت کر کیا حال ہے

بے کساز جی گرفتاری کے شیون میں ہا
پتہ گل کی طرح دیوانگی میں ہاتھ کو
ایک دل غم خوار رکھتے تھے سو گلشن میں رہا
گر نکالیں گریباں سے تو دامن میں رہا
اب یہ دعویٰ حشر تکلیف دہر میں ہا
جی ہر اک تجھ پر اس سید انگن میں رہا
ہم نہ کہتے تھے کہمت دید و حرم کی راہ چل
آہ کس انداز سے گزرا بیا باں سے کہ میر

گر یہ یہ رنگ آیا قید قفس سے شاید
دی آگ رنگ گل نے واں لے صبا چن کو
خوں ہو گیا جگو میں اب داغ گستاں کا
یاں ہم جلے قفس میں سن حال آشاں کا
چہرہ اتر رہا ہے کچھ آج اس جواں کا
پوچھ تو میرے کیا کوئی نظر پڑا ہے

ہاتھ سے تیرے اگر میں نیم جاں مارا گیا
یک نچ سے بیش کچھ نقصان آیا کے تیر
سب کہیں گے یہ کہ کیا اک نیم جاں مارا گیا
اور میں بے چارہ تولے مہرباں مارا گیا
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا
آخر آخر میر مر رہا آستان مارا گیا
دسل نہ جواں ہی جود و منزل ہیں عشق میں
کب نیا ز عشق ناہن سے بھٹنے ہے ہاتھ

ہمارے آگے تراجم کس نے نام لیا
خواب رہتے تھے مسجد کے آگے میں اُٹھنے
دل ستم زدہ کو ہم نے تمام تھام لیا
مٹکاہ مسک نے ساقی کی انتقام لیا
مرے سلیقے سے میری بھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

مفت آبروئے زاہد علامہ نے کیا
داغ فراق و حسرت وصل آرزوئے شوق
اک منج بچہ اتار کے حمام لے گیا
میں ساتھ زیر خاک بھی ہنگامہ لے گیا

آزار زدے اپنے کالوں کے تیلے گل
ناکامی صد حسرت خوش لگتی نہیں ورنہ
آغاز مرے غم کا انجام نہیں رکھتا
اب جی سے گزر جانا کچھ کام نہیں کھتا

خوبی کا اس کی بسک طلبگار ہو گیا
ہے اس کی صرف زیر لبی کا بسحوں میں ذکر
گل باغ میں گلے کا مرے ہار ہو گیا
کیا بات تھی کہ جس کا یہ بستر ہو گیا
دلدار اپنا تھا سو دل آزار ہو گیا
ناکردہ جرم میں تو گنہ گار ہو گیا
کب رو ہے اس بات کے کرنے کا جھکوتر

اس کا خرام دیکھ کے جایا نہ جائے گا
اب دیکھ لے کہ سینہ بھی تازہ ہوا چاک
اے کبک پھر بحال بھی آیا نہ جائے گا
پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جائے گا
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی اعتبار
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

بھری آتی ہیں آج یوں آنکھیں
دم آخر ہے، بیٹھ جا، مت جا
جیسے دریا کہیں اُبلتے ہیں
صبر کر ٹک کہ ہم بھی چلتے ہیں

تیرے بے خود جو ہیں کیا چیتیں اسے ڈوبے کہیں اُچھلتے ہیں

گل نے ہزار رنگ سخن سر کیا ولے دل سے گئیں زبانی تری پیاری ساری
جاؤ گے بھول عہد کو فرار و فریسی کے گر پہنچیں ہم شکستہ دلوں کی بھی پیاری

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں
عجز و نیاز اپنا اپنی طرف ہے سارا اس شست خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں
مر کر بھی ہاتھ آوے تو میر مفت ہے جن کے زیاں کو بھی ہم مسود جانتے ہیں

بے کلی بے خودی کچھ آج نہیں ایک مدت سے وہ مزاج نہیں
ہم نے اپنی سی کی بہت لیکن مرض عشق کا علاج نہیں
شہر خوبی ہو خوب دیکھا میر جنس دل کا کہیں رواج نہیں

بھائیں بیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں بھلا ہو اگر تری سب برائیاں دیکھیں
ہمیشہ مائل آئینہ ہی تجھے پایا جو دیکھیں ہم نے یہی خود نمایاں دیکھیں

منے لگے ہو دیر دیر دیکھئے کیا ہے کیا نہیں
تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں
بوئے گل اور رنگ گل دونوں میں دکھ لے نسیم
لیک بقدر یک نگاہ آدے دیکھئے تو وفا نہیں
شکوہ کروں ہوں بخت کا اتنے غضب نہوتاں
مجھ کو خدا خواستہ تم سے تو کچھ گلا نہیں
ایک فقط ہے سادگی تپہ بلائے جال ہے

عشوہ کرشمہ کچھ نہیں آن نہیں ادا نہیں
ناز بہان اٹھا چکا دیر کو میرے ترک کر
کچھ میں جا کے رہ میاں تیرے مگر خدا نہیں

جنوں میرے کی باتیں دشت اور گلشن میں جب جلیاں
نہ جب گل نے دم مارا نہ چھڑیاں بید کی ہلیاں
دوانہ ہو گیا تو میرے آخر ریختہ کہہ کہہ
نہ کہتا تھا میں اسے ظالم کہ یہ باتیں نہیں جلیاں

بزم میں جو ترا ظہور نہیں شمع روشن کے منہ پہ نور نہیں
کتنی باتیں بنا کے ناؤں لیک یاد رہتی ترے حضور نہیں
ہمام ہے یار کی تجلی میرے خاص موسیٰ و کوہ طور نہیں

ہوئے بہتے بہتے جفا کاریاں کوئی ہم سے سیکھے وفاداریاں
ہماری تو گزری اسی طور عمر پہا نالہ کرنا یہی زاریاں

دل سے شوق رخ نہج نہ گیا جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا
پھر قدم پڑتی اس کی منزل لیک مہرے سوداے جستو نہ گیا
دل میں کتنے سودے تھے وہے ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا
سجہ گردان ہی میرے ہم تور ہے درت کو تباہ تاسہ جو نہ گیا

میں کیا کہنے کہ خواباں نے اب ہم سے کیا رکھا ان چشم میا ہوں نے بہنوں کو سلا رکھا
”جوہ ہے اسی کا سب گلشن میں زمانے کے گل پھول کو ہے اُن نے پروانہ بنا رکھا

یوشیدہ راز عشق چلا جائے تقاسم کج
بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اٹھا دیا
آوردگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشان
مشتِ غبار لے کے صبا نے اٹھا دیا

دلِ عشق کا ہمیشہ حریتِ خیر و خیر تھا
اب جس جگہ ہے داغ یہاں پہلے درد تھا
ماشتیں ہیں ہم و میر کے بھی منہ خطِ عشق کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

ہیرن روئے گل سے مرغِ چمن
پسپ ہے یوں بے زبان ہے گویا
ایسی بھری بھری کیا ہے
سکدہ اک جہان ہے گویا
نہی شورِ مزاجِ شبِ یس ہے
میر اب تک جہان ہے گویا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
جی کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا
عشق کیا سو دین گیا ایمان گیا، اسلام گیا
دل نے ایسا کام کیا کچھ جس سے میں ناکام گیا
کس کس اپنی کل کو روئے ہجراں میں لے کل اس کا
خواب گئی ہے تاب گئی ہے چین گیا آرام گیا
ہم نے جو افی کیا کیا کہئے شورِ سروں میں کھتے تھے
اب کیا ہے، وہ عہد گیا وہ موسم وہ ہنگام گیا

سیٹھوں میں شب کے ٹوٹی زنجیر میر صاحب
اب کیا مرے جوں کی تدبیر میر صاحب
رہ گھینٹے تو وہ تیج کھنچ نہ سکتی
اپنا گناہ اپنی تقصیر میر صاحب
جتنی نہیں کمان اب سم لے لئے گل کی
باد سونگے ہے جوں تیر میر صاحب
تم میں خیال میں ہو تصویر سے جو چہا
کرتے ہیں لوگ کیا کیا تقریر میر صاحب

گلے گئے تھے یار ہیں بھی چین کج
اس کی سی بو نہ آئی گل ویاں کج
ہے قہر وہ جو دیکھے نظر بھر کے نبج میر
برہم کیا جہاں مرہ برہم زدن کیے پچ

بس نہ لگ چل نسیم مجھے سے کہیں
رہ گئی ہوں چراغ صابو کچھ کر

کوئی خواہاں نہیں محبت کا
تو کچھ عین ناروا ہے عشق
میر جی زرد ہوتے جاتے ہو
کھیا کہیں تم نے بھی کیا ہے عشق

کب دسترس ہے محل کو تیرے سخن تک
روائیاں گئی ہیں عقیقہ یمن تلک
مارا کیا خرام بناں پر سفر میں میر
اے گمبگ کہتا جانیو اس کے وطن تلک

گرچہ آوارہ چوں صبا ہیں ہم
لیے بتاں اس قدر جفا ہم پر
کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر
لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم
عاقبت بندہ خدا ہیں ہم
گو یا جنس ناروا ہیں تہسم

بلبل کو مو پایا کل پھولوں کی دوکاں پر
خوگر نہیں ہم یوں ہی کچھ ریختہ کہنے نے
رہ میر غریب نہ جاتا تھا چلا روتا
اس مرغ کے بھی جی میں کیا شوق چھوٹا تھا
مشتوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا
ہر گام گلہ لب پر یارانِ وطن کا تھا

کل دل آزدہ گلستان گزرم نے کیا
اس رخ و زلف کی تسبیح ہے یا انکرم میر
گل لگے کہنے کہو، نہ نہ اُدھر ہم نے کیا
ورد اپنا یہی اب شام و سحر ہم نے کیا

دل دفعۂ جنوں کا ہتیا سا ہو گیا
دیکھی کہاں وہ زلف کہ سودا سا ہو گیا

نک جوش سا اٹھا تھا مجھے دل سے لے کر
دیکھا تو ایک بل ہی میں دریا سا ہو گیا
جلوہ ترا تھا جب تیلوں کا رخ بہا رہا تھا
اب دل کو دیکھتے ہیں تو صحرا سا ہو گیا

اندر سے نرور و ناز تیرا
نہ نطق نہیں ہم سے سنا تیرا
کچھ عشق دیکھو گھبراہٹ میں برق جی کر
کیہ ہر سہلے وہ اتنا تیرا

اندوہ نہ غم کے جوش سے دل رک کے خوں ہوا
اب کے کچھ مجھے بہا رہے آگے جنوں ہوا
میرا ان نے سرگزشت سنی ساری رات کو
افسانہ عاشقی کا ہماری فسون ہوا

مے نیلے یہ تھی کہاں کی ادا
جاو کر کرتے ہیں اک نگاہ کے بیج
بات کہتے ہیں نگالیاں دے گئے
دل چلے جائے سے خرام کے ساتھ
خاک میں مل گئے میرے سمجھے
کھب گئی جی میں تیری بانجی ادا
ہائے رے چشم و لبساں کی ادا
سننے ہو میرے ابد زباں کی ادا
دیکھی چلنے میں ان بستاں کی ادا
بے ادائی تھی آسمان کی ادا

مڑھکا ہی کرے ہے جس تس کا
شام سے کچھ بھجا سا رہتا ہے
تھے برے رخ بچوں کے تیور لیک
تاب کس کو جو حال میرے سننے
جیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
دل ہوا ہے چراغِ مفلس کا
شیخ مے خانے سے بھلا کھسکا
حال ہی اور کچھ ہے غلبس کا

گل کو محبوب میں قیاس کیا
فرق نکلا بہت جو یاس کیا

کچھ نہیں سو جتا ہیں اس میں
 شوق نے ہم کو بے حواس کیا
 صبح تک شمع سر کو دھنکی رہی
 کیا پتنگ نے اس میں کیا
 ایسے وحشی کہاں ہیں اسے خداں
 تیر کو تم جھٹاؤ اس کیسا

دل سے شوق بچ نہ گیا
 ہر قدم پر تھی اس کی نزل یک
 سب گئے، ہوش و عبرت ناب تو اب
 لیکن اسے داغِ اولیٰ سے تو نہ گیا
 دل میں کتنے سودے کئے تھے
 ایک پیش اس کے ہو نہ گیا
 سحر گردان ہی تیر ہم تو رہے
 دست کو تارہ تا سبھو نہ گیا

دل خستہ جو، وہ ہو گیا، تو بھلا ہوا کہ کہاں نک
 کبھو سوزِ سینہ سے داغ تھا کبھو دردِ غم سے فگار تھا
 کبھو جائے گی جوادھر صبا تو یہ کہو اس سے کہ بے وفا
 مگر ایک تیر شکستہ پا ترے بان بازہ میں خار تھا

دل جو تھا اک آبلہ بھوٹا گیا
 رات کو سینہ بہت کوٹا گیا
 دل کی دیرانی کا کیا نہ کو رہے
 یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
 اپنے ہی دل کو نہ ہوا نہ تو کیا حاصل نسیم
 گو چمن میں غنچہ پڑ مردہ تھ سے کھل گیا

بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا
 وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا
 بہا تو خون ہو آنکھوں کی راہ نہ نکلا
 رہا جو سینہ سوزاں میں داغدار رہا
 غلی میں اس کے گیا سو گیا نہ بولا پھر
 میں تیر میر کر اس کو بہت بچار آیا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا
قافلے میں صبح کے ایک شور ہے
یعنی تافل ہم چلے سوتائے کیا
یہ نشان عشق ہیں جاتے نہیں
داغ چھاتی کے جھٹک دھوٹا کیا

قدر رکھتی نہ تھی مستاح دل
سارے عالم کو میں دیکھ لایا
دل کہ یک فخر غوں نہیں ہے بیش
ایک عالم کے سر بلا لایا
سبب پہ جس بار نے گرائی کی
اس کو یہ آنا تو اُنٹا لایا
اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر
پھر یس گئے اگر خدا لایا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا
جامد احصاء زاد پر نہ جا
تھا حرم میں ایک نامحرم رہا
میرے رونے کی حقیقت جس میں شی
ایک مدت تک وہ کاغذ غم رہا
صبح پیری شام ہونے آتی میر
تو نہ چیتا یاں بہت دن کم رہا

اس چہرہ کی خوبی سے عشق لگی کو تیا
یہ کون شگوفہ سا جن زار میں لایا
یا قافلہ در قافلہ ان ستوں میں لوگ
یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا
ایسے بت بے ہر سے ملتا ہر کوئی بھی
دل میر کو بھاری تھا جو پتھر سے نکایا

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمایہ کا ہے کو سوتا رہے گا
مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے نہ کو دھوتا رہے گا
بس اے میر مژگان سے پونچھ آسودوں کو
تو کب تک یہ موتی پر دتا رہے گا

سروششا د خاک میں مل گئے
تو نے گلشن میں کیوں خندام کیا

سہی طوفِ حرم نہ کی ہرگز قطعہ آستان پر ترے مقام کیا
تیرے کوپے کے رہنے والوں نے یہیں سے کعبہ کو سلام کیا
شوقِ خرابات کو میسر میں اپنا قبیلہ و کعبہ و امام کیا

یارجب طرح نگہ کر گیا دیکھنا وہ دل میں جگہ کر گیا
تنگ قبا ئی کا سماں یار کی پیرہن غنچہ کو تیر کر گیا
وصفِ خط و خالِ رخِ بان کے تیر نامہ اعمال سید کر گیا

پہونچے بے کوئی اس تن نازک کے لطف کو گل گوچن میں جاے سے اپنے گل پڑا

نظر میں طور رکھ اس کم نمسا کا بھروسا کیا ہے عمر بے وفا کا
نگوں کے پیرہن ہیں چاک سارے کھلا تھا کیا کہیں بند اس قبا کا
پرستش اب انہی بت کی ہے ہر سو رہا ہو گا کوئی بندہ خدا کا
کہیں اس زلف سے کیا لگ چلی ہے پڑے ہے پاؤں بے ڈھب کچھ صبا کا
نہ جانو میسر کو ایسا ہی چپکا نمونہ ہے یہ آشوب بلا کا

کہیں ہیں اب کی بہت رنگ اچھا گل کا ہزار حیف کہ میں بال و پر نہیں رکھتا
جدا جدا پھرے ہے میرے کئی خاطر خیال ملنے کا اُس کے اگر نہیں رکھتا

تا بمقدور انتظار کیا دل نے اب زور بے قرار کیا
دشمنی ہم سے کی زمانے نے کہ جفا کا رتھ سار کیا
صدمہ رنگ جاں کو تاب دے ہام تیری زلفوں کا ایک تار کیا
ہم فقروں سے بے ادائیگی آنِ شیشے جو تم نے پیار کیا

۲۵۰ نہ ہبِ عشق اختیار کیا سخت کا فر تھا جن نے پہلے تیر

بیٹے جی کوچہ دلدار سے جایا رنگیا
اس کی دیوار کا سر سے مرے سایہ نہ گیا
گل میں اسکی سی جو بڑائی تو آیا نہ گیا
ہم کو بن دوش ہو باغ سے لایا نہ گیا
گل نے ہر چند کہا باغ میں دیر اس بن
جی جو اُچھا تو کسو طرح لگایا نہ گیا
شرین رہ میخانہ ہول میں کیا ہاؤس
رسم مسجد کے تئیں شیخ کہ آیا نہ گیا

بیکسائے جی گرفتاری سے شیون میں ہا
ایک دل غمخوار رکھتے تھے گوگلن میں رہا
بچہ گل کی طرح دیوانگی میں ہا تھو کو
گر نکالا میں گریباں سے تو دہن میں رہا
آہ کس انداز سے گزرایا باں سے کہ تیر
جی ہر اک منچیر کا اس صید فگن میں رہا

کچھ نہ دیکھا پھر جزاک شعلہ پہنچ و تاب
شمع تک ہم نے تو دیکھا تھا کہ پروانا گیا
گل کھلے صدر رنگ تو کیا بے پری کے ایسم
مذہن گزریں کہ وہ گلزار کا جانا گیا

ایک ننگہ سے بیش کچھ نقصان آیا آئیں
اور میں بے چارہ تو اسے ہر باں مارا گیا
وصل و ہجر اسے جو دو منزل ہیں و عشق
دل غریب ان میں خدا جانے کہل ملا گیا
کب نیاز عشق ناز حسن سے کھینچے ہے ہاتھ
آخر آخر میرے سر پر آستان ملا گیا

کب تک یہ ستم اٹھائے گا
ایک دن یوں ہی جی سے جائیے گا
نسل تصویر بے خودی کب تک؟
کسو دن آپ میں بھی آئیے گا
کہئے گا اس سے قصہ 'مجنوں'
یعنی پردے میں غم سنائیے گا
شرکت و شیخ و برہمن سے میرے (قلعہ) کعبہ و دیر سے بھی جائیے گا
اپنی ویرہ اینٹ کی جدی مسجد
کسی ویرانہ میں بنائیے گا

دیر و حرم سے گزرے ابل، گھر بھارا
 دنیا و دیں کی جانب میلان ہو لیا کیسے
 یوں دور سے کھڑے ہو کیا معجزہ دونا
 داسین سے باندھ داسن سے ابر تر بھارا

ابراٹھا تھا کبے سے اور جھرم پڑا میتھانے
 بادہ کسوں کا جھوٹ ہے گشتہ دیر پیمانے پر

دان میں آج بمر کے داغ شراب پیے
 تھا اعتماد ہم کو بہت اس جوان پر

پچھتائے نہ کیونچو جی اس طرح سے دے کر
 یہ گوہر گرامی ہم مفت کھو چکے ہیں

سوئے بہتے بہتے جفا کاریاں
 فرشتہ جہاں کام کرتا نہ تھا
 خطا و کا کل وزلف و انداز و ناز
 تری آشنائی سے ہی حد ہوئی
 نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں
 کوئی ہم سے یسکے وفاداریاں
 مری آہ آنے پر چھائیاں ماریاں
 ہو میں دام رہ صد گرفتاریاں
 بہت کی تھیں دتیاں ہم یاریاں
 کھنچیں تیر تجھ سے ہی یہ غواریاں

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھے کیا کیا نہیں
 بوئے گل اور رنگ گل دونوں ہیں لکھن لائے نیم
 لائے کیا نہ کرنا، تو میرے پہنڈیب
 آب و ہوائے ملک عشق تجربہ کی دس بہت
 نازبتال اٹھا چکا دیر کو میر ترک کر
 تم تو کرو ہو صا جی بندہ میں کچھ رہا نہیں
 لیکل یہ قدر یک نگاہ دیکھے تو وفا نہیں
 بات میں بات عیب میں لے تجھے کہا نہیں
 کر کے دوائے درد دل کوئی بھی پھر جی نہیں
 کبے میں جا کے رہ میاں تیرے غم نہیں

یہ جو چشم پر اب ہیں دونوں ایک خانہ خراب ہیں دونوں
 رونا آنکھوں کا رویئے کیتک بکھوٹنے ہی کے باب ہیں دونوں
 ہے تکلف نقاب و سہ رخسار کیا چھپیں آفتاب ہیں دونوں
 تن کے معمورے میں یہی دل و چشم گھر تھے دو، سو خراب ہیں دونوں
 ایک سب آگ ایک سب پانی دیدہ و دل مذاپ ہیں دونوں
 آگے دریا تھے دیدہ ترمیر اب جو دیکھو ملب ہیں دونوں

کیا میں نے رو کر فشا رگریباں رگ ابر تھاتا رمار گریباں
 نشاں اشک خونین کے اڑتے چلے ہیں خزان ہو چلی ہے بہار گریباں
 جنوں تیری مت ہے مجھ پر کہ تو نے نہ رکھا مرے سر پر بار گریباں

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں اُس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں
 ہستی اپنی ہے بیج میں پر وہ ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں
 عشق کا گھر ہے میرے آباد ایسے پھر خانماں خراب کہاں

میں تو خواہاں کو جانتا ہی ہوں پر مجھے بھی یہ خوب جانے ہیں
 قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور اب مرے عہد میں فسانے ہیں
 عشق کرتے ہیں اس پر ہی رو سے میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں

جھائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں
 بنی نہ اپنی تو اسی جنگ جو سے ہرگز تیر ٹرائیں جب سے ہم آنکھیں لائیاں دیکھیں

کی راہبری میری صحرائے محبت میں یاں حضرت خضر آپھی مدت سے بھٹکتے ہیں

قوڑا جانان سے چاہے ہے ابھی مقصد برسوں سے پڑے ہم تو لے تیر شکستے ہیں

گری نہیں ہے ہم سے وہ لے شرکِ قباب اب آگیا ہے فرق بہت اس تپاک میں
ابکے جنوں میں فاصلہ شاید ہی کچھ ہے داس کے چاک اور گریباں کے چاک میں

زوتگان میں جہاں کے ہم بھی ہیں ساتھ اس کارواں کے ہم بھی ہیں
جس جہن زار کا ہے تو گل تر بلبل اس گلستان کے ہم بھی ہیں
وجہ بیگانگی نہیں معلوم تم جہاں کے ہو داں کے ہم بھی ہیں

گل نے نزار رنگ سخن سر کیا و لے دل سے گھٹیں تہ باتیں تری سیاری تاریاں
بچ جاتا ایک رات جوگ جاتی اور تیر کاٹیں تھیں کوہکن رنے بہت رشتیں جارتیاں

کچھ تمہیں ملنے سے بیزار ہو میرے درد دوستی ننگ نہیں عیب نہیں مار نہیں
ناز و انداز و اداعشوہ و اغماض و حیا آب و گل میں ترے سب کچھ ہے یہی سیار نہیں
دل کے الجھاؤ کو کیا تجھ سے کہوں لے ناصح تو کسو زلف کے پھندے میں غر زار نہیں

مجھ کو دماغ و صف گل و یاسمن نہیں میں جو نسیم باد فروش چمن نہیں
گل کام آوے ہے ترے منہ کے تار کے صحبت رکھے جو تجھ سے یہ اس کا دہن نہیں

دیر و حرم سے تو تو تک گرم ناز نکلا ہنگامہ ہو رہا ہے اب شیخ و برہن میں

دل کھلتا ہے واں صحبت زندانہ جہاں غمخ ش ہوں اسی شہر سے مے خانہ جہاں ہو
کچھ حال کہیں اپنا نہیں بخود می تجھ کو عش آتا ہے لوگوں کو یہ افسانہ جہاں ہو

دشت ہے خردمندوں کی صحبت مجھے میرے اب جا رہوں گا وہاں کوئی دیوانہ جہاں ہو

اُس آفتاب سے توفیق سب کو پہنچے ہے یقین ہے کہ کچھ اپنی ہی نارسائی ہو
مغاں سے راہ تو ہو جائے نغمہ زلفہ سچ ترا بھی قصد اگر ترک پارسائی ہو

جاتے نہیں اٹھائے یہ شور ہر سر کے یا اب چمن میں طبل ہم ہی رہیں گے یا تو
عالم ہے شوق کشہ خلقت ہے تیری زلفہ جانوں کی آرزو تو آنکھوں کا مدعا تو
گفت و شنود اکثر میرے ترے رہے ہے ظالم معاف رکھو میرا کہاں سا تو
آتی بخود نہیں ہے باد بہار اب تک دو گام تھا چمن میں ٹمک ناز سے جلا تو
کہہ سا بچہ کے موئے کوئے میرا روئیں گے جیسے چراغ مفلس اک دم میں جل بجھا تو

بھری رہے ہیں منہ پر زلفیں آنکھ نہیں کھل سکتی ہے
کیونکہ چھپے ہو خوار بنی شب جب ایسے رات کے ماتے ہو
سروۂ دہلا ہوتا ہے، درہم بدرہم شاخ گل
ناز سے آفت کش ہو کے چمن میں ایک بلا تم لاتے ہو
چشم تو ہے اک دید کی جا، پر کب تکلیف کے لاتی ہے
دل جو ہے دلچسپ مکاں تم اس میں کب کب آتے ہو

سایہ میں ہر ایک کے خوابیدہ ہے قیامت اس فتنہ زماں کو کوئی جگا تو دیکھو
بلبل بھی گل غلے پر مر کر چمن سے نکلی اس مرغ شوق کش کی ٹمک تم وفا تو دیکھو

حیرت ہے کہ ہے مدعی معرفت اک خلق کچھ ہم نے تو پایا نہیں اب تک زلفہ کب
ہو گا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میر کیا رلبا صحبت سے اُس آرام طلب کو

روز دفتر لکھے گئے یاں سے
گو شکستہ چمن چمن تھے گل
اُن نے اک حرف بھی لکھا نہ سمجھو
غنیہ دل تو روا ہوا نہ سمجھو
عشق کی پائی انتہا نہ کہیں

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
بہود آدم نمود و شبنم ہے
اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ
ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ
دیکھ بے دام لگا مجھے کہنے
تیر کو کیوں کہ منہ ختم جانے
میر کو کیوں کہ منہ ختم جانے

کھینچا ہے دلوں کو صحر اکچھ
ویسے ظاہر کا لطف ہے چھپنا
ہے مزا جوں میں اپنے سودا کچھ
کم تماشا نہیں یہ پردا کچھ
تیر دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ
وصل اس کا خدا نصیب کرے

کچھ کر و فکر مجھ دوانے کی
وہ جو پھرتا ہے مجھ سے دور ہی دور
دھوم ہے پھر بہار آنے کی
ہے یہ تقریب جی لکے جانے کی
تھی خبر گرم اس کے آنے کی
چال بے داول ہے زمانے کی
جو ہے سو پالماں غم ہے میر

ہستی اپنی جاب کی سی ہے
ناز کی اس کے لب کی کیا کیے
یہ نمائش سراب کی سی ہے
پتھر ہی اک نگلاب کی سی ہے
اُسی خانہ خراب کی سی ہے
ساری مستی تیراب کی سی ہے
میر ان نیم باد آنکھوں میں

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھرا آئے اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آئے
 لے وہ کہ تو بیٹھا ہے سر راہ پہ نہار قطعہ کیو جو کبھی تیر بلا کش ادھر آئے
 مت دشت محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو ہر گام یہ اس رہ میں سفر سے خدرا آئے
 کچھ موج ہو ایجاں لے تیر نظر آئی شاید کہ بہار آئی ز بحر نظر آئی
 دلی کے نہ تھے کوچے اورانی مصورتے جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر یہ ہمارا زبان ہے پیارے
 میسر عمداً بھی کوئی مرتا ہے جان ہے تو جہاں ہے پیارے

تڑپنا بھی دیکھا نہ سہل کا اپنے میں کشتہ ہوں انداز قاتل کا اپنے
 بنائیں رکھیں میں نے عالم میں کیا کیا ہوں بندہ خیالات باطل کا اپنے

آرزو اس بلند بالا کی کیا بلا میرے سر پہ لائی ہے
 دیدنی ہے شگستگی دل کی کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
 ہے لہجہ کہ سل ہیں بے ب یعنی ایک بات سہی بنائی ہے
 بے ستون کیا ہے کو تہکن کیسا؟ عشق کی زور آزمائی ہے
 مرگ مجنون سے عقل گم ہے تیر کیا دوانے نے موت پائی ہے

پھر اُس سے طبع کچھ جو دعوے کی بھی ڈالی ہے
 کیا تازہ کوئی گل نے اب شاخ نکالی ہے
 سج پو پھو تو کب ہے گا اس کا سادہن غنچہ
 تیکس کے لئے ہم نے اک بات بنائی ہے

کیا کروں شمع خستہ بانی کی
 میں نے مرسر کے زندگانی کی
 حال بد گفتنی نہیں سیرا
 تم نے پوچھا تو مہربانی کی
 جس سے کھوئی تھی مینہ میرے کس
 ابدا پھر دہری کہانی کی

بہیں وسوساں جی گنوا نے کے
 بسے اسے ذوق دل لگانے کے
 سیرے تینر حال پرست جا
 اتفاقات ہیں زمانے کے
 دم آخر ہی کیا نہ آنا تھا
 اور بھی وقت تھے بہانے کے
 اب گر بیاں کہاں کہ اسے ناصح
 چڑھ گئی ہاتھ اُس دوانے کے
 دل و دیں ہوش دھیر رہ گئے
 آئے آئے ہمارے آنے کے

آج کل بے قرار ہیں ہم بھی
 بیٹھ جا چلنے بار ہیں ہم بھی
 آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں
 تحفہ روزگار ہیں ہم بھی
 شمع گریہ نہ کر تو اسے ناصح
 اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

فقرانہ آئے صدا کر چلے
 ماں خوش رہو ہم دعا کر چلے
 وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے
 ہر آگ چیز سے دل اٹھا کر چلے
 کوئی نا امید نہ کرتے نگاہ
 سو تم ہم سے منہ بھی چپا کر چلے
 جس سجدے کرتے ہی کرتے گئی
 حق بند لگی ہم ادا کر چلے
 پرستش کی یاں تک کہ لے بت تجھے
 نظریں سبھواں کی خدا کر چلے

زلیں اس کی ہوا کریں برہم
 ہم کو بھی بیچ و تاب ہے سو ہے

کوئی ہو محرم غوفی ترا تو میں پوچھوں
 کہ بزم عین جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

عمر بھر ہم رہے شہزادی سے دل پر خون کی اک گلابی سے
 کلنا کچھ کچھ کھلی نے سیکھا ہے اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
 کام نئے عشق میں بہت پرکھیں ہم بھی فارغ ہونے تشرابی سے

کیجیے میں بات طلب رہتی ہم دوری بتاں سے
 اس نے بھی پھر کے یار واپس خدا کے ہاں سے
 جب کو نہ ہتی چہ پہلی تب جانب گشتاں
 رکھتی ہے پھر میرے ہاشاک آشیان سے
 کیا خوبی اس کے متذکی سے غنچ اقل کرے ہے
 تیرے نہ بول ظالم لا آتی ہے وہاں سے
 اتنی بھی بد مزاجی ہر لمحہ مسیہ ہم کو
 ایسا ڈپازین سے جھگڑاں آسمان سے

فریاد و قیس گزرے اب رہے ہمارا ہر کوئی اپنی نوبت دو دن بچا گیا ہے

ہم جن میں گئے تھے وانہ ہوئے ہنکت گل سے آشنا نہ ہوئے
 کیا نیوٹا قفس سے سہ مارا موسم گل میں ہم رہا نہ ہوئے

خدا کرے مے دل کو ملک اک قرار آئے کہ زندگی تو کروں جب ملک کے پار آئے
 ہیں تو ایک ٹھری گل بغیر و بھر ہے خدا ہی جانے کہ اب کب تک یہ آئے
 نہیں چاہا پہلی اتنی بھی دعا کر میر کہ اب جو دیکھوں یہ میں بت نہ پرا آئے

اس کج بدن میں ہر جادو لکھ رہا ہے یوں دیکھیں
وہ دوزخ سے نکلے ہم تصویر سے کھڑے ہیں
یا سب یوں جگمگ سے یا کج لب جگمگ ہے
وہ رنگان کو اس کے ٹپس میں کب جگمگ ہے

پتا پتا رہتا ہوتا حال ہمارا جانے ہند
ہر روز در سطحِ غارت ایک داستان میں ہیں
جوانے نہ جانے گل ہی جھٹکے باغ تو سرا جانا
درد جب کچھ ملتا، وہ خالیہ زمرہ شاہ جانے ہے

مالم عالم عشق، جزا ہے دنیا بیاخت ہے
ہم سے ازل و دیر نہ جیسے وداعی آتا تھا
دیا دین سزا، ہوں میں صحرایہ اور شہت ہے
آج کس سزا میں کی شاہِ دل سے ہائے نصرت ہے

وہ گل کو خوب کہتی تھی میں اس کے روئے تپس
میں سے آج باغ میں جھگڑے بڑے ہے

واعظِ ناکس کی باتوں پر کوئی جانا ہے میر
آؤ سے خانے چلو تم کس کے کہنے پر گئے

ناچار ہم تو تجھ بن جی مار کر رہیں گے
پراس روش کو تیری یہ لوگ کیا کہیں گے

بال و پر بھی گئے کبھار کے ساتھ
کو ممکن کیا پہاڑ توڑے گا
عشق نے نور آرمائی کی
سامری کی کو دل بیاہی کی
نسبت اس آستان سے کچھ نہ ہوئی
برسوں تک ہم نے جیسا فی کی

دل جادو ہے جوں رو کے شبنم نے کہا گل سے
اب ہم تو پہلے یاں سے تو رہو رہا چاہے
رنگ گل و بو گل ہوتے ہیں ہوا دونوں

کیا قائلہ جاتا ہے ہو تو بھی جلا جائے

آئے ہمارے ہمد سے وحشت کو جائیگی
سیکارتہ سائے ہے نچرن اب نواں میں نے
دیکھے دیار حسن کے میں کارواں بہت
لیکن کسوئے پاس سماع زلفا نہ تھی

آتا نہیں خیال میں خوش رو کوئی کچھو
دل میں سودے کے جیت پر حضور یار
تو مار ڈالو نہ مجھے اس نگاہ سے
نکلنا نہ ایک حرف بھی میری زبان سے

روشن ہے چپکے مرنا پروانے کا تو لیکن
اے شمع کچھ تو تو کہہ تیرے بھی تو زبان سے

یہ چشم آئینہ دار رو تھی کسو کی
سحر پائے نعل بے خودی ہم کو آئی
علیٰ شب اک شعلہ دل نے ہم کو
نہ تھے توجہ سے نازک میانان گلشن
دم مرگ دشوار دی جان ان نے
نظر اس طرف بھی کچھ تھی کسو کی
کہ اس سست پہاں میں برقی کسو کی
کہ اس تند کسر میں خو تھی کسو کی
بہت تو کھر جیسے نو تھی کسو کی
مگر مسد کو آرزو تھی کسو کی

مرزا محمد رفیع سودا

چھینٹ باد بہاری میں جن بخت گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر نے گل بادوں کا

گلا لکھوں میں اگر تیری بے وفا کی کا
دکھاؤں گا تجھے زہد اس آفت دین کو
لو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا
خلل دماغ میں تیرے ہے پار سائی کا

زبان بے شک میں تاجرِ شکرانی کے کہ جس نے دل سے مٹا، غلشِ پانی کا

کہتے تھے ہم زدیہ مکینِ رونا بھر کو پر جو خدا دکھائے سو لاچار دیکھنا

اس گلشنِ ہستی میں عجب یہ ہے لیکن بس کا نیچے کھلی گلی کی تو موسم ہے خزاں
لیکن کفرِ خواہاں نہیں وارِ غلشِ گلیں کو

تو، تزارِ عشق میں شیریں سے کو ممکن شے ردِ سیاہِ غم سے تو یہ بھی ہو سکتا
بازی اگرچہ باز سے سر تو کھو سکتا

سو تو تر تارِ دل ہے اتنا تو نہیں رو کیا جائے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

روا کہتے تھایا سے ایک موبہ غرض او دھڑکھلی جز لعلِ ایدھر دل بھر گیا

سو دایہ کیا کرے گمانت اس قدر کھارونا عالم کو اسے دو آنے مت ساتھ لے ڈیونا

بھگدوسِ مجھ پر مت اس سے ہو سو ہوا
مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
بے بیچارے سر زخمِ دل تکس یار
ہے سن کے مری بر کدِ شست وہ ہے رحم
یہ کون حال ہے احوالِ دل پر لے آٹھو
دیا اسے دل دیں اب یہ جان ہے سودا
یلاکشانِ محبت پر جو ہو سو ہوا
مرے ہو کو تو دامن سے دھو ہو سو ہوا
کوئی سیو کوئی مریم کرو ہو سو ہوا
یہ کون ذکر ہے جانے ابھی دو ہو سو ہوا
بھوٹ بھوٹ کے آٹنا ہو ہو سو ہوا
پھر آگے دیکھئے جو ہو ہو ہو سو ہوا

یاں پھر اس شرم سے عیسیٰ نے گذارنا کیا چشمِ خواہاں کے جو ہمار کا چاراز کیا

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جسے غم سے شیشہ یہ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

برابری کا تری نگل نے جب خیال کیا جمالِ یار نے نہ اس کا خوب نال کیا

ہر ہرزہ میں مجھ کو ہی نظر آتا ہے تم بھی ٹمک دیکھو تو صاف نظر آئے کہ نہیں
پائس ناموس مجھے عشق کا ہے لے بسمل درازیاں کون سا اندازِ نساں ہو کہ نہیں

تو نے سودا کے تیل کی کیا کہتے ہیں یہ اگر سچ ہے تو ظالم سے کیا کہتے ہیں

کیفیتِ چشمِ اسکی مجھے یاد ہے سودا ساغرِ کور سے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں تڑپے ہے مرغِ قبل نما آشیانہ میں
کیوں کر نہ چاک چاک محوِ بیان دلِ کرفس دیکھوں جو تیری زلف کو میں دستِ شایہ میں
ہم ساتھ تو ایک ہمیں گجھ سے ہیں محوِ جادیکھ لے تو آب کو آئینہ خازن میں
سودا خدا کے واسطے کو قصہ مختصر اپنی تویندازِ محو تیرے فسانہ میں

ساقی ہے یک تبسم گل موسم بہار ظالم بھرے ہے جام تو جلد ہی بھر دیا

خوبن میں دل ہی کی خوش کم بہت ہے یا خواہاں عیاں جو چاہو تو عالم بہت ہے یا

چشم ہوس اٹھائے تماشے سے جون جہاں ناوید فی کاوید بس ایک دم بہت آیا
 دیکھا جو باغ دہر تو مانند صبح و گل کم فرصتی غلاب کی باہم بہت بنے ماں
 سودا کہہ اس سے دل کی تسلی کے واسطے گوشہ سے چشم کے نگہ کم بہت ہے یاں

بل بے ساقی تیری بے پروا ایساں جانیں شاقوں کی لب تک آئیاں

وے صورتیں الہی کس ملک بستیاں ہیں اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترسٹیاں ہیں

یوں پاس بٹھا تو جس کو چاہے پر جاگہ نہ دیکھو یار جی میں

یار آذر دہ ہوا رات جو مے نوشی میں کیا ہوا ہم سے خدا جانے بے ہوشی میں

اس کشمکش سے دام کے کیا کام تھا ہیں اے الفت چمن تراخانہ خراب ہو

ترغیب نہ کر سیر چمن کی ہمیں سودا ہر چند ہوا خوب بے پرواں لیک ہوس کو

مے نشاں: روح جاری بھی کبھی شاد کرو ڈٹے گریزم میں شیشہ تو ہمیں یاد کرو

اب تو میں چھوڑنے کا نہیں اس کو ناصحا ہونی جو کچھ تھی قبل محاجات ہو گئی
 مستی سے اس نگاہ کی لے محنت خبر دنیا تمام بزم خرابات ہو گئی
 یار وہ شرم سے جو نہ بولا تو کیا ہوا نظروں میں سوطح کی حکایات ہو گئی

گل پھینکے ہے غیروں کی طرف بلکہ ٹھہری اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

کیا ضد بے مرے ساتھ خدا جانے وگرنہ
سمو آتری فریاد سے آنکھوں میں گئی ترا
کافی ہے تسلی کو میرے ایک نظر بھی
آئی ہے سحر ہونے کو ظالم نہیں مر بھی

نسیم جی تو ہے چہ میں اور صبا بھی ہے
ترا غرور مرا غمزہ تا کجا ظالم
ہماری خاک سے کچھ دیکھو یہ رہا بھی ہے
ہر ایک بات کی آنکھ کچھ اتنا بھی ہے
سب کچھ رکھو قدم دشت خار میں نہ
کہ اس ذرا میں سودا پر نہ پانچ بھی ہے

جس رہ زکسی اور پہ بیدار کرو گے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کر گے

بے وفائی کیا کہیں دل ساتھ تجھ جو بکی
تیری نسبت تو بیاں بیل سے گل نے خوب

اے ہر صغیر فائدہ ناصحتی کے نور کا
ہم تو نفس میں آن کے خاموش ہو گئے

پاس اب ہمارے نہمت گل کو نہ لایسم
دل سے ہوس چن کی اسیروں نے دو کی

دلفت میں کچھ اپنی بھی اڑ چاہیے سو آ
ہر چہ نہ وفا شیرہ محبوب نہیں ہے

خواری کا نہ کرا اپنی دلایار سے شکو
رہو ابو ہوا عشق میں کمال تو مہی ہے

خواجہ مسیح درو

جنگ میں آگ اُدھر اُدھر دیکھا تیری آیا نظر جدھر دیکھا
جان سے ہو گئے بدن خالی جس طرف تونے آئے تھو بدھو دیکھا
نالہ سنہ یاد و آہ اور نزاری آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا
اُن نبوں نے نہ کی سیجائی ہم نے سو سو طرقات مر دیکھا
زور عاشق مزاج ہے کوئی دراد کو قصہ مختصر دیکھا

ہم نے کس راست نالہ نہ کیا پر اُسے آہ کچھ اثر نہ کیا
سب کے ہاں تم ہوئے کرم نرما اس طرف کو کبھی گذر نہ کیا
دیکھتے کو رہے ترستے ہم نہ کیا جسم تو نے پر نہ کیا
کون سا دل ہے جس میں غائب کون آباد تو نے گھر نہ کیا
سب کے جوہر نظر میں آئے درو بے ہنر تو نے کچھ ہنر نہ کیا
ساقی مرے بھی دل کی طرف ملک جا کر لب لشنہ تیرے ہی بزم میں یہ جام نہ کیا

ہم جانتے نہیں ہیں درو کیا ہے کعبہ جید مرطے وہ ابرو اودھر نماز کرتا

جواب بن یار تھے آپ ہی ہم نکلی آنکھ بب کوئی پروا نہ لکھتا

کبھی خوش بھی کیا ہے دل کسی گمراہی کا بھڑا دے منہ سے نہ ساقی ہمارا اور گلابی

۱۔ قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا پر ترے ہمد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلہ کے حضور
 ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صبر کیا لیکن
 باوجودیکہ پردہ بال نہ تھے آدم کے
 غلبہ آج تو نہیں نے میں تیرے ہاتھوں
 درد کے ملنے سے لے یا ربرا کیوں ملنے
 شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کس نور نہ تھا
 میں نے پوچھا تو کہا خبر یہ مذکر نہ تھا
 پہنچا اس جا کہ فرشتوں کا بھی عقد و نہ تھا
 دل نہ تھا کوئی کہ پیشے کی طرح چور نہ تھا
 اس کو کچھ اور زواید کے منظور نہ تھا

سینہ و دل حشرات سے چھا گیا
 میں نے تو ظاہر نہ کی تھی دل کی بات
 بس ہجرم یا بس جی ٹکھرا گیا
 پر مری زنجیر اس کے ڈھبائے پائیا

گونا گونا رسا ہونہ ہو آہ میں اثر
 میں نے تو درگزر نہ کی جو مجھ سے ہوگا

سہیلی کو کوئی دم دیکھ سکا لے فلک
 اور تریاں کچھ نہ تھا ایک سکرہ بکھٹا

جگہ میں کوئی نہ نکاہنا ہوگا
 اس نے قصداً بھی میرے نالے کو
 دیکھئے غم سے اب کے جی میرا
 دل زمانے کے ہاتھ سے سالم
 حال مجھ غم زدہ کا جس تس نے
 دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں
 قتل سے میرے وہ جو باز رہا
 دل بھی اسے درد قطرہ خون تھا
 کہ نہ پہنتے ہی رد دیا ہوگا
 نہ سنا ہوگا گرسنا ہوگا
 نہ پئے گا پئے گا کیسا ہوگا
 کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا
 بسبب سنا ہوگا رد دیا ہوگا
 کہیں غصہ کوئی کھلا ہوگا
 کسی بدخواہ نے کہا ہوگا
 آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

لسان کاغذ آتش زدہ مے گل رو
 ترے جملے بھنے اور ہی بہار رکھتے ہیں

ہمارے پاس ہے کیا جو کس خدا تجھ پر
فلک سمجھ تو سہی ہم سے اور گلو گیری
ہوں کے جور اٹھائے ہزار ہا ہم نے
ہر ایک سنگ میں ہے شوخی بتاں بہاں
وہ زندگی کی طرح ایک دم نہیں رہتا
اگر چہ درد اُسے ہم ہزار رکھتے ہیں
مگر یہ زندگی مستغفار رکھتے ہیں
یہ ایک جیب سے سوتا رہتا رکھتے ہیں
جو اس پہ بھی نہیں اختیار رکھتے ہیں
خدا یہ سب ہیں دل میں سرور رکھتے ہیں
اگر چہ درد اُسے ہم ہزار رکھتے ہیں

نئے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پر چین ہو س رنگ بو کر

ترداسنی پیشینہ جاری نہ جائے
دامن نہ چھوڑیں تو زشتہ وضو

ہر چند تجھے صبر نہیں درد و لیکن
اتنا بھی نہ ٹھوکر وہ بدنام کہیں

خدا جانے کیا ہو گا انجام اس کا
تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا
کسو کو کسو طرح عزت ہے جگ میں
نظر میرے دل کی پڑی درد کس پر
میں بے صبر آتا ہوں وہ تند خو ہے
تری آرزو ہے اگر آرزو ہے
مجھے اپنے رونے ہی سے آرزو ہے
جدھر دیکھتا ہوں وہی رو رہے

تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
کیا ہمیں کام دن گلوں سے اے صبا
دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس
شع کے مانند ہم اس بزم میں
ڈھونڈتے ہیں آپ سے اس کرپے
کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے
ہم تو اس جینے کے ماتھوں مر چلے
ایک دم آئے ادھر ادھر چلے
تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے
چشم تر آئے تھے دامن تر چلے
ریخ صاحب جھوڑ گھر باہر چلے

ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے وہ ہی آرزو آگیا ہیرہم پہلے
 جو ان قرار ہستی ہے بودیاں پار سے ہم بھی اپنی باہی پہر پہلے
 ساتیاں لگا رہا ہے چل چلاؤ جب تک اس چل سیکر انفرجیلے
 درد کچھ معلوم ہے یہ توں سب کس طرف سے آئے تھے کیر صر پہلے

ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے تجھے سوا بھی جہان میں کچھ ہے
 دل بھی تیرے ہی ڈھاک سیکھا ہے آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے
 درد تو جو کرے ہے ہی کا زیاں فائدہ اس زیاں میں کچھ ہے

اس طرح سے یک محنت جو آنسو نہیں بھرتے معلوم ہوا درد کہیں آنکھ لڑی ہے

تیری گلی میں میں نہ چوں اب صبا پہلے یوں ہی خدا جو یہاں ہے توبہ کا کیا پہلے
 کہہ میٹھو درد کہ اپنی دوا ہوں میں اس بے وفا کے آئے جو ذر و وفا پہلے

دل بھلا ایسے کوئے درد نہ دیکھے کوئی ایک تو یار ہے اور تیرے ہر طرف بھی ہے

یہی پیغام درد کا کہتے گریبا کوئے یار میں گزرے
 کوئی رات آن بیٹے گا دن بہت انتظار میں گزرے

روندے بے مثل نقش قدم خنیاں مجھے اے معرفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

ارض و سما کہاں تری دست کو پاسے میری دل ہی وہ کہ جہاں تو سما کے

خیر بیتی لے اے گلستانِ خوبی کرے ہے تبسمِ حیرا گلِ فردوسی
 دشوار ہوتی غلامِ تجھ کو بھی نیند آتی لیکن سنی نہ تو نے ٹک بھی مری کہانی
 میرے غبار کا کچھ پایا نشان نہ ہرگز صحرائیں جا صبا نے ہر چہ خاک چھانی
 ست جا تروتازگی پہ اس کی عالم تو خیال کا چمن ہے

سید محمد میر سوز

ہر اہلِ کوہیں کہتا کہتا دوانا پر اس بے خبر نے کہا کچھ نہ مانا
 کوئی دم تو نہ بٹھے رہا پاس میرے میاں! میں بھی چلا ہوں ٹک کے جانا
 مجھے تو تہاری خوشی چاہیے ہے کہیں تو ہے منظور میرا کڑھانا
 کہاں ٹھونڈوں کی کہی کہ جاناں یارب کہیں جاں کا پاتا نہیں میں ٹھکانا
 تڑپتی کیوں ہے لے بلبس کمال اتنا پید کر کہ تیرا شک جس جا کر پڑے گلزار ہو پیدار
 قتل سے یہ بے گنہ راضی ہو اپنے اس لئے ماتھے میں ایک روز تو داماں قاتل ہو دے گا
 کعبہ بی کا اب قصہ یہ گمراہ کرے گا جو تم سے بتو ہو گا سوا اللہ کرے گا
 کہتا نہ تھا میں لے دل اس کام سے تو باز آ دیکھا مزانہ تو نے نادانِ عاشقی کا

مجھ کو دھوکا دیا کہا کہ شراب لے ان آنکھوں کا ہوئے خانہ خراب

نافرستوں کی راہ ابرئے بند جو گنہ یکھئے طغواب ہے آج

بھلائی میرے تو آئے گئے ادا ساق بیٹھ ہے، عشق تیری شرکت و شاق
میں غم یار ایک دن دو دن اس سے زیادہ نہ ہو جو مہمان
نہ کہ بیٹھے جو پاؤں پھسلا کر اپنے گھر جاؤ خانہ آباد ان

وہ صورتیں بنائے کس میں بیتیاں ہیں اب دیکھنے کو جن آنکھیں تیتیاں ہیں

مرا جان جاتا ہے یار و بچالو کلیجہ میں کاٹا گڑا ہے نکالو
نہ بھائی مجھے زندگانی نہ بھائی مجھے مار ڈالو
خدا کے لئے میرے اے ہم نشینوں وہ بانکا جو جاتا ہے، سکو بلالو
اگر وہ خفا ہو کے کچھ گالیاں دے تو دم نکھا رہو کچھ نہ بولو نہ چالو
نہ آوے اگر وہ تہا لے کچھ سے تو منت کرو گھبرے گھر سے منالو
کہو ایک بندہ ہوتا رہا رہے ہے اُسے جان کندن سے میل کر چالو
جلوں کی بری آہ جوتی ہے چلیے تم اس سوز کی اپنے حق میں دعا تو

او مار سیاہ زلف پر سج کہہ بتلا دے دل جہاں چھپا، ہو
کنڈلی تلے دیکھیو نہ ہو وس کاٹا نہ ہنسی ترا بُرا ہو

دل کے ہاتھوں بہتہ خراب ہوا جل گیا بل گیا کہا اب ہوا
اشک آنکھوں سے پل نہیں تھکتا کیا بلا دل ہی دل میں آب ہوا

یار اغیار ہو گیا یہاں کیا زمانے کا انقلاب ہوا

ہم نہ دیکھو آئینہ کا ترے تاب لائے خورشید پہلے آنکھ تو تجھ سے ملا کے

ایک آفت سے تو مر کرے ہوا تھا جینا پڑ گئی اور یہ کیسی سے اٹھ گئی

نہ ہے یا انتظار ہے کیا ہے دفن جواب بے قرار ہے کیا ہے

شیخ قیام الدین تاتار

حیرت دہانی سے نہ اس تک دل رہنمائی مر نہ عشق کا یاں حسن سے بھی دور گیا

قسمت کو دیکھ لڑتی ہے جا کر کہاں گند دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا

سنا ہے یہ دل کا اسے کہے گا کون پیامبر کے ہیں ساتھ آپ عاتاقا

دو دو دل کچھ کہا نہیں جاتا آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

ہر دم آنے سے میں بھی ہوں نادم کیا کردوں پر رہا نہیں جاتا

مجھ سا جہاں میں کوئی بھی آشفتم سر نہیں

ہے یوں تو زلف یار بھی پر استدر نہیں

اس حسن نیم رنگ کے صدقے کہ جس کے زج
ہلکی سی ایک شوخی کی تہ ہو حیا کے ساتھ

اک ہمیں خار تھے آنکھوں میں سبھی کی سوچے
بند خوش رہا اب تم گل رنگزار کے ساتھ

دانا گل تیں ہے کہاں دسترس مجھے
تکلیف سیر باغ ذکر اسے ہوس مجھے

دو چیز ہیں یادگار دوران تیرا ستم اپنی جان فشانے

عشق تو قائم : ہوا آپ سے اور ہی کچھ پیشہ کیا چاہیے

دل ڈھونڈھتا سینہ میں کی مٹھتی ہے اک ٹھہرے یاں نکھ کا اور آگ دہی ہے

انعام اللہ خاں یقین

فصل گل بھی آن پہونچی دیکھئے کیا ہو یقین
اب کی چلتا ہے جنوں پر جی ہمارا بے حرج

بہار آخر ہوئی ہے اب تو سینے دے گریباں کو
یقین کرتا ہے کوئی اس قدر دیوانہ پن بس کہ

کعبہ سے ہم گئے نہ گیا پر جنوں کا عشق
اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے دین مجھ کو
کہنا نیش کر گیا ہے غلام دوانہ جن میں

رو وادعت کی ست پر چھ پتھین مجھ سے
کیا خوب نہیں سنتا فوں ہے یہ افسانہ

اگر زنجیر سے پیریں ڈالی تو کیا ہوگا
یہاں آنے دو میرا ہاتھ ہے اور یہ کربا

خواجہ احسن اللہ بیان

مصلحت ترک عشق ہے نامح یک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا

کہتا نہیں میں عرش پر اے نالہ جا پہنچ
کانوں ملک تو اس کے تو اے نارسا پہنچ

ہم سرگزشت کیا کہیں اپنی کدش خار
پامال ہو گئے ترے دامن سے چھوٹا

کیا ہوا عرش پر گیک نالہ
دل میں اُس شوخ کے توراہ نہ کی

رہوا ابھی سے کرتی ہے اسے جیستہ تر سمجھے
 آہ بیت اس کی بزم میں بارہگر بجھے

سیرتِ سحرانگہ

تیرے تھکے تھکے کام و تھکے تھکے بندوں سے تیرے
 پر دل کے ساتھ صفت میں بدنام ہو گیا

بے دانا سیری کچھ نہیں تھکے سیر
 جو کو سیری وفا ہی رہیں نہیں
 یوں خدا کی خدائی برقی بہت
 پر ہیں تو اثر کی آس نہیں

مرد پختہ کہاں تک اب رنگدہریاں
 بزم نہیں اس آہ میں یا آسماں نہیں
 رہا پہنچنے کو لگا لگا تو ایسا بنوایا میں
 وہ کھل جائیں گے وہ چلے طلاقوں میں

یاں تعاقب میں اپنا کام ہوا
 تیرے تو دیکھ جوا ہی نہیں

مانا اثر کو و علوٰۃ فردا غلط نہیں
 لیکن کٹی نہ آج یہ شب انتظار کی

غرض آئینہ داسی دل سے
 تیرا جلوہ تجھے دکھانا ہے

کر دیا کچھ سے کچھ ترسے غم نے
 اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

ہر چیدہ جی بڑھری پھر ہم ادھر عزائیں
 آخر نہ رہے ہم بے اختیار آکے

دل نے تھمے آگیا سوکھا کھیا کہوں بہر بان دینا ہے

دل مرا یک سے لڑا لے پھرتے ہو کیا کچھ تو ہم سے بھی نرا سیٹے لگی
آقا تھا تو الفت اس نمود کی ہر کسب کی وفا نہ کھا بیٹے گا

فرست زندگی بہتاکم ہے منتقم ہے یہ دین جو دم ہے

شیخ غلام ہمدانی مصحفی

جلی بھی جا جس غنچہ کی صدا پر نسیم کہیں تو قافلہ نو بہار بھرے گا

خواب تھا یا نیاں تھا کیا تھا ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا
جھکی بجلی سی پر نہ سمجھے ہم حسن تھا یا جہاں تھا کیا تھا

نہ دشت محبت کو سرسبز دیکھا کئی بار خضر اس بیاباں سے گذرا
ہوئے فرش گل اس کے ہر قدم پر جو دامن کشاں وہ گلستاں سے گذرا

عشق مجھے اہل بصر کر گیا اشک کے قطرے کو گہر کر گیا
رہ گئے ہم سوتے ہی افنوس ہے قافلہ صبح سفیر کر گیا

کہتے ہیں کہ پیر فصل گل آئی ہے جنت میں کیوں دست برفون دھوم مچانے نہیں دیتا

اس چشم کی گردش نے مجھے ہی گئی تھی پڑھنی اپنے تئیں میں زہر سمجھا لا

کیا یہ میں نام کی کوئی شاہزادی کا باں عمر کو وقتہ ہے پران سحری کا
تو بہت پہری ہوگئی تھی تازہ پڑھ لے احسان ہے مجھ پر یہ نیشم سحری کا

میں وہ ہونگی کہوں کیا میرے سے لوش نے رات
سر پہ ساقی کے کس انداز سے ساغر مارا
مٹھنی شہنشاہ کی داوی میں سمجھ کر جانا
آدی جائے ہے اس راہ میں اکشر مارا

اک طرف مے کدین صحت ہوئی کہ رات زہاد کے سرے بخیہ دوستار لے گیا
ہرگز بجی نہ جلس دن اگرچہ مٹھنی سو بار اس کو میں ہر بازار لے گیا

شونہ تو دیکھو تیر کو سینے سے بچنے کر کہتا ہے میرے تیر کا پیکان رہ گیا

کیا یا رے دامن کی خبر بوجھو ہو ہم سے باں ہاتھ سے اپنا ہی گریبان گیا تھا

درد و غم کو بھی ہے نصیبہ شرط یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا

مٹھنی ہم تیر سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا ہکا

شام ہی سے بچھا سادہ تھا ہے دل ہوا ہے چہرے سسکنا

تھوڑا کو کھینچ ہنس پڑے وہ بے مصحفی کشتہ اس اوکا

بہ نفس میں ایسے مجھ کو تو اسیر کیجھو صیاد
کہ گھڑی گھڑی وہ ہوئے دم مضرب انسا
میرے دم لٹنے کی جو خبر سکوری کسی نے
وہیں نیم رہے تمام رہ بعد لٹنے انسا
میں عجیب یہ رسم دیکھی مجھے روز عید قرباں
وہی ذبح بھی کئے تھے وہی لے کر انسا

ایک تیر میں جب اس نے نشانہ اڑا دیا
اس وقت تھکے تھکے ہیں زمانہ اڑا دیا
دست جنوں سے جب کہ نکلیں اڑنے و بولنے
ہم نے بھی اپنا جیب سٹانا اڑا دیا

تیرے کو پچے ہر سائے مجھے دن سہرات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا
تجھے کس نے روک رکھا تیرے جی میں کیا لائی
کہ گیا تو بھول عالم ادھر انکسار کرنا

بے گانگی ہے اسکی ملاقات میں ہنوز
واحسرا کہ فرق ہے دن رات میں ہنوز

اے مصحفی اس کو چہ میں دل بسکہ لگا ہے
جاتے نہیں اور کرتے ہیں ہم عزم سفروز

پہنا جو میں نے جامہ دیوانگی تو عشق
بو لاکہ یہ بدن پر ترے سچ گیا لباس

دیکھا ہے تجھے جلوہ کناں جب چمن میں
ہر گل کی ڈرائی ہے نیم سہری رنگ

اس کبدن حسی لپکتا نہیں تو پھر
لبریز آب و رنگ ہے کیوں پیر من تمام

برق و سیلاب نے کہاں پایا
اس دل بقیہ دار کا عالم
نکلے ہے اس کی زلف پر خم سے
سنبل تابدار کا عالم

آئے درائے جس کے لئے چاک کیا ہو
ناصح سے گریباں کو سنانے کے نہیں ہم

اور سب تم سے دور سے بیٹھے ہیں
لیک ہم ہیں کہ پر سے بیٹھے ہیں
پہنچ چکا جب سے گریباں تب سے
باقیہ پر باقیہ دھرے بیٹھے ہیں
شیشے کی طرح لے ساقی
چھیر مت ہمکو بھرے بیٹھے ہیں
مصفیٰ یا رب کے گھر کے آگے
ہم سے کہنے گھر سے بیٹھے ہیں

رہنے دو میرے سینے میں سیکان کو نہ چھڑو
از بہر خدا تو ک جاناں کو نہ چھڑو
لہذا رحم کرو چاک گریبان پہ میرے
یار و کوئی اس شوخ کے داماں نہ چھڑو
اس دھوم سے آتی ہے ہمارا بچا کہ ہر سو
قدغن ہے کہ برگ گل و ریاں کو نہ چھڑو
یہ وہ نہیں آنا سو رک ہو بند کسی سے
بہنے دو میرے دیدہ گریباں کو نہ چھڑو
اے نا صحو کچھ فکر کرو چاک جگر کا
بیہودہ مرے چاک گریباں کو نہ چھڑو
زینین می زائد سے اونٹنی ہیں تو انھیں
کہتی ہیں کہ اس مرد سمان کو نہ چھڑو
رہنے دو پڑا مصفیٰ خاک بسر کو
اس غمزدہ بے سرو سامان کو نہ چھڑو

ہوا ہے عشق کا اظہار دیکھے کیا ہو
سبھی ہے اس نے بھی تلوار دیکھے کیا ہو
تعاظلوں نے تری ہم سے روزِ عشرت
دکھا ہے وعدہ دیدار دیکھے کیا ہو

واں چشم فوں سونے باتوں میں لگایا
رے بیچ اوجہ زلف اڑالے گئی دل کو

ب زخم جگر سے ہی بنے ۴۹ خون دل ہم کو اب پئے ہی بنے
 دل گرا ہی پڑے ہے سینے سے دب یہ دل ہاتھ میں لئے ہی بنے
 بار کا صبح پر ہے وعدہ وصل ایک شب اور بھی جئے ہی بنے

کچھ قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر فصل بہار باغ میں دھویں بھائی گئی

مرغان تیز بال سے شکوہ ہر کہ ہائے ہم کو اسیر جنگل صیاد کر گئے

حسرت پہ اس مسافر بیکس کی رشتے جو تھک گیا ہو بیٹے کے منزل کے سامنے

برق رخسار بار پھر چمکی اس جن کی بار پھر چمکی
 میرے گریہ سے آب تاب آیا صورت روزگار پھر چمکی

میں وہ نہیں ہوں کہ اس بت سے دل مرا پھر جائے
 پھروں جو اس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے
 ذرا جواب تو دے اٹھ کے اپنے سائل کو
 یہ بے نصیب ترے آستان سے کیا پھر جائے

کون اس باغ سے لے باد صبا جاتا رہے رنگ رخسار سے پھولوں کے اڑا جاتا رہے
 دل کے دھڑکوں کا یہ عالم ہے کہ بے منتہی پڑے ہو ہو کے گریبان اڑا جاتا رہے

ہے غریبی میں خبر کس کو وطن والوں کی کیا گرفتار سے پوچھو ہو چین والوں کی

اے دست جنوں تیری مدد ہووے تو اب بھی
 ایک جھٹکے میں لگتا ہے گریبان ٹھکانے
 اے مٹھنی اس زلف میں لاکھوں کو ملی جا
 لیکن نہ لگا آگ یہ پریشان ٹھکانے

دخن کے ہیں نہ تکلیف کرتا صبح ہیں ان دنوں چاک گریباں کا سونا منج

ملنے کو جو تم جا ہو تو ہے بات ذرا سی
 نرگس تری آنکھوں کو بہت دیکھ رہی ہے
 ایک آن میں ہوتی ہے ملاقات ذرا سی
 ہو جاوے تنگا ہوں میں مکافات ذرا سی

ادوا من اٹھا کے جانے والے تک ہم کو بھی خاک سے اٹھالے

تو دیکھے تو اک نظر بہت ہے الفت تری اس قدر بہت ہے

مجھ کو پامال کر گیا ہے یہی یہ جو دامن اٹھائے جاتا ہے

گل کو نسبت ہے اسی واسطے باہل جزو وضع میں اسکی جو ایک جامہ دری بکلی

باد و تو میں کہتا نہیں پہنچوں میں اتنا
 خالی ہی چلے آتے ہیں ہم سیر جن سے
 دشت تری نرگس فغان میں کچھ ہے
 دامن میں کچھ ہے نہ گریبان میں کچھ ہے

بیل کے مشت پر بھی اڑاؤ تو سیر ہے
 نالے تو ہم نے داؤ دی غربت میں سر کٹے
 غنچوں کو چٹکیوں میں تو آخر اڑا چلے
 پر خشتگان خاک کو ناحق جگا چلے

کھول دیتا ہے تو جب عا کے چمن میں لٹیں پارہ زنجیر نسیم سہری نکلے ہے
مصحفی کس کے کھلے بال تو دیکھ آیا ہے کہ تری وضعتے شوریدہ سہری نکلے ہے

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے ہم نے اس شرخ کو مجبور کیا دیکھا ہے

شاد ہو تو اے شب مجسمہ جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی

کڑا ہے جب چمن میں تازک ہنال میرا ہر شاخ گل نے اپنے سر کو جھکا دیا ہے

میں وہ نہیں ہوں کہ اس بت سے دل مرا جڑے
پھروں جو اس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جانے

اسما کمان کج قبض آئی ہے بہار ایسے میں تم بھی دھوم بجاؤ تو خوب ہے

خامچرائے جنوں اہست درازی تے ی چاک جاتے ہیں گریبان کو مے داناں کے

ادیدہ! شرط گریہ ابر بہار سے اتنا تو کھیو کہ مری آبرورے

رملوک اب تو گریبان سے نئے دست جوں چاک اک جھٹکے میں تا دامن بھرتے پہنچے

جو کچھ شکستہ قبض کی بھی تیلیاں ملتیں تو ہم انھیں کو خس و خوار آشاں کرتے
ردی فلک نے ہیں فرصت اس قدر وژ کسی طرح تو ترے دل کو بہر باں کرتے

خواجہ میر حسن، حسن

کیا قتل اور جان بخشی بھی کی حسن اس نے احساں دوبار کیا

اظهار خوشی میں ہے سوطح کی فریاد ظاہر کا یہ پردا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

امٹدے آنکھوں سے یک بار بہ چلے آنسو سہسی سہسی میں جو ذکر و دایا رہا

دامن صحرائے انہنے کو حسن کا جی نہیں پاؤں دیوانے نے پھیلائے بیاباں دیکھ کر

اسکی جب بزم سے ہم ہنکے بے رنگ آتے ہیں اپنے ساتھ آپ ہی کرتے ہوئے جنگ آتے ہیں

پھر چھڑا حسن نے اپنا قصہ بس آج کی شب بھی سوچکے ہم

اترا یونٹ حسن پہ نادان بہت کچھ دیکھا ہے ان آنکھوں نے مری جان بہت کچھ

اس بت کی بندگی سے آزاد ہو حسن یہ بات بھی کہیں نہ خدا کو بُری لگے

شب فراق میں رورو کے مر گئے آفر یہ رات جیسی تھی ویسی رہی عمر نہ ہوئی

کیا جانے کہ فتح سے کیا صبح کہہ گئی اک آہ کھینچ کر جو وہ خاموش ہو گئی

شبلم کی طرح میری چمن بھی ضرور ہے رو دھو کے ایک رات یہاں بھی گزاریے

ہے بڑا کفر ترک عشق بستیاں اپنا ایمان ہم نہ چھوڑیں گے
دل نہ چھوڑے گا تیرا دامن اور دل کا دامن ہم نہ چھوڑیں گے

جعفر علی حسرت

دل پر نہیں اختیار اپنا افسوس گیا قرار اپنا
جن نالہ بہار کر رہا ہے یہ سینہ داغدار اپنا
کی دل نے بھی آہ بے وفائی کوئی نہیں غمگسار اپنا

گر ہے یہی بہار کی شورش تو نا صحابہ مجھ سے نہ ہر سکے گی گریباں کی احتیاط

کر تک تو اثر کہ اپنے جی سے اے نالہ بے اثر گئے ہم
شبلم کی مثال اس چمن میں شب آئے تھے ہم سحر گئے ہم

شیخ قلم درخش جرات

جو راہ ملاقات تھی سو جان گئے ہم اے نحضر تصور ترے قربان گئے ہم
جمعیت حسن آپکی سب پر ہوئی ظاہر جس بزم میں بحال پریشان گئے ہم

ایک واقف کار اپنے سے کہتا تھا یہ بات
کیا جانئے کم نعت نے کیا ہم یہ کیا سحر
جو بات کے جو گھبرات کو ہمان گئے ہم
جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

حال اپنا اس کو محض میں جتا سکتے ہیں
دور بیٹھے ان آنکھوں میں یہی کہتے ہیں ہم
دل پڑا تر پیے دے ہم تملتا سکتے نہیں
تم بلا سکتے نہیں ہم آپ آ سکتے نہیں

دور و دل بھی بہت کہا لیکن
روئے ہے بات بات پر جرات
اُس نے باتیں نہ کچھ سینس نہ کہیں
ہے گرفتار یہ کہیں نہ کہیں

لگ جا گئے سے آبا ابے نادین نہیں
کیا رک کے وہ کہے ہے جو شک اس لگ چوک
ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں
بس بس پرے ہو شوق اپنے تئیں نہیں
یوں اور کیا جہان میں کوئی حسین نہیں
کیا جانے کیا وہ اس میں ہے لڑنے کی حق جی

دیکھ لے عیار تو ناک میری بھی عیا ریاں
غواب میں بھی وہ نظر آتا نہیں مدت ہوئی
کرتے ہیں تیرے لئے کس کس کی خاطر داریاں
جاگتے ہی جاگتے کنتی ہیں اتیں ساریاں

کب بیٹھتے ہیں چین سے ایذا اٹھائے بن
جب تک نہ بقیار ہوں پرتا نہیں قرار
لگتا نہیں ہے جی کہیں دیکھا لگائے بن
آتا نہیں ہے چین نہیں تملائے بن
دیوانہ گر نہیں تو پری رو نہ دیکھیں سیر
بگڑے ہے بات حال پریشاں بنائے بن

آہ اس شوق تسک کی اوہر ہو کہ نہ ہو
ہر دم اسکی جو ملاقات میں ہو فرق تو آہ
گذرے ہم جی ہی سے اب کس گذر ہو کہ نہ ہو
حال ہر لحظہ مرا فوج دگر ہو کہ نہ ہو

ہے یہ ڈھب یا دھنسی کا اُسے جو اُس کے کوئی
بس کسی کے تیکس جلدی سے بلالیتا ہے

کیا پچارے سرنگوں میٹھے ہیں اسکی نرمیا
وہ حلقہ شہر میں مشہور بیماروں کا ہے

جو خواہش اس آنکھوں میں کڑوں نظروں ملانے کی
گئے ہو جب تم یاں ہی نہیں بندھ بدھ میں
دل وحشی کو خواہش ہے تہا کے در پہ آنے کی

جی کے لگن جانے کا کچھ با یاد لا تو نے مزا
سوزش پروانہ ہوتی اس طرح کس سے بیان

ہجر میں مضطرب سے ہو ہو کے
نا صحا اس کو چھوڑ دیں کیونکر
گو بلاوے نہ ہم کو وہ جرأت

قشقہ جو وہ کھینچے تو کھینچی جاتے دھیر جا
بیروش سا محفل میں تجھے دیکھ وہ کیا کیا

دیکھوں جرأت اس کو تو کہتا ہے یہ منہ پھیر کے
کن بری آنکھوں سے دیکھے ہے یہ سودا ئی مجھے

صحت اب یار میں اور مجھ میں کچھ شعلہ خوس
جوں جوں میں اس کو بڑھاؤں گھٹاتا ہے مجھے

اس کے آنے تک اسے دل بیار
تو وہ آرام جاں ہے اسے کافر
جس طرح ہو گئے جیسے ہی بنے
کہ گئے سے نکالے، یہی بنے
رہوں جس جا کہیں یہ ہمسائے
اس کو یاں سے اٹھا دیکھ ہی بنے

تو گیا اور ہم تری صورت کو سمجھے رہ گئے
حاشقوں کے دل بلاق یار کے موتی کی طرح
بہتر سے روئے تو پتہ میرے تھے ڈگئے
بوسہ کی خواہش میں اس لب پر تھکے رہ گئے
کارواں جاتا رہا اب اور ہم گم کردہ راہ
ہو گیا غائب نظر سے برق کے مانند وہ
بہتر سے روئے تو پتہ میرے تھے ڈگئے
بوسہ کی خواہش میں اس لب پر تھکے رہ گئے
کارواں جاتا رہا اب اور ہم گم کردہ راہ
ہو گیا غائب نظر سے برق کے مانند وہ

جرات بلند مرتبہ عشق ہے بہت
ہم پست ہمتی سے ابھی ہیں سے سے

غم مجھے ناتوان رکھتا ہے
شوق سننے کا ہے تو سن آکر
شوق بھی اک نشان رکھتا ہے
درد دل کا بیان رکھتا ہے

ہے یہ ہوس کہ نصرت پرواز ایک بار
یہ بھی نہو سکے تو بھلا مجھ اسیر کو
صحن چین میں جھکاؤ بھی لے باغیاں لے
ایک دم قفس میں نصرت آہ و فغاں لے
لے راہرو غیور ہیں بڑا ت کی فیجیو
حسرت زدوں کا تم کو جہاں کارواں لے

محروم ہیں اگرچہ دیدار سے یہ آنکھیں
پر حسن کا کرشمہ دل میں سا گیا ہے

کہاں رنگل میں صفائی ترے بدن کی سی
یہ دھشت خار اب اپنے قدم کی برکت سے
بھری ہواگ کی تس پر یہ بودھن کی سی
قدم قدم پر بہاں ہیں ہوجن کی سی
جہتاؤں درد محبت تو کس اداسے کہے
کرو نہ مجھ لے یہ باتیں دیوانہ پن کی سی

وہ ایک تو ہے مہجہو کا ساتھ لے جرات اتر تو بھی قیامت ہے بانگ بین کی سی

اجل گر اپنی خیال جہاں یاریں آئے تو پھر بجائے فرشتہ بری خیز میں آئے
 بیک کر شد جو بے اختیار کر ڈالے وہ عشوہ ساز کسی کے کب اختیار میں آئے
 پس ارفنا جو تو دل چلے گی خاک اٹھے تو مضطرب سا دھواں اک نفر غبار میں آئے
 اٹھے جہاں سے نہ جرات اٹھ کے در در فراق الہی موت بھی آئے تو وصل یاریں آئے

دور چھوڑا میں گلشن سے یہ رونے کی ہے جا کہ مرزاوار اسیری بھی نہ ہم ہاسم ہوئے
 دم و شخصیت کہے جرات کوئی اس کا فرسے اک سلطان کو کیوں جاتے ہو تر پائے ہوئے

مطف بنے یار ہیں سپر گلستان کبے دیکھے دیدہ گریاں گل خندان کبے
 آنکھ جس سے ہو گئی وہ ہی ہوا اس تو پھر رنگ آنکھوں میں نضائے چنتاں کبے
 جرات اب بند ہے تنخواہ تو کہتے ہیں یہ ہم کہ خدا دیوے نہ جب تک تو سیماں کبے

ازل سے گرفتار پیدا ہوا ہے دل کا مزے دار پیدا ہوا ہے
 کہو منہ ناصح کو ہم سے نہ بولے کہاں کا یہ خمخوار پیدا ہوا ہے
 کہے گر کوئی اس سے ملنے کو جرات تمہارا طلب نگار پیدا ہوا ہے
 تو کہتے ہے وہ از رہ طبع ہاں جی یہی تو خریدار پیدا ہوا ہے

قصہ خصل سے وہ اٹھنے کا کرے ہے حقیقت دل بیتاب وہیں مجھ کو تبا دیتا ہے
 ہم تین مت ہو خفا گردہ سنوں بات قوی اک تصور ہے کہ وہ دھیان ٹا دیتا ہے

از بسکہ دل سے جرات نہ کہیں جس کے ہم سجدہ کریں اسی میں مسجد جو ہے پری کی۔

ہماری تھے قافلے سب فدا دے ہماری بے تابیوں کے مارے ہم کارواں سے نکلے
شب بزم یار میں ہم بیٹھے تو تھے اسکی جتوں سے تھا یہ ظاہر شخص ہمارے نکلے
اس انجمن میں جرات سب کو میاں آئے حسرت بھرے پورا مان اک ہم وہاں سے نکلے

مجھ سے پوچھے ہے مجھ کو کہ حقیقت میری کچھ تو ہے بے خسروی بات بنانے دے مجھے
انگلیاں پاؤں کی اب اپنی وہ دہرائے ہے کچھ تو ہے پاس ادب باد بڑھانے دے مجھے
تو بھی پھر پوچھو جرات سبب حیرانی پہلے آئینہ ذرا اسکو دکھانے دے مجھے

مت خا ہو یک دم یاں میٹھے سے سقدہ تک نہیں سن دیکھ کر اے مہراں اٹھ جائیگے
ہم بھی اس ناغہاں میں شب کی شبہاں کی مثل تنہم صبح کو گریہ کیاں اٹھ جائیگے
تب منع عشق کا سودا بنے جرات بڑبڑا دوسرے سودو زیاں کے سبیاں اٹھ جائیگے

مجھ کو ڈر ہے کہ کرے خسرت زریا یہ کہیں زیر یا اس دل مضطر کو دوائے رکھے
بیٹھیں کیا دور کہ چاہے ہے یہی کشت محو آپ کے زانو سے زانو کو بھڑائے رکھے
جب وہ بکڑے ہے تو کہتے ہیں یہی کار غور منہ بنائے ہوئے تیوری کو چڑھائے رکھے
سوئے محفل میں جو وہ تو یہی جی چاہے ہے روز و شب بس لوں یہی صحبت کو چاہے رکھے
کچھ لگاؤٹ کا سبب اور نہیں پر جرات یہ وہ چاہے ہے کہ اس کو بھی لگائے رکھے

زیرِ خراب اس در یہ جو درباں نے لگائی کیا آہوں کی دھونی دل نالائے لگائی
جامہ ترے وحشی کو کسی نے جو ہنایا قسمی وہیں گردن میں گرہاں نے لگائی
اک آن پلاک سے نہیں ہتھی پکائے دئے بے تابی یہ مجھ کو تری مرزا گان نے لگائی

ہم کلام اتنے نہ جرات ہو تم رک رک کر بات اس بات سے کچھ اور میاں کھلتی ہے

جی جلا کر دل میں ہے صدقے تمہارے جانے
دیکھ مغلطہ رزم میں جھکے یہ آنکھوں میں کیا
گو بہر صورت میاں جرات بگاڑے تم نے
اس میں گور سوانی ہو یا جی سے مارے جانے
بھڑکے آنا ہے تو یاں سے اک کڑا جانے
آپ ہر صحبت کے نشتے کو سنوانے جانے

بھری جو حسرت وہ اس اپنی گفتگو میں ہے
یہ حال ہے تیرے وحشی کے جیہے وہاں کا
سنگھا بدن کو کہا کس مزے سے چوٹ میں
عجب چشم کو جرات نے دی بصارت تو
خدا ہی جانتے کہ بندہ کس آرزو میں ہے
کہ چاک چاک میں ہے اور رور فور میں ہے
ربو زگی یہ تمہیں عظم کی جی بوس ہے
کسی جو پر وہ نشین کی یہ آرزو میں ہے

پھرتے ہیں دن کو کچھ گزرے ہے شب کہ ہنستے
ہستے یہ کیوں خرابیاں گر نہ کسی کو چاہتے

یا دس گل کی تھی یا رب سے تن میں لگی
رنگ یہ لائی کہ حسرت سے ساکت ہے دل
تھوڑی تھوڑی ہوئی جاتی تھی وہ کیا ہے
آگ سی دل میں جو بے گل و گلشن سے لگی
اس کے قدموں سے خواہنے محب نے لگی
تیس شہر نے جو شب اس مردن سے لگی

نک لگ گیا گلے سے جو وہ گل تو اب مجھے
یا رب یہ کس کے گھر سے میں نکلا کہ خلق میں
جون بوئے گل کرے ہے زخود رنمہ بوری
ہے داستان در بدر و کو یہ کو مری

ہے شوخ کا مار زلف کا لا کافر
اس چشم پر آنکھ پڑتے ہی ہم نے کہا
حلقہ مارے ہے تس یہ بالا کافر
”جادو برحق ہے کرنے والا کافر“

شب ہجران نہیں بلا ہے یہ صبح ہوتی نہیں ہے کیا ہے یہ

ناصر میں اور ہم میں یں طرز بہشتیں ہم کچھ نہیں سمجھتے وہ سمجھائے جائے

جوش گل چاک چین سے دم بدم دیکھائے سبے لونی میں بنائیں اور ہم دیکھائے

میر انشا اللہ خاں انشا

جگو کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا لگا کے برف میں ساقی مراچی مئے ما
محل کے وادی وحشت سے دیکھ لے محول کہ زور دھوم سے آتا ہے نافتہ لیلیا
نزاکت اس گل رعنا کی دیکھو انشا نیم صبح جوا چھو جائے رنگ ہو میللا

بجھے کیوں نہ آئے ساقی نظر آفتاب اٹا کہ پڑا ہے آج خم میں قلع خراب اٹا
چلتے تھے حرم کورہ میں مجھے اک صم غاشق ہوا ثواب حاصل یہ لیا عذاب اٹا
یہ تعجب مزا ہے یارو کہ بروز عید قربان وہی فزع بھی کرے ہے وہی ہے ثواب اٹا

گرمیار مئے پلائے تو پھر کیوں نہ بیجئے زائد نہیں میں شیخ نہیں کچھ ولی نہیں

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب بٹھے میں بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ پھیرے نہکت باد بہاری راہ لگا اپنی تھے اٹھکیاں سو جھی ہیں ہم بنارٹھے ہیں
قصور عرش پر ہے اور سر پہ پائے ساتی پر غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی گنوار بیٹھے ہیں
بسان نقش پائے رہروان کوئے تناس میں نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں چار بیٹھے ہیں
جلاگردش فلک کی چین دیتی ہے کے انشا غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دوچار بیٹھے ہیں

چند مدت کو فراق صدمہ دیر تو ہے جلو بھر کبھی ہو آئیں بھلا سیڑھے

جھڑکی بھی ادا اسی چین جیسی ہے یہ سب ہسی پر ایک نہیں کی نہیں ہسی
گزائیں گے کہنے سے مانا بار ہو کچھ میری طرف تو دیکھئے میں نازیں ہسی

• غنچہ گل کی صبا گود بھری جاتی ہے اک پری آتی ہے اور ایک پری جاتی ہے

شیخ ابراہیم ذوق

آنکھیں مری تلواروں کے بل جائے تو اچھا بے حسرت پاؤں نکل جائے تو اچھا
بیمار محبت نے لیا تیرے سنبھالا لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا
ہے قطع رہ عشق میں بے ذوق ادب شرط جوں شیخ تو اب سرہی کے بل جائے تو اچھا

وہ تھن میں وہ نور د شوق میرے ساتھ جاتا ہے بزم گدا یہ مرغ ہوا نقش قدم میسر!

آتی ہے صدائے جرس ناقہ رسیلی صد حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا

ل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا یہ بھی لہو دگا کے شہیدوں میں مل گیا

مقدم ہی چاگر سود و زیاں ہے تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا

نذکر تری بزم میں کس کا نہیں آتا یہ ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا
ہم رونے پر آجائیں تو دریا ہی بہا دیں شبنم کی طرح سے نہیں رونا نہیں آتا

دیوے ساقی جے اک جام وہ دعوے سے کجے کج جو پاس ہے میرے نہیں جھٹید کے پاس
زندگی چند نفس ہے کہو زہد سے کہ تو پاس کر عیش کا کیا کرتا ہے پاس انفس

مٹے نہیں حرف دل نشیں تھا، دہن کی سنگی سے تنگ ہو کر
جو نکلا آنکھوں کے راستے سے تو دل میں بیٹھا خدنگ ہو کر

ہاں آٹھ دم نازک تنگنی خوب نہیں ابھی جھاتی مری تیروں کے چھنی خوب نہیں
غویاں یوں تو ہیں اس عالم تصور پر بہت اک مگر ناز سے یہ کم سستی خوب نہیں
یہ نہیں شیشہ شے ہے کسی سجزار کا دل معتد بہ یکھ ذکر دل سنگنی خوب نہیں

ساقی لڑائیوں سے تری چا تر ہے جی باہم لڑا کے شیشہ و ساغر کو توڑ دوں
احسان ناخدا کے انھماکے مری بلا کشتی اُخدا پر چھوڑ دوں انگڑی کو توڑ دوں
نازک کھلیاں مری توڑیں عدو کا دل میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں
پھر اس شرہ کو یاد کرے دل تو دل میں قی نہ تر پتھر کے میں سر نہ تر کو توڑ دوں
یاں لب پر لاکھ لاکھ سخن اسطر اب میں وال ایک خاموشی تری سے جواب میں
ہم اپنے جذبہ دل کے اثر کو دیکھتے ہیں وہ دیکھیں بزم میں پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں

ہے ان کی سادگی بھی تو کس کس حسین کسانہ سیدھی سی بات بھی ہے تو ایک بالکن کے ساتھ
ناخن نہروے خدا بچھے اے چمبہ جنوں تیرے ارادے جسم کے تو پیراں کے ساتھ

بخت لے زندان جنس زنجیر رکھ کر کاٹے ہر مژدہ نگار دشت چھ تلوار کھنڈ شہر
مہر و وقت بیخ اپنا اس کے زیر پا سے ہے یہ نصیب اللہ اکبر لو گنے کی جائے ہے
اُن ہی بیابانی کریاں تو دم ہی کھانچا ہے لہ بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے

سک کو ہم کرم سمجھے جفا کو ہم وفا سمجھے
ہر اک گردن میں سواں ناز و فتنہ را سمجھے
اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت خدا
فلک کو ہم بخشی کافر کی چشم سر سا سمجھے
حسابِ صفا نہ پوچھے جس سے میرے دل کے رنجوں کا
حساب و ستاں دردِ دل اگر وہ دلِ بابا سمجھے

ہے میرے کان زلفِ معبر لگی ہوئی
کرتی ہے زیرِ برقِ فانوسِ تاکِ جہانک
رکھے گی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی
چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی
پر وہ ان سے ہے شیخ مقرر لگی ہوئی
لے ذوقِ دیکھ دینتر ز کو نہ منہ لگا

خوب رو کا شکایتوں سے مجھے
واجب القتل اس نے ٹھہرایا
تو نے مارا عنایتوں سے مجھے
آیتوں سے روایتوں سے مجھے
اُس سر سے سب نہایتوں سے مجھے
لے کئی عشق کی ہدایت ذوق

حزے جو موت کے عاشقِ بیاں کھجھکتے
اگر یہ جانتے چن جن کے ہم کو توڑیں گے
صبح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے
تو لگی کبھی نہ تمنائے رنگِ دلو کرتے
تمام عمر گزر جائے جستجو کرتے
سراغِ عمر گزشتہ کھجھکے اگر گزر ذوق

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چن میں ہے ذوق
اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکتِ دل

پنچنے تری پنچنے دہنی کو نہیں پاتے
ہنسنے ہیں مگر تیری ہنسی کو نہیں پاتے

اے شیخ تیری عمر طبعی ہے ایک رات
ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

نکاح کا اور تعادل پر پھرنے جان لگی جلی تھی بر جھی کسی پر کسی کے آن لگی

اب تو گھر کے پرہیز ہیں کمر جائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

دروازہ میکدہ کا نہ کر بند محاسب ظالم خدا سے ڈر کہ در تو بر باز ہے

باز آیا دیکھنے سے ناتش روں کے دل سو بار آئے اُسے آنکھیں دکھا چکے

ابلی کس نے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے

کہ آج کو چہ میں اس کے شورباتی ذنب قلمتی ہے
ہوئے میں تر گریہ اندامت اس قدر آسین دامن

کہ میری تردامنی کے آگے عرق عرق پاکدامنی ہے

صبا جو آئے حسن و خار گلستاں کے لئے
نہ دل رہا نہ جگر دونوں جل کے خاک ہوئے
قفس میں کیونکہ نہ پھر کے دل آشاں کیلئے
رہا ہے سینے میں کیا چشمِ خوشاں کیلئے
بیانِ دردِ محبت جو ہو تو کیونکر ہو
زباں نہ دل کے لئے نہ جو دل زباں کیلئے

اسد اللہ خاں غالب

تھا خواب میں خیال کا تجھ سے معاملہ
تیسے بغیر مر نہ سکا کو بہن اسد
جب آنکھ کھل گئی نہ زباں تھا نہ سودھا
گر شہِ خارِ رسوم و قیود تھا

عشق سے طبیعت نے زلیلت کا مزہ پایا
درد کی دو اپائی درد بے دو پایا

دوستدار دشمن ہے اعتماد دل معلوم
 سادگی و بیکاری بے خودی و ہشیاری
 شہر پسند ناصح نے زخم پر نیک چہرہ کا
 وہ بے اثر دیکھی 'نالہ' مار سنا پایا
 حسن کو تغافل میں جراتاً نہ پایا
 آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا فرہ پایا

شوق پر رنگ رقیب سرو سامان نکلا
 زخم نے دادِ زوی سبکی دل کی یارب
 بوسے گل 'نالہ' دل 'دو دو چراغ مغل
 قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا
 تیر بھی سینہ 'بسل' سے پرافشاں نکلا
 جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

خونخیز رنگ 'خا' خونِ فاسے کب تک
 تھی تو آموز تھا 'ہمت' دشوار پسند
 آخر اسے ہمدشکن 'تو بھی' پشماں نکلا
 سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آسان نکلا

سائیش گرے زاہد اس قدر حسن باغِ رضواں کا
 کیا آئینہ خاند کا وہ نقشہ تیرے جلے نے
 مری تعمیر میں معمور ہے اک صورتِ خرابی کی
 وہ اک گلدستہ ہی ہم بخودوں کے طاقِ نیاں کا
 کرے جو پر تو خورشید عالمِ شہنشاہی کا
 بیوٹی برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دھماں کا

ہمت تھی چمن سے لیکن ایسا بے دماغی ہے
 کہ مہج بڑے گل سے ناک میں آتا ہوں میرا

سرِ پادہنِ عشق و ناگزیرِ الفت ہستی
 عبادتِ برق کی کرتا ہوں اور افسوسِ حاصل کا

دنگ شکستہ صبح بہارِ نظارہ ہے
 کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
 یہ وقت ہے شگفتنِ گل اے ناز کا
 ناخن پر قرض اسی گمرہ نیم باز کا

بس کہ دھوا ہے ہر کام کا آسان ہونا
 آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو
کی مرے قتل کے بعد اس نے جھانپے
جیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب

آپ جانا اُدھر اور آپ ہی میرا ہونا
ہے اس زود پیشاں کا پیشیاں ہونا
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

دوست غم خواری میں میری سہی فرمائیں گے کیا
بے نیاز یا حد سے گزری بندہ پرور کہ ملک
حضرت ناصح مگر آئیں دیدہ و دل فرشاہ
گر کیا ناصح نے ہم کو قتل اچھا یوں سہی
خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگس گے کیوں

زخم کے بھرنے تک ناخن بڑھائیں گے کیا
ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا
یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا
ہیں گرفتار و فائدان سے گھبرائیں گے کیا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کو دو سال یا رہوتا
ترے وعدے پر جیسے ہم تو یہ جان چھوٹ جاتا
تری ناز کی سے جانا کہ بندھا تھا جہر دودا
کوئی میرے دل سے پوچھے تے تیرے کش کو
یہ کہاں کی دوستی کر کہ بنے ہیں دوست ناصح
رنگ سنگ سے ٹپکنا وہ لہو کو پھر نہ تھمتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری جا
یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب

اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
کہ خوشی سے مرنا جاتے اگر اعتبار ہوتا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگہ کے پا ہوتا
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر اضرار ہوتا
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
تبھے ہم دلی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا
لوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں
نگاہ بے محابا چاہتا ہوں
دماغ عطریرا ہن ہنس ہے

کہاں تک اسے سراپا ناز کیا کیا
شکایت ہائے زنجیں کا گھا کیا
تغافل ہائے تمکین آزما کیا
غم آوارگی ہائے صبا کیا

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
شبیدان تنگ کا خون بہا کیا
شکت قیمت دل کی صد کیا
شکیب خاطر عاشق بھلا کیا
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

دل ہر قطرہ ہے ساز انا المیہ
حیا کیا ہے میں نہ امن اوھر دیکھ
من اسے غارت گر جنس وفا سن
کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ
بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر

ہر گل تر ایک چشمِ خوں نشان ہو جائے گا

بلخ میں مجھ کو نہ لے جاو نہ میرے حال پر

میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
اک تماشا ہوا نگلا نہ ہوا
تو ہی جب تخیل آزمائے ہوا
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

درد منت کش دوانہ ہوا
جمع کرتے ہو یہ کویں رقیبوں کو
ہم کہاں قسمت آزمائے جائیں
کتھے شیریں ہیں تیرے لب کو رقیب
جان دی ہوئی اسی کی تھی

گھر میں محو ہوا اضطرابِ دریا کا
دوامِ کلفت خاطر ہے عیشِ دنیا کا

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا
خنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے ہی

گر میں نے کی تھی تو بے ساقی کو کیا ہوا تھا
جب رشتہ بے گرو تھا ناخن گرہ کشا تھا

میں اور بزمِ سے یوں نشہ کام آؤں
درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں

بھر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو دیراں ہوتا
تنگی دل کا گلہ کیا کہ وہ کا فردل ہے

پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا دل، جگر تشنہ فریاد آیا
 دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقت سفر یاد آیا
 سادگی ہائے تمنا یعنی ہمسرہ نیزنگ نظر یاد آیا
 زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی کیوں ترا راہ گذر یاد آیا
 کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھراؤ آیا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا آپ آتے تھے گڑگڑی منان گیر بھی تھا
 تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا کھلا اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا
 قید میں ہے تھے وحشی کو دہی زلف کی یاد ان کچھ اک پنج گراں بارہی زنجیر بھی تھا
 بجلی اک کو نہ گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا
 بچڑے جاتے ہیں فرشتوں کے نکھیر ناجی آدمی کوئی ہمارا دم خسیر بھی تھا

توفیق بے اندازہ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر ہوا تھا
 جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم میں معقدہ فتنہ محشر نہ ہوا تھا
 دریائے معاصی تنگ آبی سے ہوا خشک میرا سردامن بھی ابھی تر ہوا تھا

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف عقل کہتی ہے کہ وہ بے ہر کس کا آشنا
 میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا
 کو بھن نقاش یک مثال شیریں تھا اسد سنگ سے سردار کہ ہووے نہ پید آشنا

ذکر اس پری وش کا اور پھریاں اپنا بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا
 مے وہ کیوں بہت پیتے بزم فیض یارب آج ہی ہوا منظور ان کو امتحان اپنا
 نے وہ جس قدر دولت ہم منہی میں نہیں گئے بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھاؤ
 انکھلیاں نگار اپنی خامہ خوں چکیاں اپنا
 تاکرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
 دوست کی شکایت میں ہم نے ہنریاں اپنا
 ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں تھیتھے
 بے سبب ہوا غالب دشمن ہمارا اپنا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
 جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
 بیچ غم بسرے گذر ہی کیوں نہ جائے
 آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا
 پوچھتے ہیں کہ غالب کون ہے
 کوئی برستلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

حریفِ جوشِش دریا نہیں خود لاری ساحل
 جہاں ساتی ہو تو باطل و دعویٰ ہو تیلہ کی

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
 درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا
 دل سے مٹا دی انگشتِ خانی کاخیل
 ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
 گر نہیں نہمت گل کو ترے کوچے کی ہوس
 کیوں ہے گردِ رہ جو لان صبا ہو جانا
 بننے ہے جلوہ گل ذوقِ تماشا غالب
 چشم کو چاہئے ہر رنگ میں دوا ہو جانا

رہب یک شیرازہ وحشت نہیں اجئے بہار
 ہنر و بیگانہ، صبا آوارہ گل نا آشنا

پھر وہ سوئے چن آتا ہے خدا خیر کرے
 رنگ اڑتا ہے گلستان کے ہر اداروں کا

لیک ایک قطرے کا بھجے دینا پڑ احباب
 خون جگر و دیتِ فرکانِ یار تھا
 کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر آب
 دیکھا تو کم ہوئے یہ غم روزگار تھا

بیل کے کاروبار پہ ہیں خدو ہائے گل
 کہتے ہیں جس کو عشقِ خلل ہے دماغ کا

لب خشک در تشنگی مردگان کا
غریب بدر جست باز گشتن
سراپا یک آئینہ دار گشتن
بہ نامہ امید ی ، ہمہ پذیر گمانی
بصورت تکلف ، بمعنی تاسف
زیارت کدہ ہوں دل آزر دگان کا
سخن ہوں سخن براب آزر دگان کا
ارادہ ہوں یک عالم آفر دگان کا
میں دل ہوں فریب و فاختہ دگان کا
اسد میں تبسم ہوں پیر مردگان کا

(نسخہ تجدید)

حسن غمزدے کی کشاکش سے چھٹا میر بعد
کون ہوتا ہے حریف نئے مردانگی عشق
آئے ہے بنے محسوس عشق پر رونا غالب
بائے آرام سے میں اہل جنائز میر بعد
ہے مکر لب سانی یہ صلیب میر بعد
کس کے گھر جائے گا سیلاب بامیر بعد

لوہم مریض عشق کے نیما ردار ہیں
اچھا اگر نہ تو مسیحا کا کیا علاج

چھوڑے نہ خلق کو مجھے کافر کہے بغیر
چلتا نہیں بے دشتہ و خجھر کہے بغیر
نبتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا
مقصود ہے ناز و غرہ و لے گفتگوں کام
ہر چہ ہو مشاہدہ حق کی گفتگو

ان آبلوں پاؤں کے گھرا گیا تھا میں
گفتی تھی ہم پر برق تجسلی نہ طور پر
سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر
دیتے ہیں بادہ طرف قلعہ خوار دیکھ کر
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

نہ دناص سے غالب کیا ہوا اگر سن نہ دیکھی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریبان پر

ہے بلکہ ہر اک ان کے اشایے میں نشان اور
کرنے ہیں محبت تو گذرتا ہے گماں اور

یارب باوہ نہ سمجھے ہیں سمجھیں گے مری بات دے اور دل اُن کو جو نہ دے بجکر زبان اور

نہ کجی نغمہ اہلِ مہ پر دہ ساز
تو اور آرائشِ خم کا کل
لاٹ ممکین فریب سا وہ دلی
ہوں گرفتار الفت صیاد
میں ہوں اپنی شکست کی آواز
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز
ہم ہیں اور سازِ ہائے سینہ گداز
ورنہ باقی ہے طاقت پر داز

آء کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
دام بہ موج میں ہے صنفِ صد کام نہنگ
فنا شمعِ صبرِ غلبہ اور تنائے تاب
ہم نے مانا کہ فنا غل نہ کر دے لیکن
پر تو خود سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
کون جیقا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دیکھیں کیا اندر سے ہے قطرے بہ گہ ہونے تک
دل کا کیا رنگ کروں خونِ حشر ہونے تک
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو بھر ہونے تک
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

از آج کہ حسرت کش یاریں ہم
رسیہ ن گل باغِ دامندگی ہے
نفس ہو در مغرول شعلہ درودن
تماشائے گلشنِ تنائے چیدن
نہ فوق گریباں نہ پرولے داماں
استدشکوہ کفر و دماناں پاسی
رقیبِ تنائے دیدار ہیں ہم
عبثِ محفلِ آرائے رفتار ہیں ہم
کہ ضبطِ پیش سے شہر کار ہیں ہم
بہارِ آفرینا اگنہ گار ہیں ہم
نگاہِ آشنائے گل و خار ہیں ہم
ہجومِ تنائے لاچار ہیں ہم
(سفرِ حیدر)

آہر کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں
رونق ہستی ہے عشقِ خاند ویراں ساز سے
زخمِ سوانے سے مجھ پر پارہ جوئی کا بطن
ہے گریباں ننگِ پیر من مجھ دامن میں ہیں
ابن بے شے ہے گز برقِ خم میں ہیں
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

کس نے شکر کیجے اس لطف خاص کا
ہم کو ستم عزت ستم عزت کو ہم عزت
پرستش ہے اسی کے سخن درمیان نہیں
ناہرباں نہیں ہے اگر ہاں نہیں

عشق تا غیر سے تو مید نہیں
ہے تجلی تری سامان وجود
جاں سپاری شجر بید نہیں
ذرہ بے پر تو خورشید نہیں
راز معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مرجانے میں کچھ بید نہیں

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
ترے سرو قامت سے اک قد آدم
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
قیامت کے نفع کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کراے عوایت نہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں
بنا کر فقیروں کا ہم بھیں غالب
تماشاے اہل کرم دیکھتے ہیں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دو جام
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
جو شکر وفا ہو فریب اس پر کیا چلے
کیوں بد گناہ ہوں دست سے دکن کجا میں
میں اور خط وصل خدا زیات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑا عتاب میں

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھتے تھے
شرم اک او اے ناز ہے اپنے ہی سے ہسی
نے ہاتھ باگ پر سے نہ پا ہے رکاب میں
ہیں کتنے بے حجاب کہیں حجاب میں
ہے غیب غیب جنگی سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

چو زانہ رشک نے کہ ترے مگر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جالوں کدھر کو میں

و وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے رنگ و نام ہے
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک سے لگے گا
یہ جانتا اگر تو لانا نہ جگر کو میں
پہچانتا نہیں ہوں ابھی ماہر کو میں

نالہ بھر حسن طلب لے ستم ایجاد نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں پرست معلوم
ہے تقاضائے جفا شکوہ بیدار نہیں
عشق و مز دوری عشق گزشتہ کی خوب
ہم کو تسلیم نکونائی حسرت ہوا نہیں
کم نہیں جلوہ گری میں سے کوچے کے بہشت
دشت میں ہے مجھے وہ عشق کہ گھر ہوا نہیں
ہم کو تسلیم نکونائی حسرت ہوا نہیں
یہی نقشہ ہے وے اس قدر آباد نہیں

دو فوج جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش با
تھک تھک کے ہر مقام پر دو چارہ گئے
یاں آپڑی یہ شرم کہ محو کیا کریں
تیرا پتہ نہ پایاں تو ناچار کیا کریں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
تم ان کے وعدے کا ذکر ان کے کیوں غالب
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
تیری فرصت کے مقابلے عمر
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
برق کو یا بہ خنایا بندھتے ہیں
نشر رنگ سے ہے دامن گل
اہل تدبیر کی واما ندگیاں
مت کب بند قبا باندھتے ہیں
آبلوں پر بھی خنایا بندھتے ہیں
سادہ پڑکار ہیں خواہاں غالب
ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں
ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آریاں
خاک میں کیا صورتیں ہو گئی کہ نہاں ہو گئیں
لیکن اب نقش و نگار طاق نیاں ہو گئیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پشیاں ہو گئیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پشیاں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں مٹی جاتی ہیں بارِ دل کے بارِ جو مری کوتاہی قسمت سے فرغانہ ہو گئیں
جانفراہیہ بادہ جس کے ہاتھ میں جامِ آغیا سب بکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا رستے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

خیالِ جلّیٰ نکل سے خراب ہیں میکش شرابِ خاندہ کے دیدار و در میں خاک نہیں
ہوا ہوں شش کی غارتگری سے فرزند سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

دل ہی تو ہے زنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں، حرم نہیں، اور نہیں، آستان نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر رہے ہم کوئی ہمیں ستائے کیوں

جب وہ جمال و نفوذ، صورت و ہر نیم روز
آپ ہی ہو نظر رہ سوز پر دہ میں منہ چھپائے کیوں

حسن اور اس پر حسنِ طن، رہ گئی بوا اہوس کی شرم
اپنے پر اعتماد ہے غیر کو آواز مائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا بھی
جس کو بودین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

واں وہ غرور و عز و نازیاں، حجاب پاس وضع
راہ میں ہم طیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

غائبِ حصہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئے زار زار کیا، کبھی ہائے کیوں

غنجہ نامہ سلفہ کو دور سے مت دکھا کر یوں
پرسش طرز دلبری کبھی کیا کہ بن کہے
میں نے کہا کہ زم تاز چاہیے غیر سے تھی
کب مجھے کوئے یا کہ میں ہنسنے کی وضع یاد تھی
گرتے دل میں ہو خیال اصل میں تو گاروا

بوسہ کو پوچھتا ہوں میں نے مجھے تاک کر پوچھا
اس کے ہر اک اشارہ میں نیکی و یاد کر پوچھا
سن کے ستر ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ پوچھا
آئینہ دار بن گئی نہیرت نقش پاکہ یوں
صبح حیط آب میں ٹالے ہے دست پاکہ یوں

طاعت میں تاپے نہ لئے وہ نگین کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی نے کر بہشت کو

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہنگامہ زبانی بہت ہے انفعالی

ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
حاصل نہ سمجھتے ہم سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

خدا شہنائے ہفتوں کو کہہ رکھتے ہیں کشاکش میں
دفاع داری بشرط استواری اصل ایل ہے

کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے داہن کو
مرے بت خانے میں کہے میں گارو برہن کو

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہے جو ش گل پہار میں یاں تک کہ ہر طرف

ہو کر اسیر وابتے ہیں اہرن کے پاؤں
رشتے چھٹے ابھٹے ہیں مرغ چین کے پاؤں

تم جاؤ غیر سے جو تمہیں رسم در راہ ہو
ابھرا ہوا نقاب میں ان کے بے ایک تار

مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا ناناہ ہو
سرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

جب میکہ چھٹا تو چہر اب کیا آنچہ کی قید
نئے ہیں جو بہشت کی تعریف سب سے

مسجد ہو، مدرسو ہو کوئی خالصتہ ہو
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

ہائے ذہن میں اس فکر کا ہے نام و صلا
کہ گر ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجیے
 تم ہی کہو کہ گداہہ ہضم رستوں کا
 جیا ہے اور یہی جو مگو تو کیونکر ہو
 توں کی ہوا اگر ایسی ہی تو تو کیونکر ہو
 نقطہ نہ تھا ہمیں نظر پر شگن تسلی کا
 نہ مانے دیدہ دیدار جو تو کیونکر ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نواسخ فضاں کیوں ہو
 نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زبان کیوں ہو
 کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
 نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا زداں کیوں ہو
 وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر بھوڑنا پھرا
 تو پھر اسے سنگدل تیرا سنگ آستاں کیوں ہو
 قفس میں مجھ سے روداد جمن کہتے نہ ڈر ہدم
 گری ہے جس پر کل بجلی وہ میرا آشاں کیوں ہو
 یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
 کہ جب دل میں نہیں تم ہو تو آنکھوں کے نہاں کیوں ہو

بیاد قامت اگر ہو بلند آتش غم ہر ایک داغ جز آفتاب عرش ہو
 ستم بخشی کا کیا دل نے حوصلہ پیدا اب اس سے ربط کروں جو بہت سگرا ہو

میں کے زیر سایہ خرابات چاہیے بھوں پاس آنکھ قبلہ عاجات چاہیے
 مجھ سے غرض نشاط ہے کسی رویا کو ایک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

بساط عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
 سو رہتا ہے باندا ز چکیدن سرنگوں وہ بھی

رہے اس شوخ سے آزر دہ ہم چندے تکلف سے
 تکلف برطنت تھا ایک انداز جنوں وہ بھی
 نہ کرنا کاشش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمد
 کہ ہو گا باعثِ آخر الیش دردِ دروں وہ بھی
 مئے عشرت کی خواہش ساقی گروں سے کیا کچھے
 لئے بیٹھائے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی
 مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوہ ہجر
 خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

گھر میں تھا کیا کہ تراغم اسے غارت کرتا وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تیرے
 تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھو دکھو دیکھو پوچھو حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں لگ رہی ہے

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
 قطع نہ کیجئے نہ تعلق ہم سے
 میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
 اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
 عمر ہر چند کہ ہے برقِ خدام
 ہم کوئی ترک و فاکرتے ہیں
 ہم بھی تسلیم کی خود ایں گے
 یا رے پھیڑ چلی جائے اسد
 میری وحشت تیری شہرت ہی سہی
 کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
 اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
 آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
 دل کے خون کرنے کی فرصت ہی سہی
 نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
 بے نیازی تری عادت ہی سہی
 مگر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا
 جوش بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم
ہو جس گل کا تصور میں بھی کھلے نہ رہا
لے لیا مجھ سے سری تہمت ملی نے مجھے
عجب آرام دیا بے پروا بنی نے مجھے

آگ رہا ہر درویش کے سرو غائب
ہم سیاہاں میں ہیں اور گھر میں سہارا آتی

دیکھنا قدر یہ کی لذت کہ جو اس نے کہا
مگر چہ ہے کس کس برائی سے ملے بائیں ہمہ
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس شخص میں ہے
اس بھوم نامیہ ہی خاک میں مل جائیگی
ہے دل شوریدہ غالب طلسم چپ و تاب
رحم کر اپنی تنہا پر کہ کس مشکل میں ہے

دل سے تری نگاہ جھڑک اتر گئی
شقی ہو گیا ہے سینہ خورشاد لذت فراغ
دو نوں کو اک ادا میں صنامند کر گئی
تکلیف پردہ دارچ زخم جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرستیاں کہاں
اڑتی پھری ہے خاک مری کوئے یار میں
اُٹھے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی
بارے اب اسے ہوا ہوس بال فر گئی
دیکھ تو دل فریبی انداز نقش با
ہر بواہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیمہ اہل نظر گئی
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی
نظارہ نے بھی کام کیا وہاں تھک کا
فردا وہی کا تفرقہ یک بار سٹنچا
مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تھیں

کوئی اُمید برہنیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پر ہنسی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
اب کسی بات پر ہنیں آتی
ہے کچھ ایسی بھی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ کس نہ سے جاؤ گئے غالب
کچھ ہماری خبر نہیں آتی
شرم تم کو سگر نہیں آتی

دلِ نادان بٹھے ہوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار
یا الہی یہ ناجسرا کیا ہے
کاش یو چھو کہ مدعا کیا ہے
جبکہ تجھ بن کوئی نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اسے خدا کیا ہے
پری چہرہ لگ کیسے ہیں
غزہ و عشوہ واد کیا ہے
شکُن زلفِ عنبریں کیوں ہے
لگے چشمِ سرماسا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے نہیں
کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر
اُس در پہ ہنس یار تو کبھی کی ہو آئے
اچھے رہے آپ سے مگر ٹھکڑا ہو آئے

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
بھر جگر کھودنے لگا ناخن
سینہ جو یا اسے زخم کاری ہے
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
تبدیل مقصد نگاہ نیاز
پھر وہی پردہ عساری ہے
وہی صدر رنگِ نالہ فرسائی
وہی صد گونہ اشک باری ہے
دل ہوئے خرام ناز سے پھر
محشرِ ستاں بے قراری ہے
بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

کھتے رہے جنوں کی حکایات جو بچکاں
پھوڑی اسد ہم نے گدائی میں دل لگی
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
سائل ہوئے تو عاشقِ اہل کرم ہوئے

ایک ہنگامہ پر موقوف ہے گھر کی رونق ^{۳۱۰} نوشہ غم ہی ہسی نعمہ شادی نہ ہسی

مگر سمجھتا نہیں، پر حسنِ تلافی دیکھو
شکوہ جو رے سرگرم بجا ہوتا ہے
کیوں نہ ٹھیریں ہفتِ ناک بیدا کہ ہم
آپ اٹھلاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخنِ تم سے
لہگوں میں دوڑنے پھرنے کے علمِ ہستی نال
وہ چیز جس کے لئے ہم کو بوہشتِ ناز
سہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تم ہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے
وگر نہ خوفِ بد آموزی عدو کیا ہے
جب آنکھ ہی سے نہ پڑکا تو پھر ہو کیا ہے
سوائے بادۂ گلفامِ مشک ہو کیا ہے
تو کس امید پہ کہنے کہ آرزو کیا ہے

میں انھیں چھڑوں اور کچھ نہ کہیں
قہر نہ بڑایا بلا ہو جو کچھ ہو
مری قسمت میں غم اگر اتنا تھا
آہی جاتا وہ راہ پر غالب
چل نکلتے جوئے پہنے ہوئے
کاش کہ تم مرے لئے ہوئے
دل بھی یارب کئی دے ہوئے
کوئی دن اور بھی بچے ہوئے

تب چاک گرِ بیاں کا مزہ ہے دلِ داداں
جب اک نفسِ الجھا ہو اہر تار میں آوے

اُن کے دیکھے جو آ جاتی ہے نہ بد رونق
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

پہننے کو ترے کیا سمجھا تھا دل
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

چاک مت کریم بے ایام گلی کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہئے
دوستی کا پردہ ہے بیگانگی منہ چھپانا ہم سے چھوڑا جائے
مختصر کرنے پہ ہوجیس کی امید ناامیدی اس کی دلچسپا چاہئے
چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد آپ کی صورت تو دیکھا جا رہے

ہر قدم دھڑکی منزل ہے نمایاں مجھ سے میری رفتار سے بھاگے ہے یہاں مجھ سے
گردش کا غرض جلوہ رنگیں تجھ سے آئینہ داری یک دیکھ حیران مجھ سے
مجھ گرم سے اک آگ بجتی ہے اسد ہے چراغان جس کا خاک گلستاں مجھ سے

میں بلاتا تو ہوں اس کو گرے جذبہ دل اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے ذہن
اس نزاکت کا براہ وہ بھلے ہیں تو کیا ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے ذہن
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غائب کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

رہے کرشمہ کہ یوں بے رکھائے ہم کو تیرے کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہئے
ہمیں نہیں ہے سر رشته رونا کا خیال ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہئے
کہا ہے کس نے کہ غالب برا نہیں لیکن سوائے اس کے کہ اتنے سر ہے کیا کہئے

طبع ہے شتاق لذت ہائے حسرت کیا کرے آرزو سے ہے شکست آرزو مطلب مجھے

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے بخائیں کر کے اپنی یاد شرمنا جائے ہے مجھ سے
خدا یا جذبہ دل کی مگر تاثیر الٰہی ہے کہ جتنا مصیبتیں ہوں اور کھینچا جائے ہے مجھ سے
سنجھنے سے بھلے ناامیدی کیا قیامت ہے کہ دامن نیال یا چھوٹا جائے ہے مجھ سے
ہوتے ہیں باؤں ہی پہلے نبرد عشق میں فحی نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے کہ ہوش مدعی کا ہم سفر ہے وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سوتا جانتے ہیں کچھ

رونے سے اور عشق میں بے باکی ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاکی ہو گئے
کہتا ہے کون نالہ بھل کو بے اثر
پر وہ میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

جب تک وہاں زخم نہ پیداکرے کوئی
چاک جگر سے جب رہ پریش نہ وہاں سوئی
ناکامی بنگاہ ہے برق نظارہ سوز
سورہ ہستی نہ وعدہ صبر آزما سے عمر
بیکاری جنوں کو ہے سر پہنے کا شغل
مشکل کہ تجھ سے راہ سخن واکرے کوئی
کیا فائدہ کہ عیب کو رسوا کرے کوئی
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا لے کوئی

ابن مریم ہوا کرے کوئی
غمر و آئین پر مدار سہی
چال جیسے کوڑی کمان کا تیر
بات پرواں زبان کشتی ہے
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
جب قرق ہی اٹھ گئی غالب
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
مل میں ایسے کے جا کرے کوئی
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

ہوں میں بھی تماشا کی نیرنگ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب بیکار کو

تج آ پڑی ہے وعدہ دلدار کی مجھے
بے پردہ سوئے وادی جنوں گذر کر
وہ آئے یا نہ آئے پیاں انتظار ہے
ہر دے کے نقاب میں دل متویر ہے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں خدا افسون انتظار تمنا کہیں جسے
ہے چشمِ تریں حریت دیدار سے نہاں شوقِ عنانِ گیسختہ دریا کہیں جسے

غم کھلنے میں بودا دلِ ناکام بہرے، یہ بچ کہ کم ہے لے گلغام بہت ہے
سمجھتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورثہ ہے یوں کہ مجھے دردِ جام بہت ہے

پڑاؤں تماشا نظر آیا ہے مجھے ایک دل تھا کہ برصِ شرم دکھایا ہے مجھے
لالہ و گل بہم آئینہ اخلاق بہار ہوں میں وہ داغ کہ پھولیں لبیاں ہے مجھے
جام ہر ذرہ ہے سرشارِ غما مجھے کس کا دل ہوں؟ کہ دو عالم لگایا ہے مجھے
(انسو عینہ)

بہادر شاہ ظفر

نہاں سیرِ چین کی نگار کی ہوا سرعاشق میں ہے اس ہر دمِ بوی کی ہوا

نہی حال کی جب ہیں اپنی خبر رہے دیکھنے اوروں کے عیب ہنر
بڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا
کئی روزیں آج وہ ہر لقا ہوا میرے جو سامنے جلوہ نما
مجھے صبر و قرار نہ رہا اسے پاس و حجابِ ذرا نہ رہا

تو کہیں ہو دل دیوانہ داں پہونچے ہی گا شمع ہوے گی جہاں پہونچے ہی گا

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نورِ جمال تھا
 کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا
 مرے دل میں تھا کہ کہوں گا میں جو یہ دل پر بیخ و ملال تھا
 وہ جب آگیا مرے سامنے نہ تو بیخ تھا نہ ملال تھا

ہے عشق کی منزل میں یہ حال اپنا کہ جیسے لٹ جائے کہیں زادہ میں سامان کسی کا

کسی نے اس کو سمجھایا تو ہوتا کوئی یاں تک اسے لایا تو ہوتا
 جو کچھ ہوتا سو ہوتا تو نے تقدیر وہاں تک مجھ کو پہنچایا تو ہوتا

صبرِ مشکل ہے نہ کر صبر کا دعویٰ ہرگز عشق میں تجھ سے ظفر یہ کبھی ہونے کا نہیں

ات کرنی مجھے مشکل کبھی اسی تو تھی جیسی اب ہے تری محفل کبھی اسی تو تھی
 نے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار بے قراری تجھے لے دل کبھی اسی تو نہ تھی

بس وقت اسکی زلف گرہ گیر کھل پڑی سودا یوں کے پاؤں کی زنجیر کھل پڑی

میر مہدی مجروح

کچھ عرض تنہا میں شکوہ رستم کا تھا میں نے تو کہا کیا تھا اور آئے کیا جانا
 انجام ہوا اپنا آغا ر محبت میں اس شغل کو جاں فرسا ایسا تو نہ تھا جانا

ہم بھی امید وصل سے خوش ہیں ہے زمانہ کو انقلاب بہت

دیکھ کر دل کو یار کہتا ہے چیز اچھی تھی گرد لگتا داغ

گریباں پاک ہے کلی بوستاں میں اثر کتنا ہے بیل کی فغاں میں
 نفس صیاد کا خالی پڑا ہے نہ ہوں بے چین کیونکر آئیاں میں
 نئے گرد طالع خفتہ کا فقطہ تو نیند آ جائے چشم باساں میں
 سنا حال دل مجروح رب کو کوئی حسرت سی حسرت اٹھتی یاں میں

کیا چن میں ہے گئی بوئے گریباں اکی کچ غم کوئی کھلتا جو گلستاں میں نہیں

شوق سے شوق ہے کچھ منزل کا راہ میرے بھی بڑھے جاتے ہیں
 دور ہے منزل مقصد لے خضر آپ کیوں پیچھے رہے جاتے ہیں

آنکھ زنگیں کی خواب ہے لیکن ہائے وہ چشم نیم خواب کہاں
 کچ ادائی یہ رب ہیں نک تھی اب زمانے کو انقلاب کہاں

لمتی ہے اس کی وضع زبغے یاریں آئے نہ کیوں مزا ستم روزگار میں
 کب دیکھیں چاک جیتے فرصت ملے ہیں دست جنوں کا دھیان کو ایک ایک تار میں
 ہر ایک جانتا ہے کہ مجھ پر نظر پڑی کیا شوخیاں ہیں اس لمحہ سحر کار میں

دل کی بیچینیاں گئیں نہ کہیں ایک کھٹک سی رہی کہیں نہ کہیں
 ہر کیا چیز ہے وفا کیسی؟ یہ تو باتیں ہیں اب رہیں نہ کہیں

خالی جائے یہ وہ بہتاؤ نہیں آج جائیں گئے وہ کہیں نہ کہیں

کسی کی کاکل مشکیں کی بہت خوش نے گل شگفتہ میں چھوڑا نہ رنگ بوباتی
اگرچہ آپ کو کھوپا تلاش میں اس کی گرہے دل میں وہی شوق جستجو باقی

پھر کس سے یہ شکوے شب بھراں میں ہر گے کام اپنا کہیں آہ فلک سوز نہ کر جائے
تشبیہ مرے حال پریشاں سے نہ دیتا ایسا نہ ہو وہ طرہ شب رنگ بھر جائے
دل خوگر شادی ہو یہ ممکن ہے یہ یارو فرماؤ کہ یہ حسرت جاوید کدھر جائے
ظاہر ہے کہ باطن کی لگاؤ ہے وگرنہ کیوں غیر کی جانب تری ذریعہ نظر جائے
آنکھوں میں کسی کی جو جگہ پاؤں تو کیونکر میں خواب پریشاں ہوں جو دیکھے وہی فر جائے
اچھا ہے جو مجروح کو روکے کوئی اٹھ کر یہ عینے سے بیزار ہے کیا جانے کدھر جائے

مفتی صدر الدین آزاد روہ

اسی کی سی کہنے لگے اہل حشر کہیں پرسش داد خواہاں نہیں
یہ ہاتھ اس کے دامن تلک پہنچے کب رسائی جسے تاگر سیاں نہیں
فلک نے بھی سیکھے ہیں تیرے ہی طور کہ اپنے کئے سے پشیمان نہیں

افردہ دل نہ ہو در رحمت نہیں ہے بند کس دن کھلا ہوا در پیریاں نہیں
لے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں اک جان کا زیاں ہے سو آتیا زباں نہیں
کتنی کھی طرح سے نہیں یہ شب فراق شاید کہ گردش کج تجھے آسماں نہیں

میں اور ذوقِ بادہ کشی لے گئیں مجھے یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں
یارب یہ کس نے پہرے اٹا نقاب جو سورخنے اپ بھٹکنے لگے آفتاب میں

کائنات اس فرقہ زہاد سے اٹھانہ کوئی کچھ ہوئے تو یہی زندانِ عجبِ خار ہوئے

مومن خاں مومن

شعلہ دل کو نازِ تابش ہے اپنا جلوہ ذرا دکھا دینا

اس نقشِ پاک سے سجے نے کیا کیا کاؤ لیل میں کو چہ رقیب میں بھی سر کے بل گیا نہ
بت خانے سے نہ کہے کو تکلیف دے مجھے مومن بس اب صاف کہیاں جی پہل گیا

نہ جاؤں گا کبھی جنت میں نہ جاؤں گا اگر نہ ہووے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا
یہ جوشِ یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت دجائے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا سا
خبر نہیں کہ اسے کیا ہوا پر اس در پر نشان پا نظر آتا ہے نامہ بر کا سا

دیدہ حیدراں نے تماشا کیا دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا
مر گئے اُس کے لب جاں بخش پر ہم نے علاجِ آبِ ہی ایسا کیا
جائے تھی تیری مرے دل میں سوئے غیر سے کیوں شکوہ بُنے جا کیا

شبِ غمِ فرقت ہمیں کیا کیا مرنے دکھائے دم ر کے تھا سینے میں کبخت جی گھبرے تھا
یا تو دم دیتا تھا وہ یا نامہ بر بہکائے تھا غلے غلط پیغام سے کون یاں نہک تھا
باتِ شب کو اُس سے سبقتِ باری پر رُشی ہم تو سمجھے اور کچھ وہ اور کچھ سمجھائے تھا

کوئی دن تو اس پر کیا تصویر کا عالم رہا
 ہر کوئی حیرت کا پتلا دیکھ کر بن جائے تھا
 نماز شوخی دیکھنا وقتِ نظمِ مبدع
 جھمکے وہ غدر جاکر تاتھا اور خضبتا تھا
 ہو گئی وہ روز کی الفت میں کیلکات بھی
 مومن وحشی کو دیکھا اس طرف سے جلے تھا

چھوٹنا دامِ شکستہ سے بھی آسان نہیں
 میں گرفتارِ خشم گیسو صیاد رہا
 گم غم عور اچھے عشقِ تباں ہے مومن
 میں سدا سوختہ حسنِ خدا اور رہا

عشر میں یاں کیوں دم فریاد گیا
 رحم اس نے کب کیا تھا کاب یاد گیا
 ابھا ہے یا توں یار کا زلفِ دراز میں
 لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا
 جب ہو چکا یقیں کہ نہیں طاقتِ محال
 دم میں ہمارے وہ ستم ایسا یاد گیا
 ذکرِ شراب و حور کلامِ خدا میں دیکھ
 مومن میں کیا کہوں مجھے کیا یاد گیا

کچھ نفس میں ان دنوں لگتا ہے جی
 کچھ نفس میں ان دنوں لگتا ہے جی
 دلِ ربائی زلفِ جاناں کی نہیں
 آشیاں اپنا ہوا برباد کیا
 ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
 بیچ و تاب طرہ شمشاد کیا
 بتکدہ جنت ہے چلے بے ہراس
 آسمان بھی ہے ستم ایسا دیکھا
 لب پہ مومن ہر چہ آباد ادا کیا

اگر گردشِ ہی ہے بچوں کی خیمِ میگوں کی
 کفِ ساقی میں جامِ بادہ لگلوں ٹھہرے گا
 طوافِ کعبہ کا خوگر ہے دیکھو صدائے سوز
 تو سمجھو ذرا مومن ہے مومن ہیں ٹھہرے گا

یہ حذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
 میں الزام اس کو دیتا تھا قصورِ انسا نکل آیا
 حذنگِ یار کے ہمراہ نکل جان سینے سے
 یہی اسان اک مدت سے جی میں تھا نکل آیا

۲۱۶
 ناصح بے طعنہ زن مری ناکامیوں پر کیا
 ہوں کہوں نہ محو حیرت نیرنگہائے شوق
 دہجیوں سے تیری کبھی کامیاب تھا
 جودل میں شعلہ تھا وہی آنکھوں میں آبا تھا

بزم بے یس بس ایک میں محروم
 یاد ایام وصل یا رافسوس
 جب سائی کا بھی نہیں مقتدر
 مومن از بس ہیں بے شمار گستاخ
 آپ کے ابقناب نے مارا
 دہر کے انقلاب نے مارا
 ان کی عالی جناب نے مارا
 غم روز حساب نے مارا

غیروں پر کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
 اڑتے ہی رنگ رخ مرانظروں سے تھانہ
 دشنام یا رطیح حوزین پر گراں نہیں
 دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب
 کشتہ ہوں اسکی چشم فوں گر کالے سچ
 ترک صنم بھی کم نہیں سوز جیم سے
 میری طرف بھی غمغہ غماز دیکھنا
 اس رخ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا
 اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا
 تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا
 کرنا سمجھ کے دعوے اعجاز دیکھنا
 مومن غم مال کا آغاز دیکھنا

تلخ کلامی پر مجھے تھک کر لب شیریں ناز
 چھوڑتے بت خانہ کو مومن سجدہ کئے تین گز
 آمرے جادو سے اعجاز مسیحا فی ملا
 خاک میں ظالم زیوں قد جبریں سائی ملا

دھو دیا اشک ندامت گناہوں کے
 مومن دیندار نے کی بت پرستی اختیار
 تر ہوا دامن تو بارے پاک دامن ہو گیا
 ایک شیخ وقت تھا سو بھی برہمن ہو گیا

بے نجات رنگ خوبی کس کام کا کہ تو
 مفت اول سخن میں عاشق نے جان دی
 تھا گل وے کسی کی دستار تک پہنچنا
 قاصد ترابیاں تو آوار تک نہ پہنچنا

پوچھنا حال یار ہے منظور
میں نے ناصح کا مدعا جانا
شکوہ کرتا ہے بے نیازی کا
تو نے موتن بتوں کو کیا جانا

بیکارئی امید سے فرصت ہے رات دن
نہیں آگئی قضا نہ گیسو و زلف سے
وہ کاروبار حسرت و حرمان نہیں ہا
دہم و گمان خواب پریشاں نہیں ہا
موتن یہ لاف الفت تقویٰ ہے کیوں
ذلی میں کوئی دشمن ایمان نہیں رہا

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
فکر و غیار سے ہوا معلوم
رنج راحت فزا نہیں ہوتا
حرف ناصح برا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
تم امرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو
دست عافق رسا نہیں ہوتا
چارہ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا
کیوں سے عرض مضطرب موتن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

ہم جان فدا کر لے گروعدہ وفا ہوتا
ایک ایک ادا سو دیتی ہے جوابا سکے
مرنا ہی مقدر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا
کیونکہ بقاء صمد سے پیغام ادا ہوتا
جنت کی ہوس و اعطیہ بجا ہے کما فی حق
ہیں سیریں جی لگنا گردن نہ لگا ہوتا
دیوانے کے ہاتھ آیا کب بند قبا اس کا
ناخن جو نہ بڑھ جاتے تو عقد یہ دہوتا
ہم بندگی بہت سے ہوتے نہ کبھی کافر
ہر حالے اگر موتن موجود خدا ہوتا

عدم میں رہتے قوت درہتے اُسے بھی فکرِ تم نہ ہوتا
جو ہم نہوتے تو دل نہ ہوتا جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا

پڑا ہے مرنایس اب تو ہم کو جو اس نے غلط پیرہ کے نام پر ہے
 کہا کہ گر سچ یہ حال ہوتا تو دفتر استسما رقم ہوتا
 یہ بے تکلف پھر ارجی ہے کشش دل عاشقانہ کی اس
 دگر نہ ایسی تیر کتوں پر حسد صدم نامدک قدم نہ ہوتا
 ہوا مسلمان میں اور دوسرے نہ درس و اعجاز کو سنے ہوئے
 خیاتی دوزخ بلا سے نبی نذاسیبہ تاخیر صدم نہ ہوتا

ہم خاک میں بھی مل گئے لیکن ملے وہ
 دل ہی میں رہی بخش جہاں کی شکایت
 صلہ شکر وہ اٹھی ہوئی تقریر نہ سمجھا
 تھی برائی زلف پریشان کی شکایت
 لے شور جنوں در ہے زبان بند نہ ہوئے
 گرائے ہوں پر مرنے زلف کی شکایت

ہر غنچہ لب سے شوق کا اظہار ہے غلط
 اس بحث صحیح کی تکرار ہے غلط
 کرتے ہیں مجھ سے دعویٰ الفت وہ کیا کرنا
 کیونکر کہیں مقولہ اغیار ہے غلط
 کرتے ہو مجھ سے راز کی باتیں تم اس طرح
 گویا کہ قول محرم امرار ہے غلط
 سچ تو یہ ہے کہ اس بت کافر کے دوریا
 لاف و گداز مومن دیندار ہے غلط

ٹھانی تھی دل میں اٹھیں گے کسی سے ہم
 پر کیا کریں کہ ہڑ گئے ناچار ہی سے ہم
 چہنتے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
 منہ دیکھ و پیکھ روتے ہیں کس نے کسی سے ہم
 اس کو میں جا میں گئے مدد لے ہوم نری
 باج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم
 صاحبے اس غلام کو آزاد کر دیا
 نو بندگی کہ جھوٹ گئے بندگی سے ہم
 کیا گل کھلے گا دیکھئے فضل گل نمود
 اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ بھی سے ہم
 اب مجھے نہ زلف سے جو پریشانیوں میں ہم
 کرتے ہیں اس پر ناز ادا دانیوں میں ہم
 مگر گرم رقص تازہ ہیں قربانیوں میں ہم
 سرخی سے کس کی آئے ہیں جولا نیوں میں ہم

ثابت ہو چکا ہو شکوہ نہ ہو نہ غناہ رشک
سیراں ہیں آپ اپنی پشیمانیوں میں ہم
کتنے سبک ہوئے ہیں مگر آجانیوں میں ہم
مارے خوشی کے سبب سے شبنم زرق

نالہ ہوں نیکے پیسے کو ہم دیکھنے کو ہیں
نہ چلاں اتنا اس بشارت سے غم نہ کرے
دیکھنا اس حال سے کہ ہر حال میں ہوتا ہے
ہو گئے تمام تر بارشیں ہی موتوں کے قرار

کھنا پڑا مجھے پیسے اور نام پسند گو
ڈرتا ہوں آسمان سے علی اندر گریٹے
لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شب زرق

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
تقدیر بھی بری میری تدبیر بھی بری
یہ ہم سجدہ پا لے صنم پر دم و دماغ

اے وہ شکوہ کرتے ہیں کہ کس کے ساتھ
اشد ری گرامی بہت و بہت خانہ چھوڑ کر
بے طاقنی کے طعنے ہیں عذر حق کے ساتھ

نہ جائے کیوں دل مرغ جن کہ سیکھ گئی
پھر اب کے لاترے قربان جاؤں جیہاں
نیال زلف میں خود رفتگی نے تھر کیا
کرد میں دھوہ خدائی کا شکوہ کس کس

بہار وضع ترے مسکرا کے آنے کی
گئے ہیں یاں سے وہ سو گند کھائے آنے کی
امید تھی مجھے کیا کیا بلا کے آنے کی
اصل بھی رہ گئی غلام سنا کے آنے کی

حسن و زافروں پر غرا کس لئے اے بار
تاب طاقت عبور راحت جان ایمان غفلت ہو

یوں ہی گھٹ جلتے پھانسا کہ رخصتا جائے
ہائے کیا کہنے کہ دل کے ساتھ کیا کرنا جائے

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دلوں
تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کرے

اور بن جائیں گے تصویر جو حیران رہے
ہم تو کل خواب دارم درمیشیب ہر آن کا ہے

تاہم حال دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم
ایک ہم ہیں کہ ہوسے ایسے یشمان کہ بسا

ہم نکالیں گے سن لے سوج ہو ابل تیرا
صبر یا رب سب سے دشت کا پڑے گا کہ نہیں

چاک پر دسے یہ فن ہے ہیں تو بے پڑہ نشن
پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی

عمر ساری تو کئی عشق بیتاں میں ہو من

آج اس بزم میں خوفان اٹھا کے اٹھے
گو کہ ہم صفحہ ہستی پر تھے اک حرف غلط

یاں تلک روئے کہ اس کو ہم نہ انا کہنے نہ
ایک اٹھے بھی تو اک نقش بھائے اٹھے

جن بچہ بچہ آگے آگے لگا کے اٹھے

تم اٹھ گئے محفل سے ذکر آتے ہی مجبور کا
لے پھرتے بنے بہت کو گلہائے شبینہ کی

سایہ سے مرے دشت لے رہا کیے برائی
اب تم سے بھی چل نکلی یاد و گرجا اتنی

یہ کون کہے اس سے کی ترک و فاس نے
سجدہ نہ کیوں کرنا سو من قدم بتا پر

کھبے ہی میرے موتی ہے یہ وہ سری تھی

صبر نہ اُٹھتا، اثر نہ ہو جاتا ہے
 کہیں پا مالِ سحر نہ ہو جاتا ہے
 تیرا کراہتا غصہ نہ ہو جاتا ہے
 وہ بت اکبر وہ کرنے ہو جاتا ہے

کیا نہ ہو کر کیا جس منتِ ابدانہ کریں گے
 کیا نہ ہو کر کیا جس منتِ ابدانہ کریں گے
 کیا نہ ہو کر کیا جس منتِ ابدانہ کریں گے
 کیا نہ ہو کر کیا جس منتِ ابدانہ کریں گے

دل میں اس شرح کے جو راہ نہ کی
 میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کے
 مومن اس زمین بے خطا پر حیف

شبِ تم جو بزمِ بھیر میں آنکھیں چرا گئے
 سنے مومن کاپ بجے ہوئے بندہ بیتاں

بدھا خیال جاں بعد ترکِ یار مجھے
 وہ رند نکلہ نمش ہیں کہ نہ رہتے ہیں
 ہر آن آن دو کا ہوا میں عاشق زار
 ثوابِ ترکِ شمع سچ سہی ولے مومن

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
 سوئے آوازِ الفت میں ہم افوس
 تلافی کی بھی تو ظالم نے کیا کی
 اُسے بھی رہ گئی حسرتِ جفا کی

کہا ہے غیر نے تم سے مرا حال کہے دینی سے بے باکی اور کی
 مجھے اے دل تری جلدی نے مارا نہیں تقصیر اس ویر آستان کی
 کہا اس بت سے مرا ہوں تو موثر کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

شب بھر میں کیا ہجوم بلا ہے زبان تھکا گئی مر جا کہے کہتے
 رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے میں نہیں تم سے بے وفا کی

۵۔ نسیم دہلوی

پھر غلغلہ ہے آمد فصل بہار کا بگڑا مزاج میرے دل بے قرار کا
 وحشت میں بھی نہ رک محبت ہو نسیم منہ آبلوں نے چوم دیا فک خار کا

اشہ رے درازی آغاز دعا نکلا جو حرف منہ سے میرے داستان بنا
 نیل و ہنسار گیو در خسار یار میں جی چاہتا ہے بیٹھ رہیں اک جہاں بنا

گلے میں بخت کے ان کا بھی کچھ قصہ نکل آیا ہوئی تھی صلیح کس شکل سے بھر جگر انجلی آیا

افسائے محبت کا جو تھا خوف تر رشک آنکھوں میں نہا تھا کوئی داس میں عیاں تھا

نام میرا سنتے ہی شرما گئے تم نے تو خود آب کو رسوا کیا

بھروسہ جوش و خروش سے جوئے میں بے ادب ایسے
 گریباں سے اُنچھے کر ہاتھ آجاتے ہیں دامن تک
 خوش قسمت قفس میں ہم قفس پر سینکڑوں رُہے
 نظر بھی اب تو جاسکتی ہیں دیوار گلشن تک

دیکھ دو قاتل بسر کرتے ہیں کس شک ہے ہم
 ہائے کیا بے خود کیا ہے غفلت امید نے
 تالی از احسان نہیں یہ بھی کہ وقت اضطرار
 چار و گر سے درونالان در سے دل دل سویم
 حال دل کہتے ہیں اپنا بھڑی قاتل سے ہم
 خوش تو ہو جاتے ہیں تیرے وعدہ باطل سے ہم

لطف تکلف قفس کچھ ہم سے بوجھا جائے
 برق نے اک طرز بنے تابی مر گیا تو تنہا
 بلیل بستان وحدت ہے یہاں چل نیم
 مدتیں آخر ہوئی ہیں خدمت عباد میں
 سینکڑوں باتیں ہیں ایسی خاطر نشلو میں
 عمر کو ضائع نہ کر اس گلشن ایجاد میں

لے جائے اے بھی سبکدوش ہوں کس
 گھبرا گئے تم ایک ہی عرض بیان میں آج
 رکھے مری امید بھی اپنی جائے ساتھ
 سو حشر میں ہیں اور مری التجا کے ساتھ

اب وہ گلی جائے خطر ہو گئی
 دیکھیں گے اے ضبط یہ دعوے ترے
 حال سے لوگوں کو خبر ہو گئی
 رات جدائی کی اگر ہو گئی

کیا جانے آتے ہیں کہاں سے مرے شکوے
 بے فائدہ ہے فکر مری چارہ گوؤں کو
 کم ہوجتے ہیں ہر چند مگو کم نہیں ہوتے
 سب زعم جگو قابل مرہم نہیں ہوتے

مرنے بھی نہ دیگی مجھے محرومی تقدیر
 کچھ آنکھ چراتا ہے وہ قاتل کئی دن سے

نئے ڈھب کا کچھ جوش سودا ہوا ہے
خدا جانے اب کی مجھے کیا ہوا ہے
شعلن ان آنکھوں سے پیدا ہوا ہے
بہت دن کا یہ خواب دیکھا ہو ہے
ذرا دم تو لینے دے اے چشم جاود
بڑی مدتوں میں دنیا اچھا ہوا ہے

آتش

اے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا آتش میں رہ گیا
سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فائدہ کیا
کتنی ہے تجھ کو خلق خدا کیا نہ کیا
صیاد اسیر دام نگہ گل ہے غلیب
دکھلا رہا ہے چپ کے اسے آپ دانہ کیا
چاروں طرف سے صورت جانناں ہر جگہ
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا
سمجھتے تھے ہم اتنا درانداز لے جنوں تھکو
گریباں سے شعلن ہو گیا تو فطرت کا
کوئی عشق میں مجھ سے افزوں نہ نکلا
کبھی سامنے ہو کے محبوں نہ نکلا
بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطر خون نکلا
نبرد چہ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواںِ ولہ ہوا
خار و امن سے الجھتے ہیں ہمارا کئی کر
چاک کرنے کو کیا گل نے گریباں پیدا
موجہاں کی ہے سید روزی ہمارا آتش
ہم نہ ہوتے تو نہ ہوتی شب ہجراں پیدا
نام اس زلف معین کا نہ توڑے شانے
سلسلہ ہے یہ مولے دل کی گرفتاری کا

فریبِ حسن سے مگر مسلمان کیا پہنچا
خدا کی یاد بھولا شیخ تب سے رہیں بھڑا
لگے نہ بھی چڑانے نہ ہوتے۔ یہ گلابِ حسن
زبانِ بگڑی تو بگڑی تھی خبر تھے دین بگڑا

یکدم مکر وہ ناز تیں نہ کرے سے تیاریاں
انداز سے بھی حوصلہ عالی ہے ناز کا
ہو جیادے حسنِ معنی سے نہ رشتہ آنکار
روئے حقیقت اٹھے جو پردہ مجاز کا

صافی سچا خبر، مانتاں کہ جو فیصل کی کہ ہے
بر قدم پر ہے یقین یاں وہ گیا واں نہ گیا

ہجر کی شب جو بھی روزِ قیامت کے دراز
دوش سے پیچے ہنس اترے ابھی گیسو دست
اس بٹائے جان سے آتش دیکھئے کیوں نہ بے
دل سوا شیشے سے باز گل سوزاں گلے دست

فصل گل سے لٹنے کیفیت سے خانہ کج
دوت ساقی سے مالا مال ہے بیان آج
نہ پاک ہو گا کعبی حسن و عشق کا بھگڑا
یہ قہقہہ ہے کہ جس کا کوئی گڑہ نہیں

باغ میں آئے ہوساتھ انکے بھی پھر دو دو گام
نہک دھاؤں کا جھگڑا ہے چکاتے نہ چلو

چلا وہ راہ جو سالک کے پیش پا آئی
پھر گیا جو کہیں بوئے آشنا آئی
نہ روزِ حشر بھی فریاد ہو سکی مجھ سے
جھائے یار کے آڑے مری وفا آئی

محتاج بہت شیخ سے پروانہ ہوا ہے
موت آئی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے

نقشِ پاک سے زنگار کے آ رہی ہے یہ صدا
دو قدم میں اٹھ ہے شوقِ منزلِ طہ ہے

دکھائے حسنِ بار کا حیدہ ہمیں جو شہ
کس کس طرح سے لطف تماشا اٹھائیے
اب کو ہمارے جہان کے چلے ہو
جن جن کے داغ لالہ عوا اٹھائیے
نفس ہمارا کوئی پیو صوفیہ خراب
نہیں ہو چکی مساز مٹلا اٹھائیے

گردہ فوار کوئی شہسوار راہ میں ہے
بمذہب آج ہمارے اختیار راہ میں ہے
نفسِ شکر کا شہرے شوق آسائش
عنان گسستہ بے اختیار راہ میں ہے

حیا سے مارنے بدلا جو کیف ہے میں ننگ
یقین ہوا یہ ہیں پارسا کی ہنسی ہے

ہنسنے والا نہیں ہے روئے پر
ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

لگتی ہے دیر بہتہ نامہ بر کے آنے میں
وہ خود ہی آتے ہیں قاصد جواب کے بدلے

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
دکھاتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
زمین کر کے بے درد قاتل نے دیکھا
تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے
تہا رے شہیدوں میں داخل مجھے ہیں
گل و لالہ وار غواں کیسے کیسے
ہمارا آئی ہے نشہ میں جھونے ہیں
مریدانِ پیر مناں کیسے کیسے

صورتِ شمع ہوں ہر چند فروغِ بھل
بات کرنے نہیں پاتا کہ زباں کٹی ہے

دیکھتے کرتا ہے کینو بخاریاں گستاخاں
شوق کے بھی حوصلے کو آزمایا چاہئے
حالِ دل کچھ کچھ کہا میں نے تو بلا سن کیا
بس عبارت ہو چکی مطلب پہ آیا چاہئے

پیامبرؐ میر ہوا تو خوب ہوا زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

سج ابرو سے کیا قتل مجھے قاتل نے وہ مرزا دی جو محبت کے گنہ گار کی تھی
راہِ صحرایں جنوں کیوں نہ رہے گزشتہ جستجو آبلہ پایوں کو ترسے خار کی تھی

گئے جس بزم میں روشن چراغِ حسرت کو کھلا بہارِ تازہ آئی تم اگر گلزار میں آئے
عاشق کے سر کے ساتھ ہر سودا کوئے یاد مومن نہ تھا وہ جس کو ہوا جہاں نہ تھی

بہمن میں کھلتی ہے کس مزے سے غنیمت و گل سے مگر باغِ حبیب کی پاک دامانی نہیں جاتی

رہ گیا چاک سے وحشت میں گسبِ خالی بے چلے خار سے ہم گوشہِ داماں خالی

سودا زدہ نہ لفظوں کا نہ تھا اپنے سوا ایک آزادِ دو عالم تھا اگر قرار ہیں تھے

صبا کی طرح ہر اک غیرت گل سے ہیں گل چلتے محبت ہے سرشت اپنی ہیں بارانِ آسمان ہے

شیخ امام بخش ناسخ

ساقی بغیرِ شب جو پیا آبِ آتش شعلہ وہ بن کے میرے دہن سے نکل گیا
اس رشکِ گل کے جاتے ہی ہیں آگ کی نوا ہر گل بھی ساتھ بونے بچن سے نکل گیا

مرا سپنہ ہے مشرق آفتابِ اعجاز کا
طلوع صبحِ معشر چاک ہے میچہ گریباں کا

قدح لئے ہوئے گلِ مثلِ بادہ خوار کیا
خزاں چین سے گئی موسمِ بہار آیا
تمام عمر میں ہی ہو گئی سیر اپنی
شبِ فراقِ محنتی روزِ انتظار آیا۔

لبریز اس کے ہاتھ میں ساغرِ شراب کا
ہستہ ہے ٹکس بچے سے کٹوا گلاب کا

آج مجھ کو دشتِ وحشت میں وطن یاد آ گیا
بوئے گل کو بعدِ بربادی چین یاد آ گیا

اشک سے نام نہیں لیتے کہ سوچنے کوئی
زل ہی دل میں اسے ہم یاد کیا کرتے ہیں

تنا ہے ساقی بھی بزمِ مئے میں
وہ سرشار ہوا اور ہشیار میں ہوں

رفت کبھی کسی کی گواہی یہاں نہیں
جس سرزمین کے ہم ہیں وہاں آسمان نہیں

جان ہم تجھ پہ دیا کرتے ہیں
نام تیرا ہی لیا کرتے ہیں
زندگی زائدہ دلی کا ہے نام
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

تو نے ہجور کر دیا ہسم کو
دل بنا عاشقی میں خود مختار
سخت رنجور کر دیا ہسم کو
اور ہجور کر دیا ہسم کو

گلوں کی پردہ دری کیا تہیں ہوئی منظور
جو آج سیر گلستان کو بنے نقاب چلے

شوق مٹنے کو دیا اس نے جو مجھ کو دیکھ کر
تھکتے رہا یہ بھی غارِ خمار کی

کمر کو ہمارے یار کے نثار اے کی ہے
خوشید جس کو کہتے ہیں اسکی نقاب ہے

چھٹنے سے عمر وہاں اپنی فشر جاتی ہے
جب ترا جنوید رفتار نظر آتا ہے

ڈرتا اثر کا اس کو سود بھی نکلی گیا
نادم ہوا ہوں تہ سے میں نالہ نکال کے

فرقت قبل رشک کے سدھے ہنیں چل
کیا آئیں ہم رقیب ہی انہن میں ہے

۴. برق لکھنوی

کیا جو عدہ فردا سمجھ گئے عاشق
کہ اس سوال کا اب شرہ جواب ہے

دیکھنا تیر دستی ساقی
حسن نے اس کو جن لیا اے برق
جام کو رشک آفتاب کیا
عشق نے ہم کو انتخاب کیا

اتنا تو جذب عشق نے بارے اثر کیا
اس کو بھی اب ملال ہے میرے ملال کا

اذاں دی کبے میں نا قوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو
دیکھ لینا مجھے تم موسم گل آنے دو

تیر کو ہم سے خدا جدا نہ کرے ہم جدا نہ تیر سے ہوں خدا نہ کرے
 غلب فرقت بھی کھاٹ ویسے تیرا کیا کریں کھرا اگر وفادار نہ کرے
 کھرا غم فرقت کو جو شریانی نے آنکھوں سے لاکھ دھواہٹ من کے قریب

جلال لکھنوی

باغیاں لاکھ چھپایا کئے لیکن نہ چھپا مژن مرزاں چمن رنگ ہر بود ہوا
 بتوں کو شوق ہوا عالم آشنائی کا بغیر بھی رنگ پسند آ گیا خدائی کا
 بہت ڈر سے ہوئے شے لایں شیخ و زاہد اٹھا کچے ہیں ہم الزام پارسائی کا
 بڑی امید ہے منزل میں ناتوانی سے یہی تو ساتھ بنا ہے گی نارسائی کا
 شوخیوں نے تری کچھ کام نکلے نہ دیا رنگ حیرت سے زمانے کو بدلنے نہ دیا
 کبھی نالے نے دکھائی نہ بہا رتا شیر شجر اے عشق دیا پھولنے پھلنے نہ دیا
 آہ تک کر کے محفل جاناں میں فلک یہ بھی حسرت تھی کوئی جس کو نکلنے نہ دیا
 عجب تھی کہہ کے میں لاتی ہوں لقا یاری پھری تو باد صبا کا دماغ بھی نہ ملا
 چراغ لے کے ارادہ تھا نعت کو دھونڈھیں غلب فراق تھی کوئی چراغ بھی نہ ملا
 جلال باغ جہاں میں عندیہ میں ہم چمن کو پھول ملے ہم کو دغ بھی نہ ملا
 میں شوق دیدیں کیا جانے کسی دور آیا کھلی کچھ آنکھ وہیں جب قریب طور آیا
 تڑپ بھی پہلے دھتی تجھ میں سے دل بیتا کسی کو رحم ترے حال پر ضرور آیا

بے پردہ ترے دیکھنے کا حوصلہ کر کے دل آپ مری آنکھ سے محبوب ہے میرا

شوق مجنوں نے وہ لگاؤٹ کی اٹھ گیا آپ پر وہ محل کا

کہہ کے وہ اٹھ گئے کہ مشکل ہے سہل کرنا تمہاری مشکل کا
نام اس بے وفا کا لونہ حقائق زخمِ آپ کیا گئے ہوئے دل کا

بے پردہ ہم سے ہو کے وہ کرنے لگے جا حسرت کی آنکھ ہم بھی چھپاتے تو خفا
پھران کو بھروسہ وصل میں ہونے لگی تمیز بے خود ترے نہ آپ میں آنے تو خفا

حسرت تھی دید کی جو تری جلوہ گاہ میں کچھ دل میں ہم وہ ملے کے چلے کچھ نگاہ میں

منزل میں لے کے بیٹھ گیا ہے ہجوم میں تھکے زخم تھکے ہوئے کارواں کے ہیں
نقش قدم پکارتے ہیں راہِ عشق میں مٹ جائے حوصلے جسے نام و نشان کے ہیں

بہت بہار کی آمد سے خوش ہیں مرغِ جن شگوفے دیکھیں انھیں کیا اہمال کرتے ہیں

اندازہ طلب سے دیا بڑھ کے جب دیا کم حوصلہ ہیں وہاں کچھ کی نہیں

خاک اپنی اُڑ کے فوقِ تباہی میں گئی کم بخت پڑ کے دیدہ راہی میں رہ گئی
تھی اک شکایت اس شہِ خوبان کے چھپ شکر گدا نوازی شاہی میں رہ گئی
حسرت نہ نکلی وصل میں بھی دستِ شوق کی اندیشہ ہائے امتنا ہی میں رہ گئی

ساغر کہہ کر کہہ رہا تھا چشم یار کا
کچھ اشک دل سے گئے کھٹکے تجھے کچھ حال
دل سب کے نرم بادہ رستاں میں کھلے
ذوق خلش نے ادیدہ گریاں میں کھلے

زائد کو رند اُجھار کے لائے ہیں رنہ پر
کچھ کچھ مگر کرامت پیر مٹاں بھی ہے

کہتا ہوں داغ جس کو وہ حسرتِ بولی
یرے جگر کی پچانس جُست کا راز ہے

گمِ لب سے کئے ہوش تری جلوہ گری نے
کیا کیا نہ خود ار کیا بے خبری نے

اُٹھی ہی نہیں شرم سے اپنی ہنک شوق
محبوب کیا ہے یہ تری پردہ درسی نے

آنسو رکے تو کیا نہیں چھپنے کا راز عشق
حسرت نیک پڑے گی ہماری نگاہ سے

ایک سی شوخیِ خدا نے دی ہے حسی عشق کو
فرق بس اتنا کہ وہ آنکھوں میں یہ دل پہ

خبر دیوں کے بگڑنے میں بھی ہلکے بناؤ
کہیں اچھوں کی کوئی بات بری ہوتی ہے

اس سے کچھ ذکر مرا بھی دل ناشار ہے
وقت پر بھول دجانا یہ تجھے یاد ہے

صبا لکھنوی

جوشِ الفت میں او ضبط لے دل
جبر پر اختیار کیا کہتا

آبدودل کی کدورت نے زچا ہی ورتہ یہ وہ قطرہ ہے جو ٹرے جاتا تو دیا پڑتا

پھر سیر لالہ زار کھسم لئے تیار چلے آئی بہار داغ جنوں پھر اُبھر گیا

مری نجات کچھ ان دامنظہوں نے ہاتھ نہیں بڑا کریم ہنسنے جس کا گستاہنگار ہوں میں

نیرنگی نصیب ہے غم کے بیان میں سورنگ کے طلسم ہیں اک اُستان میں

یوں ہی اڑا کریں گی گریباں کی دھجیاں جب تک کہ ہاتھ دامن جانناں کے دورے
نصل جنوں ہے جامہ درمی کی بہا ہے ٹوٹے وہ ہاتھ جو کہ گریباں سے دور ہے

پھر چلے دامن صحرا کی طرف آئی بہار پھر ہوا جوش جنوں ست گریباں ہم

مر گئے عاشقِ آلاں تو کہا اس بستے سو گئے فقہِ محشر کے چکانے والے
کوچہ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

۲ ماہ لکھنوی

اس گلشنِ ایجاد میں رنگِ رخ ہر گل عین جگر بلبلِ شیدا سے نکالا
وہ دردِ طلبِ نبی کہ تری راہ میں میں نے کانشا نہ کبھی آبدِ پا سے نکالا

اس سیما سے علاجِ دلِ شیدا ہوا یہ بھی اچھا ہوا یا نہ ہوا اچھا نہ ہوا

جوشِ جنوں میں ہم نے گریباں کو پھاڑ کر اے دشتِ تیرے واسطے دامن بنا دیا

ہمارے نالہٴ دل کی بھی کچھ سنی تاثیر جو پہنچے کانِ تکران کے تو کچھ اتر بھی ہو

کیا زور تھا کیا شور تھا اک قطرہٴ جنوں کا اے حضرت دل دیکھیں کراماتِ تمہاری

تسلیم لکھنوی

فریاد و فغاں بلبلِ ناشاد کئے جا بہانِ قفسِ خاطرِ صیاد کئے جا
لے دل خمِ ابروئے صنم میں سحر و شام کچھ بندگیِ حسنِ خداداد کئے جا
گلگشتِ عدمِ خوب سفر ہے مگر لے دل سیرِ چمنِ گلشنِ ایجاب کئے جا

ہائے جب کہتا ہوں اے سوزِ دل کہتے ہیں چپ رہو رازِ محبتِ داستانِ مہربانیکا

اللہ لے اضطرابِ تنائے دیدِ یار اک فرصتِ نگاہ میں سو بار دیکھنا
تسلیم روئے یار کو حسرت کی آنکھ سے اچھا نہیں ہے شوق میں ہر بار دیکھنا

ہائے کب تک نہ میں گھبراؤں گا لے دشتِ جنوں

اب تو دامن بھی نہیں ہے کہ بہل جاؤں گا

نالہٴ کھینچا ہے دل ہے خفا شوقِ کواؤں تو کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا

وہ دیکھ کر مجھے بے پردہ کیوں ہوئے لے دل نگاہِ شوق نے سمجھا دیا نقاب میں کیا

ہمیشہ یاس کے آگے دیکھ جاتی ہے کوئی امید ہے باقی دلِ خواب میں کیا

بزمِ ساقی آگئی ہے یاد کس ے نوش کو جامِ چھلکا شیشہ تھے پچکیاں لینے لگا

چائے مینائے نے کو سجدہ شکرانہ کج سر کے بل آتا ہے زاہد جانبِ خانہ آج
کل نگاہِ منتظر و بولی ہوئی تھی جام میں بھرتی ہے آنکھوں میں مری گردش پائے آج

پردہ ازادین میں امیری ہوئی تنہیب گریا نفس میں تھے جوازے آشیانِ ہم

حسنِ دل افروز کا دیوانہ ہوں شمعِ رو کوئی ہو میں پروانہ ہوں
مر کے بھی چھوٹے نہ ساقی کے قدم آج تک خاک درِ میخانہ ہوں

مانا کہ حسنِ یاد سے لبریز ہے جہاں لیکن وہ حوصلہ وہ شکیبِ نظر کہاں
ہر وقت یارِ تھارگ جاں سے قریب تر تسلیم تو خراب پھر اعر بھر کہاں

سببِ شرم التجا ہوں میں لبِ خاموش مدعا ہوں میں
یہ حقیقت نہ جان لے تسلیم منظرِ قدرت خدا ہوں میں

رہ نہ جائے آرزو سے چارہ گر لذتِ تکلیف درماں دیکھ لیں
الغاف جوشِ وحشت پھر کہاں ہو سکے جب تک بیاباں دیکھ لیں
گر انہیں ہے خوفِ عرضِ آرزو دور سے حال پریشاں دیکھ لیں

ہنستے ہیں گلی بھی دیکھ کے اپنی خبر نہیں گویا جن میں چاک گریاں ہیں فہیں

ناصح خطا معاف سنیں کیا بہار میں ہم اختیار میں ہیں ددل اختیار میں
کیا کیا خیال حسرت دیدار فیس تھا چھپ چھپ گیا ہے تادہ الیٰ الیٰ غبار میں

نکتہ پاہوں کہیں ساتھ سے نہ رہ جاؤ مجھے بھی ہاتھ ذرا دوستو لگائے چلو
مدم میں ترسو گئے درد جگر کوئے تسلیم جو ہو سکے کوئی سینے پہ تیر کھائے چلو

کیا عجب حشر پر موقوف ہو ملنا اس کا ناامیدی نہ کر اتنا ابھی بیدل مجھ کو
فرست دید نہیں ہے شر شرع کی طرح پھر کے دیتی ہے تری گری تھل مجھ کو

گر یہی ہے پاس آداب سکوت کس طرح فریاد لب تک آئے گی
یہ تو مانا دیجھے آئیں کوئے یار بھر تمنا اور سمجھے فرمائے گی
جانے دو صبر و قرار و ہوش کو تو کہاں اے بے قرار ہی جائے گی

اللہ سے ضبط راز محبت کہ آج تک جو حرف مدعا ہے مرا نا شنید ہے
تکلیف التماس سے ہے پاک مدعا غماز عاشقی مرارنگ پریدہ ہے

اے دل دیوانہ امید رہائی کس لئے بیچ و خم کا ہے کوزلف پر شکن کے جائیں گے

کیا کہہ کے عنایب چمن سے کل گئی کیا سن لیا گلوں نے کہ زنگت بدل گئی

افسانہ گو نے اور بھی بے خواب کر دیا ظالم شاہ ہے مریجا داستان مجھے
وہ گم شدہ ہوں سوئے مدم اضطراب میں دوڑی گئی ہے دھوڑے عمر رواں مجھے

۳۴۰
 شمیم یار نہ جب تک چہن میں جھو آئے نہ رنگ آئے کسی پھول میں نہ بو آئے
 دماغ دے جو خدا گلشنِ محبت میں ہر ایک گل سے ترے پیرہن کی بو آئے

اس عشق کا گرا ہوا کہ اپنے نفس سے ہم کیا کیا پسٹ کے روئے ہیں جن دم رہا ہو

۴۔ صغیر بلگرامی

جو شش شوق شبِ صہل میں شش ٹھہری تنگ آئی ہے مری آرزوے دل کیا کیا
 جستجو میں تری تنگ تنگ گئے پہلنے والے پاؤں پھیلائے پڑے ہیں ہر منزل کیا کیا

ہر دم صدایِ ہی ہے ترے داد خواہ کی مارا نظر نے رہ گئی حسرت نگاہ کی

تو نے گلگشتِ جود و فانی کی گل تر پھول مر جائے چلے آتے ہیں گلزار دے

۵۔ مرزا رحیم الدین حیا

بتوں کو چاہ کے ہم تو عذاب ہی میں ہے اشبِ ذاق کٹی روز انتظار آیا
 کھلی رہ آنکھ ترے کشتہ نشیناقل کی ہزار شور قیامت اسے بچار آیا

خدا ہی ہے کہ اہے قوبر کعبہ جاتے تک قدم قدم ہے تصور شراب خانے کا

قبا کے ٹکڑے کے پر قبا جب بھی کھیا گھڑی گھڑی کی جنوں زور آزمائی کیا
 دیتی ہتھیں دلا جو عشق چھین تہمتِ محبت ہے موجِ نسیم بہار پر

خواجہ محمد زبیر وزیر

چلا ہے او دل راحت طلب کیا شادمان ہو کر
زمین کو لے جاتاں بیخ دیگی آسمان ہو کر
اسی باعث تو قتل عاشقان سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کار واپس ہو کر

ترجہی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو
کیسے تیرا انداز ہو سیدھا تو کرو تیر کو

ہے چشم نیم باز مجب خواب ناز ہے
نفتہ تو مسور رہے در قفسہ باز ہے

باں و پر بھی گئے بہار کے ساتھ
اب تو تجھ نہیں رہائی کی

۷ ضیای سیم ضیائی

تہا را ہم سے ہمارا تم سے نہ اٹھ سکے گا عتاب ہرگز
اٹھے تو کیونکر اٹھے بتاؤ کہ تم ہو تازک میں تو انہوں

غیر شکوہ آبادی

غم ہستے ہیں پر غمزدہ بے جا نہیں اٹھتا
مرتے ہیں مگر ناز میں جا نہیں اٹھتا

دشت جنوں سے نقش کن یا اللہ مڑا
شکر خدا کہ پاؤں مراد میں نہ تھا
بجلی تھی مہربان، کبھی آتش بہار
صد شکر کہ چراغ مرا آشتیاں نہ تھا

اُن کے جاتے ہی د ٹھہرے گی بہار بزم عیش
ساتھ اپنے ایک گل سارا چن لے جائیگا

شاید نگہ یار ہی اس کو چے میں ٹھہرے
اب تک رگ جاں میں کئی نشتر تو نہ ٹھہرا

کیا ہاتھ مرے پہنچیں گے دامانِ تباں تک
اپنے ہی گریبان سے فرصت نہیں ملتی

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

دامنِ تباں کے ہائے نہ پہنچا کبھی وہ ہاتھ
جس ہاتھ نے کہ جیب کو دامنِ بنادیا

مشاطہ کا قصور سہی سب بناؤ میں
اس نے ہی کیا نگہ کو بھی پُرفنِ بنادیا

اظہارِ عشق اس سے نہ کرنا تھا شیفتہ
یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمنِ بنادیا

کیا میکدوں میں ہے کہ مدارس میں وہ نہیں
ساتی کی بے مدد نہ بنی بات رات کو
البتہ ایک ڈال بے مدد مانہ تھا
مطرب اگرچہ کام میں اپنے یگانہ تھا

وصل کے لطف اٹھاؤں کیونکر
یاد نے جس کی بھلایا سب کچھ
تاب اس جلوے کی لاؤں کیونکر
اس کی میں یاد بھلاؤں کیونکر

جوابت میکدے میں ہے اک اک زبان پر
افسوس مدرے میں ہے بالکل نہاں ہنوز

اے تاب برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی کچھ رہ گئے ہیں خار و خس آشتیاں ہمنور

کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں کچھ آگ بھری ہوئی ہے لے میں
کچھ زہرا گل رہا ہے بلبل کچھ زہر ملا ہوا ہے لے میں
بدست جہان ہو رہا ہے ہے یار کی بوہرا ایک شے میں
ہے مستی نیم خام کا ڈور اصرار ہے جام پے پے میں
میں خائے نشیں و قدم نہ رکھیں بزم و بارگاہ کئے میں
کچھ شیفۂ یہ غزل ہے آفت کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں

محفل میں اک نگاہ اگر وہ ادھر کریں سو سو اشارے غیرے پھر رات بھر کریں
طوفان فوج لانے سے اے چشم فائدہ دوا شک بھی بہت ہیں اگر کچھ انڈ کریں

رات ساقی نے کہا جس کے یہ طلوعے ہیں وہ عبارت میں نہیں اور اشارت میں نہیں
رند خانغ بھی ہوئے جام سج گئی تھے اور زائد ابھی آننگ ظہارت میں نہیں
دل کے بدلے میں طلبگار نہیں کچھ ہم شیفۂ زمرہ اصحاب تجارت میں نہیں

ہے امتزاج مشک کے لعل فام میں آئی جو آج کام میں صہبائے تند و تلخ
آئی ہے بولے غیر ہمارے مشام میں ساقی نے خوب راز کہے بارعام میں

شوخی نے تیری لطف نرکھا جواب میں جلوے نے تیرے آگ لگائی نقاب میں
لڑتی نہ جائے آنکھ جو ساقی کے شیفۂ ہم کو تو خاک لطف نہ آئے شراب میں

ہر خار و خس ہر درد میں ہر رنگ و خوش کیا میکشوں سے آگے کہا خانقاہ میں

آشفۂ خاطرِ وہ بلا ہے کہ سیفتہ طاعت میں کچھ مرا ہے نہ لذتِ کھانہ میں

گر یہی ہے ہجومِ ابرسیاہ گر کوئی بے بے بید نہیں
ذکرِ میرا سنو نہ مجھوں کا لطف بے قصہ جدید نہیں

ناصح تری زبان ترے بس میں جتنو انصاف کر کہ دل پر مراد زور کیا ملے
افسوس اس نے کچھ نہ کہا سن کے حالِ دل ہم قصہ خواں کی طرح فناء سنا چلے

نیرنگ عشق دیکھ کہ منظور ہے انھیں گلگونہ میں چکیدہ مرگان تر ملے
محفل طرازیوں کے مزے سب دکھاؤنگا وہ اتفاق سے کہیں تنہا اگر ملے
وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی میں کیا کہوں کہ رات مجھے گس کے گھر ملے

اتنی بھی بری ہے بے تسداری اب آپ سے انس کم کریں گے

ہزار شکوہ کہ اسکی گلی میں چھوڑ گئی نسیم جان کے ایک ناتواں غبار مجھے
جو شورشیں نہ بچاتا اسیر کیوں ہوتا خراب تو نے کیا جلوہ بہار مجھے
ہزار دام سے بکلا ہوں ایک جنبش میں جیسے غزل ہو آئے کرے شکار مجھے
بڑے فساد انھیں شیفتہ خدائے کرے کہ ان کی بزم میں ہو دخل و اختیار مجھے

بے غدر وہ کر لیتے ہیں وعدہ یہ سمجھ کر یہ اہل مروت ہیں تقاضا نہ کریں گے

مائل دہلوی

حشر میں شیخ و برہمن کے جھگڑے پھیلے کوئی پرساں نہ ہوا ہم سے گز گاروں کا

محروم پھر آیا درمیخانہ سے واعظ رندان قلع خوار کی ہمت کو ہوا کیا

جھپکی تھی ذرا آنکھ کہ وہ خواب میں گئے اس رات کو اب میں شب غم کہ نہیں سکتا

ملیں کسی سے تو بدنام ہوں نہ مانے میں ابھی گئے ہیں وہ مجھ کو سنا کے پڑے میں
نہ مانگ ڈا ہند ناداں اذرا سمجھ تو بھی شکایتیں ہیں یہ کس کی دعا کے پڑے میں

کیا کہتی ہے یہ چشم فوں گراؤ سے دیکھو لوہم نہ کہیں گے ستم ایجاد کسی کو

ہم تو اس فکر میں تھے ہیں کہاں کا انصاف دیکھئے داؤر معشر بھی کدھر ہوتا ہے

مائل کوئی گناہ نہ رہ جائے دیکھنا کام آپڑا ہے رحمت پروردگار سے

مائل ہمیں تو رات کہیں رہ کے کاٹنی مسجد میں جا پڑیں گے جو میخانہ بند ہے

زکی دہلوی

رسوا کن جہاں نگہ ناز ہی نہیں پہناں رہے یہ عیش کا انداز ہی نہیں

کچھ ایسے تنگ ہیں غم دل سے کہ جی میں کچھ کہتے ہیں دل کو دے کے غم روزگار میں
پہلو وہ کون ہے تجھے جس سے کئے یقین کروٹ ہم اب کہ ہر کو دل بے قرار ہیں

نفس نفس ہے نیم وفا محرک شوق یہ وہ مزہ ہے جسے ذوق جاوداں کہئے
وہاں یہ فکر کہ راز دل آشکار نہ ہو یہاں یہ شوق کہ کچھ حسرت نہاں کہئے
وہ سادگی سے تغافل کو تازہ کہتے ہیں مگر سکھاتی ہے شوخی کہ امتحاں کہئے

دل کو یہ شوق کہ وعدہ کی وفایا دہے وہ نئے حسن سے مخمور نہیں کیا یاد دہے

وہ میرا غم ہی نہیں پوری داستانِ ہسی حکایت دل بے تاب درمیاں ہسی
خوش بیٹھے ہو محفل میں کوئی بات ہے نہ زبان دی ہے خدا نے تھیں نہ ہاں ہسی
ہنسی ہے عشق کی گشتِ تنگی میں ساتھ ضرور میں تو خاک اڑانی ہے کادواں نہ ہسی

ان کا جس راہ میں نقش کف پایا ہوتا ہے ہر قدم سجدہ ارباب وفا ہوتا ہے

میر حسین تسکین

زلف پہ پیچ کو کھولا ہے کسی نے یارب کہ مرے پاؤں کی زنجیر کسے دیتے ہیں

اے چشم سر مگیں تری گردش نے کیا کیا راحت پذیر تھے ستم آسماں سے ہم

سید ظہیر الدین ظہیر

فقط اک سادگی پر شوخیوں کے ہیں گماں کیا کیا
 نگاہ شرمگین سے ہے نہاں کیا کیا عیاں کیا کیا
 دل خوں گشتِ حسرت نے کیا کچھ گل کھلائے ہیں
 بہار آگین ہے کچھ اب کی برس فصل خزاں کیا کیا
 تصور میں وصال یار کے سامان ہوتے ہیں
 ہمیں بھی یاد ہیں حسرت کی بزم آرائیاں کیا کیا
 قدم رکھتے نہیں ہیں وہ زمیں پر بے نیازی سے
 بڑھا جاتا ہے یاں شوق سجدہ آستاں کیا کیا

بہت ظہیر کو ہم یاد کر کے واں روئے
 کہیں جو ذکر حریفاں بادہ خوار آیا

اعجاز دلفریبی انداز دیکھنا
 ہر ہر ادبہ مجھ کو گمان نظر رہا

بات کیا ان سے کروں ان کو اٹھاؤں کچھ
 وہیں اور غیر ہیں اور عیش کے سامان ظہیر
 ہم عی بیچ میں دیوار بنے بیٹھے ہیں
 ہم الگ قسب سے گزرتے بیٹھے ہیں

کہئے تو کہوں انجن غیر کی روداد
 کیا اب بھی اسے آپ کرامت کہیں گے

یہ شوخی ہے کہ تمکین ہے الہی کیا قیامت ہے
 الجھ کر خاندان سے میرے کیا کیا بیشان ہیں
 سمجھتے ہیں دم رفتار سو سوار دہن سے
 کہ اب دامن چھڑانا ہو گیا دشوار دامن سے

عبد العليم آسی

رکھ کر شید جہاں تاب دیدار دل مجھ کو اکوئی دلبر بھی اسی دل کے مقابل دنیا
درد کا کوئی عمل ہی نہیں تیرے دل کے سوا مجھ کو ہر عضو کے بدلے ہر تن دل دینا

اسی کے جلوے تھے لیکن حاصل یار نہ تھا میں اس کے واسطے کس وقت بے قرار نہ تھا
خرام جلوہ کے نقش قدم تھے لالہ و گل کچھ اور اس کے سوا موسم بہار نہ تھا

تاسحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے باد صبا یادگار رونق محفل تھی پروانے کی خاک

ہوا کے رخ تو ذرا آ کے بیٹھا جا اوقیس نسیم صبح نے پھیرا ہے دلفیلی اکو

خیر الدین یاس شاگرد مومن

رہط غیروں سے بڑھا مجھ سے وفا چاہتے ہو دل میں سمجھو کہ یہ کیا کرتے ہو کیا چاہتے ہو
عشوہ و ناز و ادا طعن سے کہتے ہیں مجھے ایک دل رنختے ہو کس کس کو دیا چاہتے ہو

غلام علی خان وحشت شاگرد مومن

منفعل ضعف جنوں سے ہوئے ایسے کہ نہ بوجھ طوق آہن جسے سمجھے تھے گریباں بھلا

نظام شاہ نظام رامپوری

کون پرسان ہے حال سبل کا خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا

خدا جانے بھکود کھائے گا کیسا یہ چھپ چھپ کے اپنا ادھر دیکھنا

منہ پھیر کے ہنس ہنس کے وہ آوار کی باتیں اس طور سے کرتے ہیں کہ باور نہیں ہوتا

یوں تو روٹھے ہیں مگر نوگوں سے پوچھتے حال ہیں اکشر میرا

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ دیکھا جو نمجہ کو چھوڑ دیئے سکر کے ہاتھ
وینا وہ اس کا ساغر مے یاد ہے نظام منہ پھیر کر ادھر کو ادھر کو بٹھا کے ہاتھ

محمد یوسف علی خان ناظم رامپوری

میں نے کہا کہ دعویٰ الفت مگر غلط کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

مجھے اٹھاتے ہو کہہ کر کہ ہے یہ خلوت خلص وہ لوگ کون چلے آتے ہیں ادھر دیکھو

ہنسی ہے اشک یہ ہے نور دیدہ ہجران ہنسی ہے داغ یہ ہے شمع دو دمان فراق
غبار دشت ہے افزائش جمال جنوں شمع دور ہے آرایش دوکان فراق

پردہ نہ رکھتا تیرے لب روح فزا لے ہم جانتے تھے آب بقا اور ہی کچھ ہے

گستاخ رامپوری

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
بکھلے جو سیکدے سے تو دنیا بدل گئی

امانت لکھنوی

رکنا قدم اے دل رہِ وحشت میں سمجھ کر
زنجیر کا ہے سانا منزل یہ کڑی ہے

رند لکھنوی

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
دید لیلیٰ کے لئے دیدہ مجنوں ہے ضرور
سب بیگانہ ہے لے دوست ثنا سائیر
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشائیر

نیم صبح چمن تک مجھے تو ہی پہونچا
بھٹک رہا ہوں میں گم کردہ اشیاء کا
نصیر کیا ترا ساقی افک نہ دیکھ سکا
گرایا ہاتھ سے لب تک جو میرے جام آیا

لے رند شوق جامہ درمی پھر چپک گیا
پھر ہاتھ رفتہ رفتہ گریاں تلک گیا

کبھی نفا رہ چمن نہ کیا اپنے داغوں سے باغ باغ رہا

نہ رہا ہوش بے خودی ہی تو ہے ساقیا اغفل ے کشی ہی تو ہے
دل ہمارا اداس ہے بے بس نہیں لگتا چمن میں جی ہی تو ہے

چمن میں جو کل جا کے دیکھا گلوں کو نہ تیری سی زنگت نہ تیری سی بو ہے

نستا ہی نہیں وہ بتِ گمراہ کسی کی ایسا نہ ہوسن لے کہیں اللہ کسی کی

دیوانوں سے کہہ دو کہ چلی باد بہاری کیا اب کی برس چاک گریباں کریں گے

رشتگی دہلوی

یہ منصب بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و درسن کہاں

ہیم بہ خراں ہے کبھی اور کبھی امید وصال کون کہتا ہے مزہ سستی پیاں میں نہیں
اہل دل سے کبھی آپ سین گے ناہ چاک دل میں ہے مگر چاک گریباں میں نہیں

مسجد میں آکے ادھر ہی عالم دکھائیے بت خانہ کو تو عالم تصویر کر چکے

ہزار رنگ بدلتا ہے دم میں تو لے دل مگر کسی کے یہ انداز ہیں اڑائے ہوئے

دآغ دہلوی

بتاں ماہ و ش اُچڑی ہوئی لبتی مٹتی ہیں کہ جس کی جان جاتی دہا سی کے دل مٹتی ہیں
خدا رکھے جنت نے کئے آباد دو تلوں گھر میں اُن کے دل میں بتا ہوں سرے دل میں تہ ہیں
کوئی نام و نشان پوچھے تو لے قاصد بتا دینا تخلص دآغ ہے اور عاشقوں کے دل میں تہ ہیں

مرادیں مان رہا ہوں قضا کے آنے کی بُری گھڑی تھی دل مبتلا کے آنے کی
ابھی تو کھیل ہیں لے دآغ خوئیاں اُن کی پھر آرزو کس کر دگے حیا کے آنے کی

پیامی کا میا سب آئے نہ آئے خدا جانے جواب آئے نہ آئے
ترے غمروں کو اپنے کام سے کام کسی کے دل کو تاب آئے نہ آئے
تم آؤ جب سوار تو سن نارا قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے

ذکر ہر و دفا تو ہم کرتے پر ہمیں شہسار کون کرے
آفت روزگار جب اُغم ہو شکوہ روزگار کون کرے
وعدہ کرتے نہیں یہ کہتے ہیں تجھ کو امید وار کون کرے

آخر کو عشق کفر سے ایمان ہو گیا میں بت پرستیوں سے مسلمان ہو گیا
زندان بے رویا کی ہے صحبت کے لہب زائد بھی ہم میں میٹھ کے انسان ہو گیا
اس غمخیز میں سمائی ہے وخت ہنگن تو دل کتنی نیگیوں پہ بیابان ہو گیا
لو اسے بتو سنو کہ وہ دآغ صنم پرست مسجد میں جا کے آج مسلمان ہو گیا

دل سے کے اسکی بزم میں جایا نہ جائے گا یہ مدعی بغل میں بھیا یا نہ جائے گا
اسے حشر اقیانوس ہم ہیں شہید ناز مردوں کی طح ہم کو اٹھایا نہ جائے گا
دل کیا ملاؤ گے کہ ہمیں جو گیا یہ یقین تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

کی ترک مئے تو مائیں پسندار ہو گئی ہیں تو بہ کر کے اور گنہ گار ہو گیا
وہ فتنہ جس کا حشر پہ اٹھنا ہے مختصر ہر بار تیری چال سے بیدار ہو گیا
اک حرف آرزو پہ وہ مجھ سے خفا ہو گئے تھی سی بات کہہ کے گشت گار ہو گیا

ستم ہی کرنا، جہا ہی کرنا، نگاہ الفت کبھی نہ کرنا
تمہیں قسم ہے ہمارے سر کی ہائے حق میں کتنی کرنا
لئے تو چلتے ہیں حضرت دل نہیں بھی اس سخن میں نہیں
ہمارے پہلو میں بیٹھ کر غم ہیں سے پہلو تہی نہ کرنا
مدار ہے ناصحو تمہیں پر تمام اب اسکی مصفی کا
ذرا تو کہنا خدا لگی جی فقط سخن پروردی نہ کرنا

زندہ عیسیٰ کا نام کرنا تھا اس طرف بھی خدام کرنا تھا
تھی نہ تاب ستم تو حضرت دل عاشقی کو سلام کرنا تھا

لے اہل بزم چشم مردت کو کیا ہوا کیوں دیکھتے نہیں مری صورت کو کیا ہوا
بے جستجو ملے گا دل سلغ دوست تو کچھ تو قصد کر تری بہت کو کیا ہوا
ٹھنڈا پڑا ہے داغ دل داغدار عشق اس آفتاب حشر کی حدت کو کیا ہوا

غضب کیا ترے وعدے پر اعتبار کیا تمام رات قیامت کا انتظار کیا

میری وفائے مجھے خوب شرمسار کیا
 بے کیا کیا کہ جہاں کو اسلہ دار کیا
 چھپا چھپا کے محبت کو آشکار کیا
 مگر تمہارے تغافل نے ہوشیار کیا
 ستم کیا تو بڑا تو نے افتخار کیا

کسی طرح جو نہ اس بت نے اعتبار کیا
 تجھے تو وعدہ دیدار ہم سے کون تھا
 بھلا بھلا کے بتایا ہے ان کو رازِ نہال
 ہم ایسے محوِ نظر وہ نہ تھے جو ہوش آسا
 وہ بات کر جو کبھی آسمان سے ہونہ سکے

دل میں کچھ اعتبار سا آنکھ میں کچھ حال سا
 وہ بھی بڑا ہے میری طرح جاو میں پائال سا
 در پہ تمہارے تھا مگر کوئی شکستِ حال سا

عرض و نفاہ دیکھنا اسکی اداسے دلعزیب
 فتنہٴ حشر کب اٹھا اس کے خرامِ ناز سے
 پوچھتے کیا ہو کون تھا ہونہ ہو وہ ہی داغ تھا

مگر سوال کا میرے کوئی جواب نہ تھا
 تہاے برق بجلی کو اضطراب نہ تھا
 ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا

مے سوال کے معنی وہ مجھ سے کہہ دیتے
 نگاہِ شوق پہ الزام بے فستاری کا
 وہ جب چلے تو قیامت باقی جاوِ وطن

سو دا جو نہ ہوتا تو مرا سر بھی نہ ہوتا
 ہوتا جو نہ انصاف تو محشر بھی نہ ہوتا
 بڑھ کر تو کہاں تیرے برابر بھی نہ ہوتا
 بہتر تو یہی تھا کہ وہ بہتر بھی نہ ہوتا
 مگر عشق نہ ہوتا کوئی کا فر بھی نہ ہوتا

بے عشق کے جیتا مجھے دم بھر بھی نہ ہوتا
 بے واسطے ہر کام کے اک روز سفر
 آنا جو یہاں روز جزا اے شبِ بھلا
 ظالم جو کہا اس کو یہ ہے حسن کی خوبی
 غارت گرایاں تو ہے لے داغِ بکا فر

الفت میں کوئی کار نمایاں نہ ہوا تھا
 آتی تھی اجل درد کا درواں ہوا تھا
 گویا نہ کیا تھا کبھی پیمیاں نہ ہوا تھا

جستگ سے گریہ سے طوفان نہ ہوا تھا
 شامت مری جو میں نے سیمائیں جانا
 اس وعدہ فراموش کا اللہ کے تغافل

جلوہ دیکھا تری رعنائی کا کیا کیلجا ہے تماشائی کا
آئی شوخی میں کہاں ہے ممکن پڑ گیا صبر تمنائی کا
ضعف نے دل کو ترپنے دیا ہو گیا نام شکبائی کا

انداز کچھ ملانے لگا جو ریا رکا اب لطف دیکھنا ستم روزگار کا
رہتی تھی اسکی یاد وہ راتیں کدھر گئیں اب مجھ کو انتظار ہے اس انتظار کا
اے چشم یار دیکھ تغافل سے باز آ دل ٹوٹ جائے گا کسی امیدوار کا

یاں امتحان برق تجلی ضرور تھا کیا میں نہ تھا اس آگ میں جلنے کو طہر
ہم بوسہ لے گئے ان سے عجب چال کر گئے یوں بخشوا لیا کہ یہ پہلا قصور تھا
لے آ داغِ صدمہ غم ہجران کیا درست یہ سب سہی مگر تمہیں جینا ضرور تھا

ہمیں زمانے میں بدنام تیری غونے کیا دل فریفتہ جو کچھ کیا سو تو نے کیا
غور کیوں نہ ہو جب دل سی جزا تھ لگے بڑا داغ تری زلف مشک بونے کیا
کھلا میں ان سے کہ وہ اور مواقع مجھ کے خفا تو ان کو مری شمع آرزو نے کیا

شوخی سے تھرتی نہیں قاتل کی نظر آج یہ برق بلا دیکھے گرتی ہے کدھر آج
وہ جاتے ہیں اُتی ہے قیامت کی کھراچ روتا ہے گلے ل کے دعاؤں سے آج

پیکارتی ہے خموشی مری نچاں کی طرح نگاہیں کہتی ہیں سب زبوں زباں کی طرح
کبھی تو صلح بھی ہو جائے زہد و منی میں الہی شیخ بھی سے خواہو نچاں کی طرح
جلالے داغِ محبت نے دل کو خاک کیا بہار آئی مگرے باغ میں خزاں کی طرح
حیائے روک لیا جذب ل نے کھینچ کیا چلے وہ تیر کی صورت کھینچے کہاں کی طرح

بھگی ہی جاتی ہے کچھ خود بخود جیسے وہ آئی
 یرسد راہ ہوا اُس کا پاس رسدانی
 گری ہی پرتی ہے بیمار ناتواں کی طرح
 رزکے ہوئے ہیں سے اشک گراواں کی طرح
 ادائے مطلب دل ہم سے نیکے جانے کوئی
 ابھیں ساہی دیا حال داتاں کی طرح
 کچھ اُن سے کہنے کو یا تھے تھے ہم کہ خلوت میں
 رقیب آہی گیا مرگ ناگیاں کی طرح
 زبان خار ہوئی ترکاری دشت سے
 کہ چھالے بھونے کے پیچم خون فشاں کی طرح
 خدا قبول کرے راغ تم جو سوئے دم
 چلے ہو عشق بتاں لے کے ارغواں کی طرح

وہی تو ہے شعلہ تجلی کہ دشت امین سے تنگ ہو کر
 جب اس نے اپنی نمود چاہی کھلا حینوں پر رنگ ہو کر
 وہ ہم ہیں مجنون دشت پیا جنوں کو ہوتا ہے ہم سے سودا
 کہ چشم آہو میں بھلی وخت ہماری وخت سے تنگ ہو کر
 بھکی ذرا چشم جنگ جو بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی
 برا مزا اس طاپ کا ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

آئے وہ بے وفایاں اسکی ہلا کو کیا ہیں
 اسکی گلی سے آئے کیوں نہت زلف لائے کیوں
 جاے در قبول تک میری دعا کو کیا ہیں
 مجھ کو صبا سے ہے امید مجھ سے صبا کو کیا ہیں
 یہ فرمرا ہی کام ہے سجدے کروں تو میں کس
 کیوں ترے پاؤں پر گرے زلف سا کو کیا ہیں

ہے چارہ ساز گلچیں گھٹائے دلغ دل کا
 یہ شوق خود نمائی کیا کچھ جنوں سے کم ہے
 شامت بہار کی ہے آئی جو اس جن میں
 بے تاب تجھ کو ڈایا خلوت سے انجن میں
 روفا کہ دل میں آؤ تو خاک میں ملاؤ
 رونق ہوا انجن کی میٹھو جس انجن میں

آغاز شوق میں نہیں انجام کی خبر
 اس بتدا کی دیکھئے نکلے خبر کہاں

مے خانے کے قریب تھی مسجد بھلے کوئی نہ دیکھتا ہے کہ ”حضرت ادھر کہاں“

دل میں گھریار کے پیکان کئے بیٹھے ہیں
اسی دشت نہیں اپنی کہ ہو محتاج بہار
مجھ پر قبضہ مرے وہاں کئے بیٹھے ہیں
پہلے ہی پاک گریبان کئے بیٹھے ہیں

مکشہ مشرودہ کہ گھنگور گھٹائیں آئیں
کسکی زلفیں مجھے یاد آئیں شب بچاں میں
تم پر رحمت ہوئیں اقویہ یہ بڑائیں آئیں
کہ بلا میں مری بیٹھے کہ بلا میں آئیں
ناز ہے ان کو کرم یہ کہ نہیں خبر کا حسنا
کس خطا وار کی گنتی میں خطائیں آئیں

ہم تری نرم سے اسے یار چلے بندہ ہوئی
گرچہ سوسو میں تعافلی کہ نہ جانے کوئی
سے چلے جاتے ہیں ناچار چلے جاتے ہیں
ان نگاہوں کے مگر وار چلے جاتے ہیں
نبول گوراء چلے آئے ہیں شدہ بخشو
ہم خطاوار گسہ کار چلے جاتے ہیں

دل میں سما گئیں ہیں قنایت کی توتیریا
اس توجہ پر ہے ناز تجھے زاہد اس قدر
روح چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں
جو ٹوٹ کر شریک ہو میرے گناہ میں
تائیرت کے سنگ حوادث سے آئے کیا
نہری دغا بھی ٹھوکریں کھاتی ہے راہ میں

دھوم ہے حشر کی سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا سگر کچھ بھی نہیں
ان کو بے تاب کیا کچھ نہ کیا نالہ دل
یہ تو کچھ بھی نہوا یہ تو اثر کچھ بھی نہیں
اک بھائی تری جو کچھ بھی نہیں تو سب کچھ ہے
اک دغا میری کہ سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں

حشر میں دست جنوں سے نہ نکل ہوں اے داغ
کہ مرے پاس بجز دامن ترکچہ بھی نہیں

دست و حشمت کے لئے تار رگ جاں میں نہیں
تیرے اقرار میں انکار تری جاں میں نہیں
بغیر کو حیرت کا گماں دل میں تنہا کا نقص
جلوہ ہوش ربا دیکھ لیا اے موسیٰ
دیکھئے راہ میں ٹھوکر سے نہ کھل جائے گمرہ
اف سے جلوہ کہ نہیں اور نگہ شوق میں ہے
زنگ گل، نغمہ بلب، اثر باد بہار

جلوے مری نگاہ میں کون مکان کے ہیں
جس دن سے کچھ شریک موی میری رشت خاک
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں
اس سوز سے زین بے ستم آسمان کے ہیں

بات میری کبھی سنی ہی نہیں
لطف سے تجھ سے کیا کہوں زاہد
اڑ گئی یوں وفاز مانے سے
دل لگی دل لگی نہیں تاح
داغ کیوں تم کو بے وفا کہت
جانتے وہ بری بھلی ہی نہیں
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں
تیرے دل کو ابھی لگی ہی نہیں
وہ شکایت کا آدمی ہی نہیں

کبھی فلک کو بڑا دل جلوں سے کام نہیں
وہ کاش وصل کے انکار ہی پہ قائم ہیں
اگر آگ لگا دوں تو داغ نام نہیں
مگر انھیں تو کسی بات پر قیام نہیں

پیاک ہو پروہ دشت مجھے منظور نہیں
دلی کوڑ ہوتی ہے خیر آپ کہیں یا کہیں
وہ نہ یہ ہاتھ گر بیان سے کچھ دہرا نہیں
ہم کو معلوم ہے وہ بات جو مشہور نہیں
دیکھ لکھ بچھڑائے گا خاموش یہ دستور نہیں

کتنا با وضع ہے خیال اس کا
ناامیدی مٹائے جاتی ہے
بہت لمبے خاک پاں مددائے ضعف
اس کا آگہ تو درکنار اے داغ
بے کسی میں بھی آئے جاتا ہے
شوق نقشہ جمائے جاتا ہے
کوئی دامن بچائے جاتا ہے
دل ہی قابو سے ہائے جاتا ہے

اس شخص سے بہت بے قرار ہو کے چلے
نری نگاہ بہت رستہ سنبل کے ذرا
کسی کی آنکھ میں وہ انتظار ہو کے ہے
سرور ہو کے ہم آئے خمار ہو کے چلے
سند ناز و اکو اور سوار ہو کے چلے
کسی کے دل سے ٹیکنے قرار ہو کے چلے

طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی
رہیں گی دم مرگ تک خواہشیں
رہے گا ترا جلوہ مد نظر
صبا اُس گلی سے مری خاک کو
دیا دل تو اے داغ اندیشہ کیا
بھر دھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی
یہ نیت کوئی آج بھر جائے گی
جہاں تک ہماری نظر جائے گی
جب آئے گی برباد کر جائے گی
گذر فی جو ہو گی گذر جائے گی

ابھی نزاکت قیام باقی ہے
غزاں بنے دیکھ کے دشت بھی چھائی ہو
وہ چشم زار کا سنتے ہی ماجر اکھرائے
جو یہ نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں غلش باقی
ابھی زمانہ ناپائدار باقی ہے
ابھی نظارہ فصل بہار باقی ہے
ابھی تو شدح دل بنے قرار باقی ہے
جو عشق ہے تو غم بے شمار باقی ہے

طلب ہے چاہنے والوں سے امتحانوں کی
خدا کرے انہی اے باغیاں گرے بھلی
قدیم قدم چہ تری چاں کا نیا انداز
بڑی بخی ہے خدا خیر کرے جانوں کی
ترے چمن کو لگے آگ آشیانوں کی
وگر نہ ایک روش ہے سب آسمانوں کی

منصفی و نیا سے ساری اٹھ گئی
یہ طرح پھیلے ان زلفوں کا حال
دور میں اس چشم مست ناز کے
کس سے رکھنے داغ چشم دوستی
اسے تو ایماندار ی اٹھ گئی
اب امید رستگار ی اٹھ گئی
نہت پر تمہیں گاری اٹھ گئی
اٹھ گئی یاروں سے یاد ی اٹھ گئی

نگہ چلی باد صبا کیا کسی مٹانے سے
روح توں بہت کی پیاسی گئی بے خانے سے
وہی وحشت ہے وہی فوار وہی دیرانہ
ایک چلو میں بہت داغ ہیک آٹھے تھے
جھومتی آج چلی آتی ہے بے خانہ سے
سے اڑی جاتی ہے ساقی سے پیانے سے
دشت کس بات میں آج امرے کاٹھانے سے
آج سنتے ہیں نکالے گئے بے خانہ سے

شعفی میں آگئی چھیرے کچھ اضطراب کی
اس روئے بے نقاب کا جلوہ ہوا نقاب
تم اور آرزو مرے ملنے کی روز حشر
لے اشک ڈوب مر تری تاثیر دیکھ لی
در پردہ جوش حسن نے بے پردہ کر دیا
اے دل کمی کرے نہ کہیں حول مدعا
گھر کہ گئی وفا کسی خانہ خراب کی
بھکی ہے رنگ رنگ سے صورت حجاب کی
میں اور گفت گو ستم بے حساب کی
الہی ہنسی اڑی مری چشم پر آب کی
ٹوٹی گزہ تڑاق سے بند نقاب کی
لینے ہے کل خبر مجھے روز صاب کی

کو شوق ہے اثر نہ ہوئی
حال وہ کیا جو حشر میں نہ کہا
تم کو پردہ میں کیا نظر نہ ہوئی
بات وہ کیا جو وقت پر نہ ہوئی

یار کا پاس نزاکت دل ناشارہ ہے
نالہ رکتا ہوا تھمتی ہوئی فریاد رہے
تم نے بسے داغ محبت سے کیا ہے انگا
یہ سخن یاد رہے یاد رہے یاد رہے

شوق میں ایک فتنہ فاست کے
آئی تیشہ سے یہ صدا اچہم
وہ نزاکت سے تم گئے چل کر
ہم گلے مل گئے قیامت کے
کوہن کام ہیں یہ فرصت کے
وہ قدم گز گئے قیامت کے

کیا تھا جرم و فائدت سزا کے لئے
بڑا نزہ ہو جو محشر میں ہم کریں شکوہ
لے تو محشر میں لے لوں ازبان ناصح کی
ستم کے لطف اٹھائے منے جھکے لئے
وہ سنتوں سے کہیں جپ ہو خدا کے لئے
بجیب چیز ہے یہ طوکل مدعا کے لئے

شکر کت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری
کیا چلائی انکا اثر ہے کہ شب تنہائی
وہ دے پاؤں چہیں جھڑکے در سے تو بہ
کون سائب ہے کہ جس پر نہیں شکوہ تیرا
غیر کی ہو کے رہے یا شب فرقت میری
میری تصویر سے متی نہیں صورت میری
فکر ہے چال اڑا لے نہ قیامت میری
کون سادل ہے کہ جس میں نہیں حسرت میری

آشفستگی کسی کی اثر کچھ تو کر گئی
وقت نظارہ کی کشش حسن نے کی
بن بن کے پنج پر زلف تہا سے کھر گئی
آنکھوں کو لے کے ساتھ زبیری نظر گئی

فسردہ دل کبھی خلوت انجمن میں ہے
تراوہ حسن ہے لے شعلہ روج تو چاہے
زبان دے نہ عدو کو کہ یہ تو وہ سے ہے
بہار ہو کے رہے ہم تو جن جن میں ہے
بغیر شمع کے پروانہ انجمن میں رہے
ترے دہن میں ہے یا مرے دہن میں ہے

اب وہ میر کہ رہے ہیں مری مان جائیے اللہ تیری شان کے قربان جائیے

پھر سے روہ سے وہ یہاں آتے آتے
نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
اجل مرہی تو کہاں آتے آتے
سنانے کے قابل جو تھی بات ان کو
بہت دیر کی ہوں آتے آتے
بھی یاد کرنے سے یہ مدعا تھا
وہی رہ گئی درمیاں آتے آتے
بھل جائے دم ہچکیاں آتے آتے

دل جو ناکام ہوا جاتا ہے
آج کل کثرت عشاق سے عشق
شوق کا کام ہوا جاتا ہے
شیوہ عام ہوا جاتا ہے

عشاقِ گلے خاں میر مظفر علی خاں اسیر لکھنوی

رونی گلشنِ جودہ زند شرابی ہو گیا
نہکت گل سے چمکتا ہے سوا رنگ جنوں
پھول ساغر بن گیا غنچہ گللابی ہو گیا
کوئی مجھ سا بھی نہ آمادہ سودا ہو گا
مسجد سے کل کر میں رہ بنکدہ بھولا
تقدیر نے میری مجھے رکھنا کہیں کا
گرا جو ہاتھ سے جام اختیار کیا ساقی
خدا سے طالبِ امر حال ہونا تھا
اس رخ کی ناز کی ہے گل تازہ بہا
ہزار زلف رشتہ شیرازہ بہار

۳۶۳
ہر رخ سینہ لالہ گلزار فیض ہے پاتے ہیں پاک حبیبِ حیران، ندانہ نہا

زمنے کی ہے یہ طاقت کہ کوئی دم ٹھہرے پھر رہی ہے یہ تیری نگاہ کی گردش

جب سے بلند ناند سوزاں مرا ہوا کرتی ہے برق اپنے گریباں کی احتیاط

ہنسی ہے تری زلف سا بڑھ کے قدم تک ہیں خاک شیں ہم بھی ضرور آئیگی ہم تک
دماغ دل سوزاں سے ہوں میں غمِ شبتان ہے گرمی ہنگامہ محل مرے دم تک

نبض بیمار جو لے رشک سوا دیگھی آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیگھی
خندہ گل ہے کہیں ناند بیل ہے کہیں سیر اس گلشنِ ایجاد میں کیا کیا دیگھی

آج ساقی میں ہنس گو کہ مروت باقی خیر زندہ ہے اگر یار تو صحبت باقی
رات صیاد کو کیا کیا نہ سائے قصے نہ رہی کوئی گلستان کی حکایت باقی

چنچہ ساں سانے اس گل کے رہے ہم غموش سوز باینِ بھیں مگر طاقتِ گفتار نہ تھی

دخلِ اغیار نہیں بزمِ گل و بیل میں پاؤں کچھ سوچ کے لے بادِ بہاری سکھنا

شمیشہِ لہجہ آیا نہ ہم نے کوئی ساغر پایا ساقیا لے تری محض سے چلے بھر پایا

باغ میں پھول کھلے موسمِ سودا آیا گرم بازار ہوا دقت تماشا آیا
سارباںِ ناقہ بیل کو نہ جوڑا آتا پاؤں مجنوں کے تھکے ہاتھ ترے کیا آیا

گلشن دہریں پھر فصلی بہار آئی ہے مجھے شاد ہیں سیکھے آباد ہیں سب
قابل صحبت خواہاں تو نہیں ہوں لیکن ربط کے جتنے ہیں انداز مجھے یاد ہیں سب

ہوا جو خاک بدن ساغر شراب بنا ہزار شکر کہ ذرہ سے آفتاب بنا

خاواہ ملتے ہیں انزا کوئی نہیں کہتا کہ خون عاشق رشید احضور ہوتا ہے

رونے سے مرے اس گل خوبی کو خبر ہے وعدہ شکر کہ انکوں میں ابھی رنگ اتر ہے

شیم گل میں جو بلبوس یار کی ہوتی ہوا کچھ اور نسیم بہار کی ہوتی

غشی امیرا حمد امیر علیسنائی

مرغان باغ تم کو مبارک ہو سیر گل کانا تھا ایک میں سوچیں نے گل گیا

بہار آئی ہے لے دست جنوں یا عید آئی ہے گریباں سے گلے ملتے چلا ہے چاکہ اس کا

گردش بخت کہاں سے ہیں لائی ہے کہاں فنز لوں وادی غربت سے وطن دور رہا
جلوہ برق بجلی نظر آیا نہ کبھی مدتوں جا کے میں زیر شجر طور رہا
ہم بھی موجود تھے کل محفل باناں میں امیر رات کو دیر تک آپ کا مذکور رہا

بھارتا ہے یہ ناز اس کی کبریائی کا کہ لے اڑا ہے مجھے شوق خود نمائی کا

عزیز کیوں نہ ہو ذراغ اسکی بے وفائی کا
مرے نصیب یہ کہتے ہیں میرے نالوں کے
کہ جوڑ دے کوئی میٹھا شبِ جدائی کا
یہ عذر نگ تمہاری شکستہ پائی کا

جب آئی جوش پہ میرے کیرم کی حرمت گرا جو آنکھ سے آنسو در یگانہ ہوا

انصاف جو ریا خدا سے طلب کیا تم نے بھی اسے امیر بڑا ہی غضب کیا

بات رکھ لی مری قاتل نے گنہ گاروں میں اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہ گار نہ تھا

قرب ہے، یا روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستین کا

جو آنکھ کھولی تو کچھ نہ دیکھا سحر کو سنان سب راجھی
ہوا نہ ہم ایسوں سے آتا کہ ساتھ لیتے مجھے جگا کر
ہو زیم جاناں میں حشر بیا ترپ کا دل کے تھا یہ قافضا
مگر بڑی مشکلوں سے رو کا ادب نے زانو دبا دبا کر

کیا یہ شوق نے اندھا مجھے نہ سو بھا کچھ
فلک کے دور سے دنیا بدل گئی ورنہ
وگرنہ ربط کی اُس سے ہزار راہیں تھیں
جہاں بنے ہیں آسمانے خافقا ہیں تھیں

ظاہر میں ہم فریفتہ حسنِ بتاں کے ہیں
پر کیا کہیں نگاہ میں جلوے کہاں کے ہیں

گھر کے جب فراق میں مانگی دعائے وصل
وہ اور وعدہ وصل کا قاصد نہیں نہیں
آئی صدایہی تو مقام امتحاں کے ہیں
پس سچ بقاءِ نغضِ انھیں کی زباں کے ہیں

پرے میں چاہتا ہے کہ ہنگامہ ہو بیا
زائد امید رحمت حق اور بھروسے
اسے آفتابِ حشر نمودار بھی تو ہو
پہلے شرابِ پی کے غمگیناں بھی تو ہو

کھانے ہو قسم نہیں ہیں عاشق
صورتِ نور امیسر اپنی دیکھو

ہمارے دل سے مٹے گا ز داغِ شوقِ سجود
اتیر جمع ہیں اجابِ دردِ دل کہہ لے
جس رہے نہ رہے آساں رہے نہ رہے
پھر التفاتِ دل دوستاں رہے نہ رہے

پھولوں میں اگر ہے بو تہاری
اس دل پہ ہزار جانِ صدائے
کانٹوں میں بھی ہوگی خوش تہاری
جس دل میں ہے آرزو تہاری

ہم اور معرکہ امتحاں سے ٹل جاتے
جواب پاؤں جو دیتے تو سر کے بل جاتے

تین قاتل پہ ادا لوٹ گئی
پس گیا چشمِ سر
رقصِ بسمل پہ قضا لوٹ گئی
پائے رنگیں پہ خالوٹ گئی
اس روش کے وہ چلے گلشن میں
بچھ گئے پھولِ صبا لوٹ گئی

دمِ اضر ہے لازمِ نظرِ راہِ کرنا
اتیر جاتے ہو بت خانے کی زیارت کو
خدا سے کام پڑا ہے تو خبر لینا
پڑے گا راہ میں کعبہِ سلام کر لینا

غیروں کے کبھی ہے کبھی مجھ سے ہے لگاؤٹ
کس نطفہ کی جھنجھلا کے وہ کہتے ہیں صل
بہکی ہوئی پھرتی ہے محبت کی نظر آج
ظالم تری آنکھوں سے گئی نیند کدھر آج
آغوش تمنا کی طرح باب اثر آج
مانگی ہے دعا کس نے الہی کہ کھتا ہے

اپنی گردش بہت ہی تجھے اے چنچ گھنڈ
جب میں جانوں کہ شب غم کی سحریدہ اگر

اے دیکھا لصدق کر دیا دل
اے میرا اس ناز سے ظالم نے دیکھا
کسی کو کیا مری آنکھیں مرا دل
نگاہیں بول انھیں وہ لے لیا دل

اس شان سے ہم کئے تری جلوہ نگاہ میں
اندھیر کر رہی ہے چشم سیاہ میں
شوخ کو قید کیجئے نیچی نگاہ میں
وہ دُشمنی سے دیکھتے ہیں کو دیکھتے تو ہیں
میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں
شعش دکھائی برق تجلی نے راہ میں

گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
پھر اسکی شان کرمی کے حوصلے دیکھے
گناہگار یہ کہہ دے گناہگار ہوں میں
جو مست ہوش میں آنے کا قصد کرتا کر
وہ بے قرار ہوں تجھے اگر ٹرپ میری
پکارتا ہے یہ ساتی کہ ہوشیار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشان سرمزار ہوں میں
قرار بھی یہ پکارتے کہ بے قرار ہوں میں

شوخ تھی قیامت تری ستارہ ادا میں
مشکل ہے مسحا کو بھی اب جان بچانا
فتنوں نے قدم چوم لئے لغزش پاہیں
نکلی ہے قضا چھپ کے حینوں کی اداس

خالق ہی جب نہ دے تو گلہ آسمان سے کیا
ساتی نہ لگائے تو ساغر سے کیا کہیں

۳۶۸ کیا قدر ہے فسانۃ الفت کی یاں امیر کہتے ہیں ہم سنیں نہ سنیں تم کہا کرو

داغِ افسردہ ہو چلے دل کے جھیللا تے چراغِ محفل کے
دل میں آکر نہ دل سے بھر نکلے تم تو ارمان بن گئے دل کے
اسکی رحمت سے لو لگا کر امیر آڑے آئے گی وقت مشکل کے

کہہ دی ہر حشر میں، آنکھ شرمائی ہوئی ہائے کسی اس بھری محفل میں سوائی ہوئی
وصل کی شبِ ہا رہی بے تابئی شوقِ وصل شرم بھجی ننگا ہوں سے تماشائی ہوئی

بال کھولے جو یار آتا ہے گھر کے ابر بہا راتا ہے
دردِ دل میں مری تسلی کو گریہ بے اختیار آتا ہے
تم کو آتا ہے پیار پر غصہ مجھ کو غصہ یہ پیار آتا ہے

جیسے بیل تو نے دو تیکے لئے لوٹی ہیں بکلیاں ان کے لئے
باغیاں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی بھیجا ہیں ایک کم سن کے لئے
وصل کا دن اور آسنا مختصر دن گئے جاتے ہیں اس دن کے لئے

آنکھ اس کو کھولنی بھی دشوار ہو گئی ہے چلے چمن میں زگرس بیمار ہو گئی ہے
انگور میں تھی یہ نئے پانی کی چار بوندیں جس دن سے پھنچ گئی ہے ملو ام ہو گئی ہے

عشق نے زور دکھایا تھا امیر کو کہن کو کہنی کیا کرتا

ہے آج جو سرگزشتِ بدنی کل اس کی کہانیاں نہیں گی

چھپتا ہے دل کا رنگ کہیں ضبطِ آہ سے حسرت نیک رہی ہے ہماری نگاہ سے۔

۱۔ رکھ کر مرے سینے پر یہ حکم لکھا گیا تھا کہ تم نے اس وقت تو گناہ کیا اگر تم لیا

یو جھینڈا اس زمانے میں الفت کا حال کچھ اک دم حقیقی قدیم سوہنوت ہوا لگتی

خنجر چلے کسی پڑ پڑتے ہیں ہم امیر سارے جہاں کا دود پھاڑ چکے ہیں

چھوڑے کہیں گیوئے پر خم نے اس کی چ

تم دکھاتے تو ہوا سی کا دیں اور جو وہ کوئی آہ کر بیٹھے

خانقاہوں میں جو یہ پھرتی رہ سکتی تھی تو یہ صحابی کے شریعتی بننے والے تھے

نہت ہے نہ کوئی ہوشیار باقی ہے جہاں کس سے اب ہوشیار باقی ہے

صبا ان منہ بندھی کلیوں نے شب کو کس کی چوری کی
کہ تو نے صبح کو ایک ایک کی بھینٹ سونپی ہے

عجب سانی قسم کے لے خائتری جس جھوٹ گئی دستہ از نیوی

خواجہ الطاف حسین حالی

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلتا کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

کچھ میری بے خودی سے تمہارا زیاں نہیں تم جانتا کہ بزم میں ایک خستہ جاں نہ تھا

دل سے خیال بہت بڑایا نہ جائے گا
تم کو نہ ارشدم ہسی مجھ کو لاکھ ضبط
نیسے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا
ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا
مے تہ و طہرت حوصلہ اہل بزم تنگ

دیکھنا پڑے گئے مجھے زخمِ دل
سبب ہو نہوں پہ یہ آنا کھڑا
اگر تیرا اس کا خطا ہو گیا
مرا شکر اسی کا گلہ ہو گیا
وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا
وہ رور و رو کے ملنا بلا ہو گیا
کیس سا وہ دل مبتلا ہو گیا
نہیں بھوتا اسکی نصرت کا وقت
پہنچتا ہے اشعارِ حالی سے حال

اب محروم گل پہ ہوا کب دل حزیں
ہر سمت گھر رونا قدا لیلایا ملت ہے
ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا
پہنچنے جو حوصلہ ہو کسی شہسوار کا

کس سے چمان و قابا بندہ رہی ہے بلبل
بے غم روزِ جدائی نہ نشاطِ غلبہ فصل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ ترکِ صورت
ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت
اک جزدگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت
اپنے بلبلوں سے سرسارے نازی مشاعر

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہمان دیکھتا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

آگے بڑھے نہ فقہ عشق بتلائے ہم
اب بھاگتے ہیں سایہ عشق تباہ ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے راز وہاں ہم
کچھ دل سے ہیں دے ہوئے کچھ آسمان ہم
نچھ پانگھے ہیں آپ کے طرز بیاں سے ہم
اب شوق سے بجا ڈکی باتیں کیا کرو

ہے جستجو کہ خوب ہے خوب تر کہاں
یار اب اس اختلاط کا انجام ہو یہ خیر
اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں
اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیش عشق
ہم جس پر مر رہے ہیں دے بات ہی کچھ اور
بہوئی نہیں قبول دعا ترک عشق گئی
اسکالی نشا طغیہ و سے ڈھونڈتے مہاب

کچھ منہ ہی کھل سنبھلا غم بھراں میں نہیں
نکھو دیا یا اس لئے ذوق تخلص فکر رساں
چاک دلی میں ہے درد جو کہ گریباں میں نہیں
اک مزا تھا سودہ اب کاوش نہاں میں نہیں
جس کم ہم قید سمجھتے ہیں وہ زنداں میں نہیں
خط میں لکھا ہے وہ القاب جو عنوان نہیں
ایسے الجھاؤ تری کا کل بیجاں میں نہیں
اب وہ انگلی سی رازی شب بھراں میں نہیں
یہ تو آثار کچھ اس مرد مسلمان میں نہیں
حالی زار کو کہتے ہیں کہ ہے شاہد باز

کچھ پتا منزل مقصود کا پایا ہم نے جب یہ جانا کہ ہیں طاقت رفتار نہیں
بات جو دل میں چھپائے نہیں تیری عالی سخت مشکل ہے کہ وہ قابل اظہار نہیں

یاران تیز گام نے محل کو جالیسا ہم محو نالہ و جرس کارواں ہے
یا کھینچ لائے دیر سے رندوں کو اہل وعظا یا آب بھی ملازم پیر مغاں رہے
دریا کو اپنی موج کی طغیانوں سے کام کشتی کشتی کی پار ہوا یا درمیاں رہے

رہرو تشنہ ب نہ گھرا نا اب لیا حشر بقا تو نے
خوش ہے امید خلد پر حاکمی کوئی پرچھے کہ کیا کیا تو نے

حق و وفا کا جو ہم جتانے لگے آپ کچھ کہہ کے مسکرانے لگے
سخت مشکل ہے سسھیروء قسیم ہم بھی آخر کو جی جرانے لگے

کیوں ٹھہراتے ہو اختلاط بہت ہم کو طاقت نہیں جدائی کی
نہ ملا کوئی غارت ایمان رہ آگئی سشدرم پار سائی کی

سید علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی

جھٹکے یار کا دل کو طال ہی گھا ہزار دھیان کو ٹال لا خیال آ ہی گیا
ذرا ہی تھیس بھی شیشہ کو تھی بہت سا تی ہزار تو نے بچا یا تھا بال آ ہی گیا

پیرِ مغان کے بھرت دیکھ چکے ہو مظلوم نہ بیو جوئے تو خیر حکم تو درجہ طراز کہ

آئے اگر عروس ہر محل کے میکے میں اب کہہ دو یہ صومعہ نہیں زاہد پاک باز کا

غضب نگاہ نے ساقی کی بندوبست کیا شراب بعد کو دی پہلے سب کو ست کیا
کوئی خفا ہو تو ہو امر حق گریوں ہے تجوں کی چال نے سب کو خدا پرست کیا

ناموں کی کشاکش سہہ نہ سکا خود تار نفس بھی ٹوٹ گیا
اک عمر سے تھی تکلیف جسے کل شب تو وہ تیدی چھٹ گیا
نازک تھا بہت کچھ دل میرا اے شاد تھل ہو نہ سکا
اک شخص لگی تھی یوں ہی سی کیا جلدیشیشہ ٹوٹ گیا

آکے دہخیر کو آنکھوں سے لگاتا ہے کون کس کے دل میں ہر ادب آکے دیوانے کا
خود چل اس کو چے میں چلنا ہے چلے پائے طلب کوئی وال ہاتھ پکڑ کر نہیں لے جانے کا

نرگس پر خار یا رکرتی ہے کام نہ ہر کا بادہ خوشگوار میں گھول دیا کسی ہم

ڈھونڈھو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں آیا اب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم لے ہم نفس وہ خواب ہیں ہم
میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ملکوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے کچھ بھی نہیں آیا اب ہیں ہم
اے شوق پہ کچھ تو ہی تاب تک یہ کوشش کچھ نہ ٹھہلا
ہم میں ہے دل بے تاب نہاں آیا آپ دل بتیا اب ہیں ہم
مہر خان قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آجاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاد اب ہیں ہم

حسن و عشق ایک ہیں ظاہر ہیں فقط ہیں دو نام
یہ اگر تسبیح ہے تو کیا اُن کے برابر ہم ہیں
عقل سے راہ جو پوچھی تو پکارا یہ جنوں
وہ تو بھٹکی ہوئی خود پھرتی ہے ہر ہر دم

ہوں گی زیادہ اس سے بھی عشق میں جگہ ہنسائیاں
دل نے تو آپ مول لیں اپنے لئے برائیاں
فصل خزاں ہے پد ملا اس سے خدا پناہ دے
سنا یہ صبا کے بھی گلو پھٹنے لگی ہوئیاں
حشر میں رند تھے خوش صحبت مئے سے چھوٹ کر
بیر مغساں کو دیکھ کر دینے لگے دباٹیاں

دسریں سوہانہ دل میں آجوں نہ لب پہ ساقی قضاں رہے گی
یہ ہی جو سماں ہیں یہ نہ ہوں گے تو پھر محبت کہاں رہے گی
بنا چلا ڈھیر راکھ کا تو بچھا چلا اپنے دل کی تسکین
بہت دنوں تک دلی دباؤ یہ آگ اے کارواں رہے گی
بہت سے تیکے چنے تھے میں نے مجھ سے صیاد تو خفا ہو
نفس میں گر مر بھی جاؤں گا میں نظر سوئے آشیان چہ گی
ہزار کھینچ کر جدا ہو مجھ سے ہزار دوری ہو میرے تیرے
جو اک کشش حسن و عشق میں ہے مرے تیرے دیاں ہے گی
ہزار نقش قدم سا کر زمانہ آنکھوں میں خاک ڈالے
جو تجھ سے چھوٹے میں ان کو تیری تلاش لے کارواں رہے گی
بہت سے بھولیں گے مجھ سے وگل یہی تو اس بلوغ کی روش ہے

چڑھائے جائیں گے آگ پر جو انیس کی خوشبو میں ہے گی

نصیر اس کا رکھ دل میں ہے میدا کا پیرا لگائے منہ جو آئینے کو آئینہ اسی کا ہے
یہ بزم سے ہے میں کو تہہ دستی میں ہے محرمی جو بڑھ کر غور اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

گاہیاں ہیں کچھ ایسے ادا فنا زبان کے کہ پہنچتے جاتے ہیں نغز شے پا کبدا زبان کے
تجھی کو نزع میں یو چھترے غمخوشتوں نے انہی وقت جبہ آیا چھپے نہ زبان کے
نظر اٹھانے میں ہوتا ہے باز پرس کا ڈر جہد کا کہہ رکھتے ہیں ناز زبان کو سر ناز زبان کے

دل اپنی طلب میں صادق تھا مگر کچھ سوئے مظلوم رہ گیا
دریا سے یہ سوتی نکلتا تھا اور یا ہی میں جا کر دوب گیا
لاریب غمخوشتی نے یتری تاثیر دکھائی مستوں کو
بے باک جو میکش تھا ساتی اس بزم سے وہ محبوب گیا

تفاوتوں میں الجھایا گیا ہوں کھلونے دے کے بہکایا گیا ہوں
ہوں اس کوچہ کے ہر ذرہ سے آگاہ اُدھر سے بدلوں آیا گیا ہوں
ہیں اُختے قدم کیوں جانب دیر کسی مسجد میں بہکایا گیا ہوں
دل مضطر ہے کوچہ لے رونق بزم میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

سید اکبر حسین کبر الہ آبادی

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

اک جھلک ان کی دیکھ لی تھی کبھی وہ اثر دل سے آج تک نہ گیا

نہ سحر چشمِ جاناں ہے نہ لطفِ غمزہ ساقی • تو پھر صحنِ چین میں دیدہ زنگسے کیا حاصل

غیر کے ذکر میں کرتے نہیں میرا وہ لحاظ • تذکرے آتے ہیں اور نامِ بنام آتے ہیں

کم بختِ دل کو کیوں ہے نگاہوں میں سیاتہ • ان کو تو شوقِ ناز و اداس کے ساتھ ہی

دل کو آنا جگہ تیر قضا کرتی ہے • حسن کا حق وہ نظرِ خوب ادا کرتی ہے

محمد ہادی عزیز لکھنوی

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن • بھوتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

شمع بج کر رہ گئی پروانہ جل کر رہ گیا • یادگارِ حسن و عشق اک داغِ دل پر رہ گیا

ایسے پھوڑکے دیجھا کئے صورتِ میری • دل مضطرب نے مرے ان کو سنورنے نہ دیا
اٹھ گیا آنجن ناز سے گھر کے کوئی • دردِ دل اپنا مجھے ختم بھی کرنے نہ دیا
تیریں دریاے محبت سے تھی کیا چیزِ عزیز • جو کوئی ڈوب گیا اس کو ابھرنے نہ دیا

عشق کی مجبوریاں کیونکر کہیں گے کہیں • غصہ ہے کہ جو ہم کو نہ کرنا تھا کیا
دل سے باتیں کرنے والے کچھ خبر بھی ہے تجھ • تیرے ہر انداز کو چھب کر کوئی دیکھا کیا

یہ تیری آرزو میں بڑھی وسعت نظر دیا ہے سب مری نگہ انتظار میں
لے بید لی نریوں کبھی بے کس کی اس توڑ دیا ہے شوق ہے دل اسیدوار میں

چارہ گر چپ میں گیموں علاج کریں کچھ تو اپنے کئے کی لاج کریں

ہاں نہ چھڑو اے طلبگارِ امانِ نشاط ہم یہ نہی اپنے تصور سے بہتے بایں گے

بخودی کو چہ جاناں میں لئے جاتی ہے دیکھے کون بچھے میری خبر دیتا ہے

اک تغیر حسن کی فطرت میں پیدا ہو گیا جب مرے شکوے انھیں کچھ کچھ نزدینے لگے

مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی

بلائیں لے رہا ہوں اس میں کئے ذرا کئے لٹا تھا جس جگہ راہ وفا میں گارواں میرا

وفور شوق میں اک اک قدم میرا قیامت تھا خدا معلوم کیونکر جلوہ زار حسن تک پہنچا

زورِ نظر سے خود بخود بند نقاب کھل گئے حوصلہ چشم شوق کا ہم نے انھیں دکھا دیا

لئے میں عشق کے دل دیرانہ چھٹ گیا چشم و چراغ خلوت جا نا نہ چھٹ گیا
اے محبت خدا کے لئے اپنی راہ لے گویا تیرے چھڑاے سے نیچا نہ چھٹ گیا

ہم بھی بیٹھے ہیں مانغ و دل کو آماؤ کرے^{۳۷} جب یہ شہرت ہوئی کھلنے کو نہیں گیسو رست

ہزاروں مر گئے محبوں کے ایسے دیکھانے مگر ملی نہ کسی کو بھی اتہمائے بہار

وہی یہ پھول ہیں جن کو ابھی بکھا تھا گلشن مگر کچھ اور ہی غصے ہو گئے گلچیں کے دہن

دے کے ساغر مجھے کس لطف سے ساقی نے کہا تو دیکھتے جاؤ ابھی ہم تمہیں کیا دیتے ہیں

جہاں تک بس چلا شو رخصاں روکیں گے فرقت میں
ذرا سی بات پر بدنام نام عاشقی کیوں ہو؟

زخم ننگا ناز و وہ دیکھیں کہ نہ دیکھیں کیا داد نہ دیں گے مجھے ارباب نظر بھی

ہجوم یاس جو دم بھر کو دل سے رست نہ جاے تو لب تک آنے کی حرف دیا گوارا ملے
میں اپنی تار نظر کی بنا رہا ہوں نقاب یہ مدعا ہے مجھی سے تری نگاہ ملے

ذائق بے محل سے وحشیوں میں رہی ہوگی ہنسی رو کے رہیں چاک گریبان کھینچنے والے

کمال بخیرہ گرزور جنوں پر خندہ زن ہوگا الہی آبرور کھنارے چاک گریبان

ریاض احمد ریاض خیر آبادی
پھول ہے لالہ صحرائی کا یا یکلجہ ترے سودائی کا

اٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانے میں ہو آئے پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یاد خدا میں

فصل مئے میں ہن اہد کے فرشتے بھی نہ کرک • یہ تکلف تو نہ تھے بزم میں ہم سے پہلے

شیخ جی گر گئے تھے حوض میں میخانے کے • ڈوب کر حشر کو تر کے کنارے نکلے

بکال دوں گا شب وصل بل نزاکت کے • فور الیا ہے بہت تیوریاں چڑھائے مجھے

— تو رہے ہماری بوتلی اچھی • جب ٹوٹی رہے جام ہو گئی ہے

رضا علی وحشت

ترنی سنا زرقاری سے ظاہر موج دریا تھا • نری ہنگامہ آرائی سے پیدا شور و عشر تھا

میں سادہ لوح واقف دم بتاں تھا • اقوار عشق کر کے گنہ گار ہو گیا

بنے گا ذوق عطا خود اس کا محرکہ آشنا نوازی

طلب کی خاطر دلا زکرنا ضرور کیا دست آرزو کا

دل و جگر خون کر رہی ہے سرور عشرت کی ناتامی

شراب خانہ میں تیرے ساتھی ہے کام کیا ساغر و سبو کا

مطلب ہے ہر سیر باغ سے افزائش جنون • ورنہ دھرا ہی کیا ہے نسیم بہار میں
وحشت نہ پوچھ ستی جب جنون مست • وحشت کے گل کھلائے ہیں خوش ہلا میں

تلخی کشِ نو میدی دُیدار بہت ہیں اس نرگسِ بیمار کے بیمار بہت ہیں
 عالم پہ ہے چھایا ہوا اک یاس کا عالم یعنی کہ تنہا تھے مگر قنار بہت ہیں
 کہوں کیا سجدہ ہائے شوق کی ہنگامہ رانی وہ طوفانِ یاد ہے اب تک زمین کوئے جاناں کو
 کیوں مجھ کو زخودِ رقتہ کئے دیتی ہے یار وہ بوئے دل آویز کہ ہمدوش صبا ہے
 شمعِ عشق کہ ہم ہو گئے رسولے جہاں خوبیِ حسن کہ سب آپ کو پہچان گئے
 اک آن میں وہ کچھ ہیں تو اک آن میں کچھ ہیں کروٹ مری تقدیر بدلتی ہی رہے گی
 ظالم کی تو عادت ہے سنا ہی رہے گا اپنی بھی طبیعت ہے بہلتی ہی رہے گی
 کیا کیا بگڑ رہے ہیں وہ اہلِ نظارہ پر تقریب ہے کشو دن بند نقاب کی
 ترے پھر کر آتے آتے کہیں نہ ہو کہ قاصد سری جان پر بنا دے مری دل کی نصیحت

مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقبِ قزلباش لکھنوی

بڑھائے جیلے دریا دلی نے ساقی کی ذراے جام میں سوار آفتاب آیا
 سنائیں کیا تمہیں نیزنگِ عشق کا قصہ تمام عمر نہ آنکھیں کھلیں نہ خوب آیا
 مری قید کا دل شکن ماجرا تھا بہار آئی تھی اشیاء بن چکا ہے

میری قضاحتی برق تجلی کا کیا قصو
بدنام مفت جلوہ جانا نہ ہو گیا
وارثہ زلف کا نہیں پابنہ فصل گل
جب دل میں لہر آگئی دیوانہ ہو گیا

زاد حیات نے نہ سکا قصد دل کا تھ
اس درپے جاتے جاتے میں افسانہ ہو گیا

بس اے فلک نشاط دل کا انتقام ہو گیا
یہ خذہ طرب فنا مبارک اہل دہر کو
نہ دم لے لے نہ شریک غم، تجھے قسم عشق کی
فہم وہ دل میں مدتوں لکھ سنبھل گیا
یہ آشیانہ ستم، چین میں ہو تو خرب سحر
یہ جی میں ہے کہ لے اڑوں فص میرا ہو چکا
سہنا تھا جس قدر کبھی زیادہ اس سے رو چکا
بہت زمانہ ہو گیا کہ میں ہنسی کو رو چکا
فلک کو چھوڑا ہے کون اگر مجھے ڈبو چکا
مزاج حسن و عشق کو بہت دنوں سو چکا
یہ جی میں ہے کہ لے اڑوں فص میرا ہو چکا

آئینہ جس میں سدا ڈوب کے ابھرا کیا حسن
حسن کے ہاتھ بندھے تو وہ ذرا دیر بھی
ایک ٹھہرا ہوا پانی ہے خود آرائی کا
مجھ پر احسان تری آئی ہو می انگریزی کا

سلسلہ ذکر جنوں کا آج کل باقی کر کوں
سیر عالم کے لئے کچھ چھوڑ لے دست جنوں
ختم کب کا قلعہ حب میریاں ہو گیا
اب تو دامن کی جگہ میرا گریاں ہو گیا

متاع عشق کا ہر دل کے بعد کیا سودا
کہ غم مشہ کا بھروسہ نہیں ملتا ملا
تڑپوں تو راز کھولوں سنبھلوں عشق ناخوش

جس حال کو میں سمجھا اچھا وہی برا تھا

اس کے سننے کے لئے جمع ہوا ہے محشر
رہ گیا تھا جو فسانہ مری رسوائی کا

بوٹے گل پھولوں میں جیتی تھی مگر وہ نہ سکی میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشاں نہ ہوا

ان کی بزم ناز میں تو سانس بھی دل نے نہ لی نالہ کش برسوں کا ایک تصویر بن کر رہ گیا

عشق میں سہل تھی فرہاد کی تقلید مگر یہ مری ہمت عالی کو گوارا نہ ہوا

یتیم رہتے گل گلشن کو میں کچھوں تو یہ ابھی ایسی تو ہتھیں قوت تسخیر بہار
میں تو میں گل بھی تو ہیں جامہ دردی میں شغول سب کو دیوانہ ٹھکے دیتی ہے تاثیر بہار

ہے روشنی قفس میں مگر سو جتا نہیں ابرسیاہ جانب گلزار دیکھ کر

صبر کی سالم قبا میں تو ہزاروں ہیں مگر ٹھیک ہوتی ہی نہیں کوئی دل صدمہ چاک

غیبت ہے قفس فکر رہائی کیا کریں ہم نہیں معلوم اب کیسی ہو چلی تو گلشن میں

بیان برق تختی چھڑا ہے اب سر طور عجب نہیں مرے دل کی بھی گفتگو آئے

ہجر کی شب نالہ دل وہ صدا دینے لگے سننے والے رات کٹنے کی دوا دینے لگے
باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مے جن پہ نیکہ تھا وہی پتے ہو ادینے لگے
ایک نہ ہو جائے میرا عشق ان کے حسن کا کیا مزہ ہو درد اگر خود ہی دوا دینے لگے

ہو تھا متناس کا آنسو نہیں تھے بہائے نہ جاتے تو ہرگز نہ بہتے
نکسین نہ جتنا نشانی تو رہتی ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رکھتے

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ہیں سو گئے داستان کہتے کہتے
کوئی نقش اور کوئی دیوار سمجھا زمانہ ہوا ہم کو چپ رہتے رہتے
ہماری ناؤ اس غم کے دریا میں ثابت کنارے پہ آہی لنگی بہتے بہتے

چلے ہدم ذرا سا زطرب کی چھٹی بھی سن لیں
اگر ذل بیٹھ جائے گا تو اٹھ جائیں گے محفل سے

مرا روٹا شب فرقت تماشا گاہ انجم ہے مگر ڈوبیں گے آخر کو یہ طوفان دیکھنے والے
کہے جا بندہ چلا ہے داستان کا رنگ محفل کیا مری سنتے لگے ہیں نئے جانناں دیکھنے والے

بہت سی عمر گزر چکی بنایا تھا مکان وہ جل گیا تھوڑی سی دہائی کے لئے
بنا کے مجھ کو نکالا ہے اپنی محفل سے وہ نیکیاں نہیں ابھی جو ہوں بی کے لئے

شوق بہار باغ میں سے کتنے چنے تو ہیں دیکھوں جو دیکھنے دے اسیری کا ڈر مجھے
غربت میں راہ کتنی ہے ناقب سے سبب قصہ سمجھ رہا ہے مرا ہم سفر مجھے

یادگار دہر ہے یہ خود فراموشی مری آپ کو بھولا ہوں زوروں کا فسانا یاد ہے

کروٹیں لیتی ہے دنیا آفریں درد دل بوجھ دیر ہے مگر سارے جہاں پہاڑ ہے

آئینہ اُن کو دکھایا جو خود آرائی نے ہاتھ رکھا مری آنکھوں پر شکیبائی نے
طور پر تاب رہی یا نہ رہی خیر اسگر کچھ تو دکھلایا دیا ذوق تنائی نے

بے شاد اپنی زلف کو چھوڑا نہ کیجئے میں دیکھتا ہوں خواب پریشاں کبھی کبھی
اک عمر کاٹ دی ہے سوا دکھاہ میں دھو تا ہوں شب کو جیٹھ کے دامن کبھی کبھی

صبح وصال دور تو اتنی نہیں مگر راتیں ہیں بیچ میں ہی زلف سیاہ کی

جدائی میں جس کو مٹاتی ہے الفت وہ عمر رواں پہلے ہی کٹ گئی ہے
وہی رات میری وہی رات اُن کی کہیں بڑھ گئی ہے کہیں گھٹ گئی ہے

دل اپنا خوف اسیری سے مطمئن کب تھا رہے جن میں مگر آشاں بنانے کے

تماشا چشم دل سے اہل عرفان کچھ ہی ہیں کسی پردے میں تصویر جاناں کچھ ہی ہیں گے

قفص کی تیلیاں اچھی ہیں تنکوں سے نشیب کے یہ سب کچھ ہے مگر صیاد دل پر کیا اجارے

حافظ جلیل حسن جلیل مانک پوری

فغاں میں درد دعا میں اثر نہیں آتا جو قم نہیں ہو تو کوئی ادھر نہیں آتا

یہ رنگ گلاب کی کلی کا نقشہ ہے کسی کی کم سنی کا
منہ پھیر کے یوں جلی جوانی یاد آگیا روشن کسی کا
دیکھو جلیل گوشت و ست جائے گا نام عاشق کا

کوئی حسین ہو ہیں اک نگاہ کر لینا جگر کو تھام کے چپے سے آہ کر لینا

نیا زمند ہوں کافی ہے ناز کرنے کو
کوئی نے نہ سنے مجھ کو درد دل کہنا
سلام جا کے انھیں گاہ گاہ کر لینا
اثر کرے نہ کرے مجھ کو آہ کر لینا

وہ شوق بھر دل تھا سرت سے تڑپ اٹھا
جلستے ہو خدا حافظ ہاں اتنی گذارش ہے
ثابت ہوا مجھ پر ناوک کا خطا کرنا
جب یاد ہم آجائیں ملنے کی دعا کرنا

برائے مانو اگر ذکر حور میں نے کیا
اب اس کو پردہ دری سمجھو یا کچھ اور کہو
غزور تم نے کیا تھا قصور میں نے کیا
تمہارے احسن کا چہرہ حاضر میں نے کیا

خاک چمن بیش بزم گل کا عجب ہے رنگ
سراغر کسی سے چھوٹے پر ہے شلوب کا
روئے رنگیں پہ پیسنے کا عجب عالم ہے
آب و آتش کو ہم دست دگر باندھنا

مستی بڑی بہار پہ کچھ منحصر نہیں
ساقی کے دم سے روز ہے موسم بہار کا
موسم گل میں عجب رنگ ہے بچانے کا
خوب انصاف تھی انجمن ناز میں ہے

کبہ گے شمع سے پروانہ کہ تا مکن ہے
میں جلوں اور کلیں رہے ٹھنڈا تیرا
موسم گل میں عجب رنگ ہے بچانے کا
خوب انصاف تھی انجمن ناز میں ہے

کام کرتی رہے نظر نام ہے بچانے کا
کام کرتی رہے نظر نام ہے بچانے کا
کام کرتی رہے نظر نام ہے بچانے کا
کام کرتی رہے نظر نام ہے بچانے کا

کام کرتی رہے نظر نام ہے بچانے کا
کام کرتی رہے نظر نام ہے بچانے کا
کام کرتی رہے نظر نام ہے بچانے کا
کام کرتی رہے نظر نام ہے بچانے کا

کام کرتی رہے نظر نام ہے بچانے کا
کام کرتی رہے نظر نام ہے بچانے کا
کام کرتی رہے نظر نام ہے بچانے کا
کام کرتی رہے نظر نام ہے بچانے کا

کام کرتی رہے نظر نام ہے بچانے کا
کام کرتی رہے نظر نام ہے بچانے کا
کام کرتی رہے نظر نام ہے بچانے کا
کام کرتی رہے نظر نام ہے بچانے کا

کام کرتی رہے نظر نام ہے بچانے کا
کام کرتی رہے نظر نام ہے بچانے کا
کام کرتی رہے نظر نام ہے بچانے کا
کام کرتی رہے نظر نام ہے بچانے کا

۳۸۶
رہا اسیر تو شکوے ہے اسیری کی رہا ہوا تو مجھے غم ہوا رہائی کا

منظر موسم گل کے ہیں ترے دیوانے ہاتھ رکھے ہوئے پیٹھے ہیں گریبانوں پر

بجلی کی تاک جھانکتے تنگ آنکھی زبان ایسا نہ ہو کہ چونکے وں غم و آشیان کیس

نگاہ برق نہیں پہرہ آفتاب نہیں وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

مڑے بے تازیوں کے آ رہے ہیں وہ ہم کو ہم انھیں سمجھا رہے ہیں

اوانکھ چراگے جانے والے ہم بھی تھے کبھی تری نظر میں

ہمارا ایک دم کی ہے کھلتا نہیں کچھ یہ گل کھل رہے ہیں کہ مر جھا رہے ہیں

سے پاندھ بچے کرب کے سر تلخ نشیمن ہم ہیں کہ گلستان کی ہوا دیکھ لہے ہیں

یا خدا درد و محبت میں اثر ہے کہ نہیں جس پر مڑتا ہوں اسے سیری خبر ہے کہ ہیں

راہ طلب میں ایسا خورفتہ کون ہوگا منزل پر ہم پہنچ کر منزل کو ڈھونڈتے ہیں

یہ جو سر پیچے کئے بیٹھے ہیں جان کستوں کی لئے بیٹھے ہیں

و اعظو جھڑو نہ رندوں کو بہت یہ سمجھ لے کہ پیٹے بیٹھے ہیں

دست درخت ہے کہ خبر کر دے کوئی ہم گریبان لئے بیٹھے ہیں

کس کا میں دیکھنے والا ہوں پوچھو کلیمؐ اک تفر میں مجھے سطور نظر آتے ہیں

تبسم تھا اس رنگ سے ان کے لب پرؐ میں سمجھا کوئی جام پھلکا رہے ہیں
ہے آباد میرے فقور کی دنیاؐ حسیں آرہے ہیں حسیں جاہے ہیں

نہ اشارہ نہ کنایہ نہ تبسم نہ کلامؐ پاس بیٹھے ہیں معرور نظر آتے ہیں

جھوٹے وعدے بھی نہیں کرتے آپؐ کوئی جینے کا سہارا بھی نہیں

مریضوں کو تسکین دے دیتے جاؤؐ دعا لیتے جاؤ دوا دیتے جاؤ
بھگتی ہے اس میں بھی شان اک فنا کیؐ یوں ہی تم دعا پر دعا دیتے جاؤ
جلیل آہی جائیگا رحم اس صہم کوؐ تم اللہ کا واسطہ دیتے جاؤ

بوئے مئے پاک سے چلتا ہوا بخانے کوؐ ایک پری تھی کہ لگالے گئی دیوانے کو
کوئی ایسی بھی ہے صورت ترے صدقے کیؐ رکھ لوں میں دل میں اٹھا کرتے بیخانے کو
دم زینت انھیں کیا جائے کیا یاد آیاؐ آئینہ توڑ دیا پھینک دیا شانے کو
ہے سبق یاد دو عالم کی فراوشی کاؐ ہوش اتنا تو ہے اب تک ترے دیوانے کو

اب آنکھ چراتا ہے پلاتے ہوئے ساغرؐ رندوں کی نظر لگ گئی ساقی کی نظر کو

وعدہ رہا نہ یاد تفساغل شکار کوؐ کیا اب جواب دول نگہ انتظار کو

اس گرفتار کی پوچھو نہ ٹپ جس کے لئےؐ ردِ نفس کا ہو کھلا طاقت پر دوازہ سو

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی
آتے آتے ان کو آئے گا خیال
بے سبب اپنی جگر کاہی نہیں
فنس گل آئی جنوں اچھلا پھیل
کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی
بیاتے جاتے بے خیالی جائے گی
عشق کی بنیاد ڈالی جائے گی
اب طبیعت کیا سنبھالی جائے گی

برائے سبیلی جو صبا لائی ہے
ناتج آج سے بہت دیر تھے ہم
دراغ جو تم نے دیا ہے مجھ کو
دشت بخوں میں بہار آئی ہے
بد محسوس کی لگا لائی ہے
وہ چراغ شب تنہائی ہے

اس شان سے وہ آج پئے استماں چلے
جب میں جلوں لکھایا بھی اپنا نہ ساتھ لے
آنکھوں میں کون آئے اہلی بھل گیا
اٹھتا ہوں میں جو دشت جانے لگے جو
فمنوں نے پاؤں جو م کے بوجھا کہاں چلے
جب تم چلوڑ میں چلے آسمان چلے
کس کی تلاش میں رہے اشک لہاں چلے
کہتے ہیں خار تھام کے دامن کہاں چلے

دل چرانے کی ادا خاص ہوا کرتی ہے
یار سے پردہ اٹھانے کو ابھی کیا کہئے
شام غریب کا فسانہ نہ ابھی چھوڑے دل
کہہ گئی آج وہ سیدر دنگے ش کے بیس
دیکھ لیتے ہیں وہ دزدیدہ نظر سے پہلے
ہولے دامن تو جہادیدہ تر سے پہلے
پہ چھ لیل حال وطن باد سحر سے پہلے
ہم نہ واقف تھے ترے درد جگر سے پہلے

کلی نہ آہ منہ سے مرے دل میں رہ گئی
تلوار قلعہ کے پنجہ قاتل میں رہ گئی
تھنے تھنے جہاں شمار وہ سب گئے تھنا
جنتی ہے تین ناز مزے لٹا و طیل
صد شکر بات غم کی محفل میں رہ گئی
بیل کی آرزو دل بسمل میں رہ گئی
رونی ہی رولوت آپ کی فعل میں رہ گئی
کہنا نہ پھر بھی کہ ہوس دل میں رہ گئی

شب و عمدہ عذرا ہو رہا ہے
داں آج خون دقا ہو رہا ہے
ستم ہے ستم کئے دل کا ڈھانا
یہ کیا کر رہے ہو یہ کیا ہو رہا ہے
جیل آج کل کشور دل میں اپنے
غم عشق سراں روا ہو رہا ہے

اچھا ہے وہ جو مجھ کو بھرتے ہیں بدر
آگاہ کر رہے ہیں محبت کی راہ سے
سیر چین کو آپ گئے تھے یہ گل تھلا
بھوئوں میں آگ لگ گئی برق نچا سے

اظہار حال پر مجھے قدرت نہیں ہی
ان کو یہ وہم ہے کہ محبت نہیں ہی
یا مگر ہر کہ شوق تھا یا آگ نگاہ میں
دہرا کی کلیم کو حسرت نہیں رہی

دل ہے عجیب گل چین رو نگار میں
زنجب تو بچوں کی ہے مگر وہ فاک ہے

بہم تم ملے نہ تھے توجہ الی کا تھا ملال
اب یہ طال ہے کہ تمنا مکمل گئی

میں نے پوچھا تھا کہ ہے تنہا مقصود کیا
خضر نے راہ بتائی مجھے سینا نے کی
ست کر دیتی ہے پہلے ہی نگاہ باقی
آنکھ کے سامنے چلتی نہیں جانے کی
بے خودی میں بھی یہی نہ سے نکلا ہر جلیں
شیشے آباد رہیں خیر ہو جانے کی

مست کرنا ہے تو غم نہ سے رگا دلتی
تو پلائے گا کہاں تک مجھے بیانے سے
پارسانی کا بہت کرتے تھے اظہار جلیں
جھوٹے آج چلے آتے ہیں سیانے سے

وہ بھی آنے کو ہیں قیامت بھی
دیکھو کون پیشتر آئے
دل کے داغوں کا ہے وہ رنگ جلیں
باغ جیسے بہار پر آئے

وہ پھر بھی حسن پہ اپنے غور کرتے ہیں یہ جانتے ہیں کہ ہے شام ہر سحر کے لئے
شب وصال گئی داغ دے کے فرت کا تیار یہ بھول کھلا دامن سحر کے لئے
جلیل دیدہ خونبار سے خدا سمجھے لہو کی بوند نہ چھوڑی دل و جگر کے لئے

سینے سے میں لگائے ہوں بھگو خیال میں اوست ناد کچھ تجھے اپنی خبر بھی ہے
دل کی خوشی یہ ہے کہ لڑے آنکھ یار سے اس پر نظر نہیں کہ وہ جادو نظر بھی ہے
شوخی بھی ہر نگاہ میں شرم و حیا کے ساتھ آنکھ اس کی پردہ دار بھی پردہ در بھی ہے

خون میرا اگر شریک ہوا رنگ دے جائے گی حیاتیری
عشق کا آج استہان ہے جلیل مشکل آساں کرے خدا تیری

چھنے والے تجھے خبر بھی ہے نگہ شوق پردہ در بھی ہے
کچھ تو بے چین ہیں وہ شوخی سے کچھ مری آہ کا اثر بھی ہے
نئے تماشا کہ دل فگاروں میں نام قاتل کا چارہ گر بھی ہے

ہو مزہ تم جو اٹھا دو رخ روشن سے نقاب شمع نازاں ہے کہ ہے رونق محل مجھے
جذبہ دل کا اثر ہو کے رہا ان یہ جلیل اب تو ہوتے ہیں اشائے محفل مجھے

ہیں کیا لے جنوں کا نئے جو دامن گیر تے ہیں نہ ہم رکھیں گے دامن کو نہ وہ الجھیں گے دامن
خدا جلے حقیقت کیا ہے لیکن میں یہ نہتا ہوں اٹھ کا قتنہ محشر تمہاری چشم پر فتنے سے

دیکھا جو حسن یا طبیعت پل گئی آنکھوں کا تھا قصور جھری دل پل گئی

عجب حوصلہ ہم نے غیظوں کا دیکھا

جسے ہم پر ساری جوانی سٹا دی

جب تک خلش درد تھی یک گونہ مرا تھا

تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں

دو قدم کو چہرہ رسوائی ہے

ناز بھی ہوتا رہے ہوتی رہے یاد بھی

تم جو کہتے ہو بگڑ کر ہم نہ آئیں گے تم بھی

سب گوارا ہے جو تم سنتے رہو فریاد بھی

یہ بھی کہہ دو اپنا آئے گی تمہاری یاد بھی

عجب ادا ہے چمن میں بہا آتی ہے

کچھ اندیشہ کسی کا نہیں طبیعت پر

پھر شوق تماشا سے جاتا ہے کسی سمت

پھر ذوق طلب مجھ کو تماشا دہنا دے

ادا داتی تری موجِ شراب ہو کے رہی

کسی میں تاب کہاں تھی کہ دیکھنا ان کو

جیلِ فتنہ بہاری کی دیکھئے تاثیر

نگاہِ مست سے دنیا خراب ہو کے رہی

اٹھی نقاب تو حیرتِ نقاب ہو کے رہی

گری جو بوند گھٹا ہے شراب ہو کے رہی

چمن کے چھل بھی تر ہے خوشہ چیں بکھے

کسی میں رنگ ہے تیرا کسی میں تیری

کندو یہ کوہکن سے کہ مرنا نہیں کمال

مرمر کے بجز یار میں جینا کمال ہے

اللہ دری تمہی کہ بخیا کے آگے

یوں شمع ہے مغل میں مغل میں نہیں ہے

شوکت علی خاں فانی

یہ راہِ شوق کوئی رازِ دامن نہ تھا آنکھوں کو ورنہ جلوہ جاناں کہاں نہ تھا
اب تک تری گلی میں یہ سوا یاں نہیں اب تک تو اس زمین پر کوئی آسماں نہ تھا
ہر شاخ پہ یہ شجر سے نہ تھی جلیوں کو ٹاگ ہر شاخ ہر شجر پر آتشیاں نہ تھا
اندلس بے نیازِ آدابِ انصاف دیکھا مجھے تو پاسے نظرِ دریاں نہ تھا
میرے دلِ رنیو رکاحسنِ جلب تو دیکھ گو یا زباں پر حرفِ تمنا گراں نہ تھا

اور تسلی سے سوا ہو گئی دردِ جگر یہ بجھے کیا ہو گئی
اور یہی بے تریِ نفوس میں آج کون گرفتارِ بلا ہو گئی

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا ایک گمراہ ہے دنیا اسی دیوانے کا
ایک معصوم ہے نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا نہ لگے گا ہے کو ہے خوابِ دیوانے کا
مختصر قصہ غم یہ ہے کہ دل رکھتا رہا رازِ کوہِینِ خلاصہ ہے اس افسانے کا
ہر نفسِ عمرِ گزشتہ کی ہے میتِ فانی زندگیِ تمام ہے سرِ مر کے جسے جانے کا

خود برق ہو اور طورِ تجلی اسے گتہ رہا خود شعلہ بن اور ادنیٰ سینا سے گتہ رہا
یے واسطہ خود نگری اپنی طرف دیکھ آئینہ انجما حسنِ خود آرا سے گتہ رہا
اپنی ہی نگاہوں کا یہ لفظ و کلماتِ شک اس سرحدِ سعیِ تماشا سے گتہ رہا

کیوں جنوں پھر زباناں میں بہا لگتی ہو بڑھ چلا ہے مرے دامن سے گریباں میرا

لے جذبے خودی ترے قربان جائیے چترائے دل میں کوئی مجھے دھونڈتا ہوا
نیری ہوس کو طیش دو عالم بھی تھا قبول تیرا کرم کو تو نے دیا دل دکھا ہوا

بچہ کو مرے نصیب نے روز ازل نہ کیا دیا دولت دو جہاں نہ وی اک دل متلا دیا
دل ہی نگاہ ناز کا ایکہ او شناس تھا جلوہ برق طور نے طور کو کیوں جلا دیا
دل میں سما کے پھر گئی اس بندھانے گئی آج نگاہ دوست نے کعبہ بنا کے ڈھکا دیا
بہت کسی طرح کٹی جذب مری زندگی کی را چھیر کے داستان غم دل نے مجھے سلا دیا
یس نہ در نہ ہی نہیں حق تو یہ ہے داہی فانی تو ناما امیر کو موت کا آسرا دیا

شوق سے ناکامی کی بد دست کو چٹہ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں دل بٹھ گیا جی چھوٹ گیا
فصل نکل آئی یا اصل آئی کیوں درندہاں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آپہونچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا
منزل عشق پہ تہا پہونچے کوئی تنہا سا نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک ساتھی چھوٹ گیا
فانی ہم تو جیتے جی وہ سیت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو اس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا اک جوش تھا کہ محو تارائے جوش تھا
وحشت بقید چاک کھریاں و انہیں دیوانہ تھا جو معتقد الہ ہوش تھا

جمال خود رخ بے پردہ کا نقاب ہوا نئی ادا سے نئی وضع کا حجاب ہوا
لازل میں مجھے نیری زندگی کے عوض وہ ایک لمحہ ہستی کہ صرف خواب ہوا

وہ جلوہ مفت نظر تھا نظر کو کیا کیجئے
 الٹ گئی مری امید و بیم کی دنیا
 یہ کیا نظام مناس میں انقلاب ہوا
 گناہ نگار بھی دل مگر تصور معاف
 ظہور شوق بہ اندازہ حجاب ہوا
 قضا کو مژدہ فرصت کہ فانی ہجور
 شہید کشمکش صبر و اضطراب ہوا

جلوہ عشق حقیقت تھی حسن مجاز بہانہ تھا
 شعلہ آنکھوں کے ہم نے ایسے کتنے دیکھے ہیں
 شمع جسے ہم سمجھتے تھے شمع نہ تھی پروردہ
 دل اب دل ہے خدا کھسکتا کوئی مٹانے تو
 آئینہ کھلی تو دینا تھی بند ہوئی افسانہ تھا
 فانی کو کیا ہی سہی پھر بھی تجھی سے نسبت تھی
 ورنہ کسے معلوم نہیں ٹوٹا سا باز تھا
 دیوانہ تھا، تھا کس کا تیرا ہی دیوانہ تھا

بوئے خزاں سے مست ہیں یاد ہیں سار کیا
 دل ہے تری نگاہ تک جان ہے ایک آہ تک
 ہم تو جن پرست ہیں محل کہاں کے خار کیا
 جو غم بے اثر نہ ہو جو شب بے سحر نہ ہو
 حوصلہ کہ امید کیا ظرافت امیدوار کیا
 کھیل تھا سب امید کا یہ نہ رہی تو کچھ نہ تھا
 وہ غم انتظار کب شب انتظار کیا
 آرزوں کی کیا بساط شوق کا کار و بار کیا

وہی برق تجلی کا فرما اب بھی ہے لیکن
 بہار اپنی چمن اپنا فقس کی تیلیوں تک ہے
 نگاہوں کو میرا ہی نہیں بے ہوش ہو جانا
 قیامت ہے یہ ٹھوڑا داستان عشق کا یعنی
 میاں کو نگہت گل کو چمن پرودش ہو جانا
 مرے راحت طلب دل کو اذیت کوش ہو جانا

کیا سوال تو آواز باز گشت آئی
 جنون شکوہ بیداد پر خدا کی مار
 جواب مجھ سے طلب ہے مے سوالوں کا
 اثر کئے ساتھ گیا اعتبار نالوں کا

آغوش فنا میں ہم پروردہ آفت میں
 اے فتنہ دوراں اٹھ لے حشر یا ہو جا

۳۹۵ ہر قافلہ دل کو قمر شدہ منزل سے ہر رہ گزر غم میں نقش کف پار ہوا

اس دل یلوس کی دیرانہ سازی کچھ نہ بوجھ اس نے جب رجو حین تاکا بیاباں ہو گیا
اس کے دامن سے اٹھتا ہوا بے منت شوق یہ بھی دیوانے کوئی میرا گریباں ہو گیا

گل میں اب نہیں ہے جو عالم تھا خار کا اللہ کیا ہوا وہ زمانہ بہار کا
ہر ذرہ جلوہ نگاہ ہے ہر دل ہے چشم شوق اللہ سے اہتمام تماشا کے یار کا

شاید میں درخونگہ گرم بھی نہیں کبھی ٹڑپ رہی ہے مرے اشیائے دور
آنکھیں چراگے آپ نے انسانہ کر دیا جو حال تھا زباں سے قریب بیاباں سے دور

بنایا تھا نشیمن شاخ گل پر کس گھڑی یارب کبھی جاتی ہے ہر برق بلا شاخ نشیمن پر

کون اٹھائے مری وفا کے ناز اب نئے سرے سے چھڑ پرودہ ساز
کھل گیا میری زندگی کا راز صورت و منصور و طور ارے قور
دل ستم دوست وہ رقیب نواز میں ہی تھا ایک دکھ بھری آواز
لے شب ہجرتی عمر دراز ایک ہے تیری بات کا انداز
ہو گئی صرف ہمت پرواز رہ گئی تھی جو بازوؤں میں سکت

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا بات پہ پہنی تری جوانی تک

نہ انتہا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم رہا یہ وہم کہ ہم ہیں وہ بھی کیا معلوم
ہو انداز رضا فاش وہ تو یہ کہتے مرے نصیب میں تھی ورنہ سبھی نا معلوم

مری وفا کے سوا غائب تھا کیوں تھا تیری جفا کے سوا حاصل وفا معلوم

وادی شوق میں دار نہ رہا ہر دم بے خودی کچھ تو تیا کس کے گنہ گار ہم
حسن حیرت نے سر پہ نہ شانہ نہی تیری محفل میں ہیں گو نقش بدلوں میں ہم
وہ ہے مختار سزا دے کہ جزائے فناں دو گھڑی ہو جس میں آنے کے گنہ گار ہم

گو بیٹھے بھی اٹھے بھی ہم محفل دشمن میں تیری خاطر
بیٹھے گئے دل زار کی صورت اٹھے صورت درد و جگر ہم
مشکوہ جو برتیاں ہم کرتے ظاہر درد نہاں ہم کرتے
مانا آہ و فغاں ہم کرتے لانے کہاں سے تجھ کو اثر ہم
دوست تسلی دینے آئے لے کے دو ایل جا رہا آ
بلجھے آئی زخم جگر پر اور اک سنا زہ آفت مر ہم
ڈوب ہی گیا اسے کشتی ہستی کچھ تو بڑا زور بہ کمال
خیر ظالم خیر جہاں میں یوں لایا میاں میں کے زیر و زبر ہم

جتنے منہ ہیں اتنی باتیں دل کا یہ کیا خاک چلے
بس نے دل کی پوری کی ہے ایک اسی کا نام نہیں
رک کے جو سانسیں آئیں نہیں مانا کہ وہ آہیں خیرین
آپ نے تیرے کیوں بدلے آہوں میں کسی کا نام نہیں
دل ہی پو اپنا بس نہیں چلتا ان کی شکایت کیا کچھ
آپ ہم اپنے دشمن ٹھہرے دوست پر کچھ الزام نہیں

مرکزے خیال کو مائے ہوئے تو ہیں ہم جان دے کے دل کو سنبھا ہوئے تو ہیں

بیزار ہونہ جائے کہیں زندگی سے نل
تائیر سے خفا میرے نامے ہوئے تو ہیں
ہاں درد عشق ان پر کرم کی نظر ہے
صبر و قرار میرے حوالے ہوئے تو ہیں
قافی تیرے عمل ہمہ تن جہرا ہی
سایحے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

غم خانہ دل کا کیا کنا وہ کچھ بھی ہے یہ بات کہاں
خلوت میں یہاں جو جلوت تھی وہ آج تری محفل میں نہیں
مٹتے تھے محبت آسار ہے وائے نسبت آسارے مگر
اس ہنس میں جو دشواری ہے وہ شکل کی شکل میں نہیں
جب ڈوبنے والے ڈوب چکے اور ساحل دور کیا ہے
پھر لطف امید و بیم کہاں دریا میں نہیں ساحل میں نہیں

وہ ایک رنگینی نظر ہے جو سو بہاروں میں دیکھتا ہوں
میری محبت کی غایوں میں ادائے حسن تمام دیکھو

بہار لائی ہے پیغام انقلاب بہار
سبکھ رہا ہوں میں کیوں کے سکرانے کو
یہ شعبہ ہے پرکشش آگے میرے
تری نگاہ نے سبکھلا دیئے زمانے کو
خیال یار بھی کھویا ہوا سارہ تھا
اب ان کی یاد بھی آتی ہے بھول جانے کو
نگاہ لطف نہ فرما نگاہ ناز کے بعد
جگر میں آگ لگا کر نہ آج بھانے کو
زمانہ برسرِ آنداز تھا عکسِ ثانی
ترپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

منہ ڈھانپ لیا جوشِ ندامت کے اثر سے
خورشیدِ قیامت نے مرے دامن سے
دل جن سے ملے اب وہ گاہیں نہیں ملیں
ملنے کو تو ملتی ہے نظر ان کی نظر سے

ہوش ہے نہ دوش کا فکر ماں رہ نہ جائے غلوت یاد یاد میں کوئی خیال نہ جائے
عجز ادا دھر غرور دونوں غور سے غور دامن مدعا سے دور دست ہوا نہ جائے

اک برق سرخوردہ ہے لہرائی ہوئی سی دیکھوں ترے ہونٹوں پہ منہسی آئی ہوئی سی
سختا ہوں جو آتی ہے صدا پر وہ دل سے اُمید کی آواز ہے قہرائی ہوئی سی
یرے دل برباد کے دھندلے سے نشا ہے اس باغ میں کلیاں ہیں جڑ جھانسی ہوئی سی

آزردہ کیوں مجھے مری شفتگی سے تم آخر یہی تو زلف شکن در شکن میں تھی
اس کے سوا ہنسی خبر آشیاں مجھے میں تھا اسیر دام تو بجلی چمن میں تھی
بے پردہ ذکر بار ہے در پردہ یاد یار میری دباں پہ ہے جو دل برہن میں تھی
وہ گل ہے گل جسے تری خلوت میں بار تھا وہ شمع شمع ہے جو تری انجمن میں تھی
بیلا ہوا تھا رنگ گلوں کا ترے بغیر کچھ خاک سی آڑی ہوئی سائے چمن میں تھی

فضل گل خیر تو ہے دشت میں دیوانوں کی دامنوں کی خبر آئی نہ گریبانوں کی
چشم ساقی کی وہ محمور نگاہی تو بہ آنکھ پڑتی ہے پھلکتے ہوئے بچانوں کی

چمکا دیا ہے رنگ چمن لالہ زار نے شاید خزاں کو آگ لگا دی بہار نے
ہاں ہم نہ تھے فریب تناس سے بے خبر کیا کہئے کیا کیا دل امیدوار نے

داد خود نمای لے وعدت تناسے آئینہ طلب فرما کثرت تماشا سے
حشر وہ کیوں چھپیں کہ نہ دوں جو نسبت شان بے نیازی کو آرزوئے بولے
لے ترا تصور بھی جا کے اب نہ آئے گا رسم ہوش! سختی ہے عاشقی کی دنیا سے

اٹھ اے نشاط شوق اٹھ متاع بچائے ہوئے وہ دامن نگاہ میں ہیں بکریاں لئے ہوئے
 حجاب روزگار میں جھلک ہے یادِ یار کی نشاطِ آخر کار سے غم نہاں لئے ہوئے
 بنائے غم کی خیر ہو کہ آج آہ و افسوس چلی ہے دل کی وادیوں سے آنکھیاں لئے ہوئے
 نہ پوچھ عہدِ ہوش کی کہ دامنوں کی آڑ میں بھرا کیا ہوں دامنوں کی دھجیاں لئے ہوئے

تغیر آئیاں کی ہوس کا ہے نام برق جب ہم نے کوئی شاخ چنی شاخِ جل گئی

دنیا میری بلما جانے ہنگی ہے یا سستی ہے موت ملے قومفت زلوں ہستی کی کیا سستی ہے
 آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں جوا جڑے اور پھر نہ بے دل نہ زالی سستی ہے
 عجز گناہ کے دم تک میں عقمت کا لکھتے ہیں سستی ہے تو بلند ہے رز بلندی سستی ہے
 جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بد میں آگے مرضی گا کہ کی ان دامنوں تو سستی ہے
 جنگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہے جب بھی دنیا سستی تھی اب بھی دنیا سستی ہے
 آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ اند آتا ہے دل پر گھاسی چائی ہے ٹھنکی ہے برستی ہے
 دل کا اجڑنا سہل سہی بنا سہل نہیں ظلم سستی بسنا کھیل نہیں ہے بے بے سستی ہے
 قافی جس میں آنسو کیا دل کے ہو کا کال تھا ہاے وہ آنکھ اب بانی کی رو بوندوں کی ترسٹی ہے

سائیں آنکھ میں کیا شہدے قیامت کے مری نظریں ہیں جلوے کسی کے فامست کے

لب تک آجائے غم ایجر تو شکوہ ہو جائے آپ سن لیں تو مجب کیا ہے کہ افسانہ بنے

حسابِ حسرتِ جرمِ نظارہ دل سے پوچھ نظر تو ایک جھلک کی گناہگار ہوئی
 بہارِ نذرِ تغافل ہوئی خزاں ٹھہری خزاں شہیدِ تبسم ہوئی بہارِ ہری

۴۰۰
خندے خانے کو کہتے ہیں بقول اعظمی
دشت و خشت ہے وہ رازِ بیاہاں ہے جو آفتابِ ہوا
کعبہ بت خانے کو کہتے ہیں جو دیراں ہوئے
دشت و خشت ہے وہ ذرہ جو بیاہو جا

اپنے دیوانے پر اتمامِ کرم کر یا رب
درو دیوار دے اب اھیں یرانی ہے
دشت تازہ کا نور و مبارک نئے عشق
پھر بہار آئی مجھے خلعتِ عربانی ہے

وہ وعدہ آساں پر پائل نظر آتا ہے
اب کارِ تنہا پھر شکلِ نظر آتا ہے

ہوتا نہیں اب ان کی محفل میں شمار اپنا
یوں بیٹھے ہیں ہم جیسے اٹھ سے گئے محفل سے

اس کے سوا نہیں خبر آشیاں مجھے
میں تھا ابرو دام تو بجلی جن میں تھی

بے ذوق نظرِ زم تماشا زہے گی
منہ پھیر یا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی

وہ نظر کا میاب ہو کے رہی
عشق کا نام نکھوں کریں بدنام
نغمہ شوق کا آئال نہ پوچھ
سر بسرا اضطراب ہو کے رہی
چشمِ ساقی کہ تھی کبھی غمخور
خود ہی آخرِ شراب ہو کے رہی
تابِ نظارہ نہ لاسکا نہ کوئی
بے حجابی حجاب ہو کے رہی
ہم سے فراقی نہ چھپ سکا غم دوست
آردو، بے نقاب ہو کے رہی

ہاں، ناخنِ غم کھی نہ کرنا
ڈرتا ہوں کہ زخمِ دل نہ بھر جائے

سید فضل الحسن حسرت موہانی

عشق میں تیرے دل جو ایک جہان بخودی جان عزیز بن گئی حسرت بے قیاس کا
روشن پیر بن ہوئی خوبی جسم نازین اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرصداری کا طرہ عالم ہے ترے حسن کی ریداری کا

دل کو خیال یار نے محمور کر دیا ساغر کو رنگ بادہ نے پر نور کر دیا
مادس ہو چلا تھا تسلی سے حال دل پھر تو کئے یاد آگے بستور کر دیا
گتنخ دستیوں کا نہ تھا مجھ میں حوصلہ لیکن ہجوم شوق نے عبور کر دیا
بے تابیوں سے چپ نہ سکا ماجر اذل آخر حضور یار بھی نہ کور کر دیا
حسرت بہت ہے مرتبہ عاشقی بلند تجھ کو تو مفت لوگوں نے مشہور کر دیا

مٹتا ہے مٹانے سے اب شوق کہیں تیرا ہے پیش نظر ہر دم حسن نکلیں تیرا
آنکھوں کے تہہ نے سب کھول دیا پردہ ہم پر نہ چلا جاو اسے چن جبکہ تیرا
مرغوب مٹا ہے انہوب دل و جاں ہے ہر کوئے جفا تیری ہر شیوہ کیں تیرا
ہم خوب سمجھتے ہیں حسرت سے تری باتیں اقرار کا پردہ ہے انکار نہیں تیرا

رنگ یہ لایا ہجوم ساغر و پیمانہ آج بھر گئی سیرایون سے منسل زندانہ آج
بسکہ زیب انجمن ہے جلوہ جانانہ آج ہے مہرایا کرد و ہر عاشق دیوانہ آج
یہ جوابے تابیوں پر نشہ سے لکے کا اثر کہہ دیا سب اُن سے حال شوق و اشتیاق
رنگ سے مٹ مٹ گئے ہم نشہ کا مادہ جب مالب اسے مالب اسے مالب اسے

ہے فروغ بزم بیکتائی جو وہ شمس جمال
فرق ہے رنگینوں میں سینوں میں چرچو
آگئی ہے دل میں بھی بیتابی پروانہ آج
ہے سراپا بے خودی وہ نرگس متا نہ آج
پدرہ ہی ہیں سب نگاہیں اس پشیمانہ آج
میں ہی اس حسرت نہیں عوجال سے یا

معمور مجھ کو جان کے عہد وفا کے بعد
محبوبی سوال سے اس چشم ناز میں
بے ہریاں وہ کرنے لگے اعتنا کے بعد
منظوریوں کا رنگہ عیاں دیکھ کے بعد

مردم طرب ہے دل دلگیر ابھی تک
اک بار سنی تھی مومے دل میں ہے موجود
باقی ہے ترے عشق کی تاثیر ابھی تک
اے جان منا تری تقریر ابھی تک
پہلو میں ہے کچھ کچھ خلش تیرا ابھی تک
بھولی نہیں دل کو تری دزدیدہ نگاہی

روشن جمال یار سے ہے محسن تمام
حسرت غرور حسن سے شوخی سے اضطراب
دیکھا ہوا ہے آتش گل سے چمن تمام
دل نے بھی تیرے یکہ لمہ ہیں چمن تمام
بے ہوش اک نظریں ہوئی آئین تمام
دیکھو تو چشم پار کی جبا دو نگاہیاں

خبر دیوں سے یاریاں نہ گئیں
عقل صبر آزما سے کچھ نہ ہوا
دل کی بے اختیاریاں نہ گئیں
شوق کی بے قراریاں نہ گئیں
دل کی اُمید واریاں نہ گئیں
اپنی الفت شماریاں نہ گئیں
عشق کی تازہ کاریاں نہ گئیں
درد کی غم گساریاں نہ گئیں
تھے جو ہر رنگ ناز ان کے ستم
مر کے بھی خاک راہ یار ہوئے
حسن کی دل فریبیاں نہ گئیں
سب نے چھوڑا تجھے مگر حسرت

نگاہ شوق کیونکہ کامیاب شادمانی ہو غضب کا عیب ہے، اُس شوق کے خمیسا ہیں

نہیں ہے ضبط شوق پہ آکر معاملہ اس درجہ آرزو کی بلصیں بے نیاز یا
رنگ بہار باغ ہے جہان یک نفس اسے واسے غلیب تری شادمانیاں

نہ چھڑے ہم نشیں کیفیت صہبائے افغان شرب بے خودی کے جھکوسا غریب آتے ہیں
نہیں آتی تو یاد آئی جہینوں تک نہیں آتی مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

وصل کی منتی ہیں ان باتوں کے تیرے کہیں آرزوؤں سے بچا کرتی ہیں تقدیریں کہیں
بے زبانی ترجمان شوق بیحد ہو تو ہو ورنہ پیش بار کام آتی ہیں تو نہیں کہیں
الطاف یاد تھا اک خواب آغا زوفا سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیر کہیں
تیری بے صبری بھرت خام کادی کی نسل گریہ عشاق میں رہتی ہیں تاثیریں کہیں

نگاہ یار جسے آشناے راز کرے وہ اپنی خوبی قسمت پہ کیوں نواز کرے
دلوں کو فکر دو عالم سے کرو یا آزاد ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
خود کا نام جنوں پر اچھا جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے
امید وار ہیں ہر سست عاشقوں کے گروہ تری نگاہ کو اللہ دلواز کرے

لایا ہے دل پر کتنی خسرابی سے یار تیرا حسن شرابی
پیرا ہن اس کا ہے سادہ زنجیر عکس مئے سے شیش نگاہی
عشرت کی شب کا وہ دور آخراقتی نور حسرت کی وہ لا جوابی
پھرتی ہے اب تک دل کی نظر میں کیفیت ان کی وہ نیم خوابی
بزم طرب ہی وہ بزم کیوں ہو ہم غم زدوں کو داں بار یا بانی

اس نازنین نے باوصف عصمت کی دسل کی شب وہ بے حجابی
 شوق اپنی بھلا گستاخ دستی دل ساری شوخی حاضر جوابی
 وہ روئے زیبا ہے جان خوبی میں وصف جس کے سارے کتابی
 اس قید غم پر مستمیان حسرت عالی جنابی ، گردوں رکابی

اس بزم سے آزرده نہ آسگی محبت آئین وفا مد نظر لے کے گئی ہے
 جبے کے گلے ہے ہنس تاکوئے ملاست مجبورئی دل خاک بیلے کے گئی ہے
 پہلے ہی سے مایوس نہ کیوں ہوں کہ دعا کو قسمت مری محروم اثر لے کے گئی ہے
 اللہ سے کافر ترے اس حسن کی مستی جو زلف تری تابہ کمر لے کے گئی ہے

جو چاہو سزا دے لہ تم اور بھی کھل کھیلاو بے ہم سے قسم لے لو کی ہو خوشکایت بھی
 دشوار ہے رندوں پر انکار کرم یکسر اے ساقی جاں پرور کچھ لطف عنایت بھی
 دل لیکر سے دیوانہ اس حسن گلابی کا رنگین ہے اسی روئے شاید غم فرقت بھی
 خود عشق کی گستاخی سب تجھ کو کھالے گی اے حسن حیا پرور شوخی بھی شرارت بھی
 عشاق کے دل نازک اس شوخ کی خزانہ نازک اسی نسبت سے ہے کار محبت بھی

آنکھوں کو انتظار سے گردیدہ کر چلے تم یہ تو خوب کار پسندیدہ کر چلے
 مایوس دل کو پھر سے وہ شوریدہ کر چلے بیدار سارے فتنہ خوابہ کر چلے
 اظہار التفات کے پردے میں اور بھی وہ عقدہ ہائے شوق کو حمیدہ کر چلے
 ہم بے خودوں سے چھپتے سکا راز آرزو سب اُن سے عرض حال دل قدیدہ کر چلے
 تسکین اضطراب کو آنے تھے وہ ہنر بے تابوں کی روح کو بالیدہ کر چلے
 یہ طرفہ ماجرا ہے کہ حسرت سے مل کے وہ کچھ جان و دل کو اور بھی شوریدہ کر چلے

ہم سے اور ان سے کہی بات چلی جاتی ہے
 بکس لطف و غنا سے کہی جاتی ہے
 شوقِ حوا کی مدارت چلی جاتی ہے
 کوششِ سرکشِ حالات چلی جاتی ہے
 رسمِ پادشاهی و دقات چلی جاتی ہے
 سفلی و اعلیٰ خیالات چلی جاتی ہے
 شہرتِ کشف و کبریات چلی جاتی ہے
 واصلِ جاناں کی یونہی بات چلی جاتی ہے

روشِ حسنِ مراعات چلی جاتی ہے
 اس جفا سے دیارے تمنا اب تک
 طر ہی جاتے ہیں پشیمانی غم کے اس اب
 ہم سے ہر چند وہ فدا ہر خطا میں لگن
 دن کو ہم ان سے بچتے ہیں کہ تکیہ ہم سے
 اس رسمِ گر کو رسمِ گریہ میں کہتے ہوتے
 نگہ یار سے پالیتے ہیں دل کی باتیں
 میرتِ حسن نے مجبور کی ہے حسرت

زحیرِ رشکِ پشیمانی بہت زبان تک
 تمہاری حکم نگاہی التماس سے زبان تک
 ترا شوقِ سلم ظالم خیال امتحان تک
 یہ شان کج ادا کی طبری جانِ ناقص تک

اثرِ سیرے تنہا فل پر قریبِ کلام ان تک
 ابھی دیکھی نہیں گت اخیانِ جوشِ تنہا کی
 مری مجبوریاں شوقِ جفا سے باز دھس گئی
 سجادے کی ندامتِ شیوہ قدر و فاقہ کو

بہ غرور دلربائی یقینِ دل سندی
 ترے عاشقوں کا دیکھے کوئی رنگِ سندی
 وہ ستم بھی گر کر ہے تو بے لطف ہو سندی
 کہ جہاں ہے مہرے دل کو مروتِ سندی
 مری مہتوں کی پستی کے شوق کی بزدلی

ترا نار بھول بیٹھا مری سب نیاز مندی
 نہ ہے اختیار تجھ پر نہ ہے اعتبارِ دل
 مجھے شکوہ جفا کی نہیں آئے پانیِ نوبت
 تری بزمِ نازِ ظالم ہے عجب ظلمِ حیرت
 غمِ آرزو کا حسرتِ بیکار کیا با عواص

اس شوخ پہ آتا ہے الزامِ پشیمانی
 جتنے ہیں بد خواری سننے ہیں آسانی
 واں لطف سے پیدل ہے اندازِ ستم رانی

کس درجہ پشیمال ہے تاثیرِ وفا میری
 دیکھ اے ستم جاناں یہ نقشِ محبت ہیں
 باں صبر میں ہے پناہ کیفیتِ مینائی

خیال یار میں بھی رنگ لہے یار پیدا ہے
ترس روئے دلار کے تصور کا یہ عالم تھا
مرے اصرار مضطر میں نہاں تھی مری یا بولی
مغا میری تجھ کل بے زبانی آشکارا تھی
یہ رنگین ماجرا سے عشق شیریں کا پیدا ہے
کہ چشم شوق میں اک حسن کا گلزار پیدا ہے
ترسے اقرار آسان سے ترا نکا پر پیدا ہے
ستم تیرا رنگ پریشاں اغیار پیدا ہے

عرض کرم ترک جفا بھی نہ کیجئے
اس بے وفا سے مصلحت شوق کی نہ ہی
منظور ہے جو ترک محبت ہی آپ کو
حسرت یہ کیا ستم ہے کہ اک بت گئے غشت میں
ایسا نہ ہو کہ آپ ملا بھی نہ کیجئے
اپنی ستم کشی کا گلزار بھی نہ کیجئے
غم پر اہجوم ناز و ادا بھی نہ کیجئے
تو گناہتا ہے یا خدا بھی نہ کیجئے

بھیر اسی لطف ستم گوش کا مشتاق و دل
تجھ میں کچھ بات لے ایسی جو کسی میں نالی
دل بیتاب جو قابو میں نہیں ہے حسرت
ہم نے جس لطف کو ہم رنگ جفا دیکھا ہے
لوں تو اوروں سے بھی دل سے لگا دیکھا ہے
تجھ شوق نے کیا جانے کیا یاد دیکھا ہے

یا جوش اضطراب کو ملام نہ جانے
واقف ہیں خوب آپ کی طرز جفا سے ہم
یا دل کو آستانے محبت نہ کیجئے
اظہار التعاف کی زحمت نہ کیجئے

ستم ہر جائے تہید کرم ایسا بھی ہوتا ہے
بھلا کوئی میں سب سچ و اہم حیرانیاں مری
جھٹلے یار کے فکروں نہ کر لے گنج نامکامی
وقار صبر کھو یا اگر یہ ہائے بے قراری نے
بہ عملے وفا کیوں شکوہ سچ جو ہے حسرت
محبت میں بتا اے ضبط غم ایسا بھی ہوتا ہے
تری تکلیف صحت ستم ایسا بھی ہوتا ہے
امید و یاس دونوں ہوں ہم ایسا بھی ہوتا ہے
کہیں لے اعتبار چشم غم ایسا بھی ہوتا ہے
دیار شوق میں لے محو غم ایسا بھی ہوتا ہے

گراں گزر گیا حرف آرزو اس طبع نازک
نغمہ زحمن کی تاثیر سے ڈر ہے مجھے حسرت
بجگا و شوق اس مفہوم زنجین کو ادا کر دے
کہیں ایسا نہ ہو یہ شوق کو کبھی خود غما کر دے

دل میں کیا کیا ہوس دید بڑھائی نہ گئی
مہم سے بوجھاد گئی نام و نشان بھی ان کا
رو بردوان کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی
جستجو کی کوئی تہید اٹھائی نہ گئی
سر گذشت شب بھراں بھی سنائی نہ گئی
دل کو تھا حوصلہ عرض تناسوا نہیں

دل آدروئے شوق کا اظہار نہ کر دے
ہشیار کہ اس پریشیم کی نوازش
ڈرتا ہے مگر یہ کہ وہ انکار نہ کر دے
عشاق ستم کش کہ ہوس کا رنہ کر دے
یہ ہم کہیں تجھ کو گنہ گار نہ کر دے
مرنا چکی کہیں مجھ کو یہ دشوار نہ کر دے
چمک حد بھی ہر اس شورش خاموش کی سر
یہ شکش غم تجھے بے کار نہ کر دے

شک انھیں مجھ پر کار دانی کا
تم جو کرتے تو ہم کو تھا کافی
کچھ ٹھکانا ہے بگمانی کا
اک اشارہ بھی ہربانی کا

حسن بے ہر کو پروئے تنہا کی ہو
کسرت حسن کی یہ شان نہ دیکھی نہ سنی
جب ہو ایسا تو علاج دل شیدا کیا ہو
برق لرزاں ہے کوئی محرم تماشا کیا ہو
بے نقابی یہ تر آجلوہ یکسا کیا ہو
ہم کو سمجھیں وہ ہوس کا تو بجا کیا ہو
ہم غرض مند کہاں مرتبہ عشق کہاں
بے رنگ جواب و صفحہ کہاں

تجدید لطف یار کی لذت میں کیا کہوں
ان کی نگاہ قہر کو ہم نے منا لیا
شکوے تمام شکر کے عنوان ہو گئے
پھر اس طبع کہ خود بھی وہ حیران ہو گئے

۱۰۸
 ناگوار ہے بہت تلخی، مگر اس لیکن
 یہ جو ایک دورِ محبت کی غلش ہے حسرت
 تم جو کہتے ہو گوارا تو گوارا ہے یہی
 مطلقہ دل ہے یہی جان تھا ہے یہی

بہت تلخی، بہت درد ہے دعا میری
 وہ دل کی آواز کی قریب ہے حسرت
 بخون ہے کہ نہ سن لے کہیں اور میری
 ہوئی ہے آرزو شوق رہنا میری

ان کو نہ کوئی سمجھے بیدار نہیں کرتے
 دینا جو ہو دوا آخر یہ ادا کیا تو
 ہم جو رکے ہو گریں فریاد نہیں کہتے
 انکار نہیں ہوتا ارشاد نہیں کرتے
 اس پر بھی کچھ ایسا ہے راضی ہیں ہم دونوں
 کر دقت بتاں حسرتِ ناحق نہ خود میں اپنا
 ہم شاد نہیں ہوئے، اتر یاد نہیں کرتے
 اس جنسِ محرمی کو بریاط نہیں کرتے

دل مایوس کو گردیدہ گنہگار کر لینا
 سکون یاس بھی ممکن نہیں اب ہم غریبوں کو
 وہ دن اب یاد آتے ہیں بہارِ حقیقت کی
 یہ کیا ایذا پہنچی ہے کہ حسرتِ عشقِ جاناں میں
 وہ ان کا ردِ انکار میں ادا کر لینا
 قیامت ہے غمی کا وعدہ دیدار کر لینا
 وہ میرا جب کو دامن کو بھی گنہگار کر لینا
 تجھے ہر عقدہ آساں کو بھی دشوار کر لینا

بیگانہ تفصیل میں لب ہائے شکایت
 فریادِ کورل کی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچے
 جب کہ ہوئی کشورِ حرام کی خبر بند
 گویا ہے دعاؤں پہری بابا شر بند

چھپ نہیں سکتی چھپانے سے محبت کی نظر
 گرچہ ہے پردہ انکار میں ہم کل عتاب
 پڑ ہی جاتی ہے رخسار پہ حسرت کی نظر
 پھر بھی ہے صاف نمایاں وہ اجازت کی نظر

عاشقِ دل نگار کو بے خود و بقرار کو
 محو تھائے یار کو، شوق بقائے کیا نگر

خار و در و دل ہو کیوں انکی جفا بول نہ کیا
عشق بھی مغضب ہو کیوں مجھ کو ٹھکانے کیا نہیں
خیرت ہے ہرست کو بنکے ہر ایک مست کو
پیر منداں کے دور میں خوف خطائے کی نہیں

جنونہ یار نہ چھپ جائے سر ہانک نہیں
آہ! کہتا وہ تو اپنا کئے مجھے گرم نظر
بلد سے حوصلہ دے دے مجھے تھام نہیں
یسی باتیں سنے ہو جواں میں نام نہیں

یلاکشان غم انتظار ہم بھی ہیں
دل ہوس جوشاد تری نظر کا سوا
خواب مجروحش سیل و نہاد ہم بھی ہیں
تو روح شوق، پیکاری آشکارا ہم بھی ہیں
اسی سے چھپتے ہیں تری سے جویاں ان کی نظر
لگاہ یار سے اظہار انتقامت ہوا
نشانہ ستم روزگار ہم بھی ہیں
نشانہ ستم روزگار ہم بھی ہیں

ہیت نادوم ہوئے آخر وہ میرے قتل لاحق
جلائے شوق کے آئینہ تصویر خاطر میں
ہوئی قدر و فاجب آشکارا آہستہ آہستہ
نمایاں ہو حیدار وئے نگار آہستہ آہستہ
نہ آئیں گے وہ حسرت انتظار شوق ہیں نہیں
نہ آئیں گے وہ حسرت انتظار شوق ہیں نہیں
اسٹھے گی پھر وہ چشم فتنہ کار آہستہ آہستہ
گزر جائیں گے ایام بہار آہستہ آہستہ

خیال یار جو مصروف کار ہوتا ہے
یہ ماجرا بھی ہے دنیائے عاشقی میں نیا
قرار بخش دل بے قرار ہوتا ہے
کہ نامراد یہاں کا مسگر ہوتا ہے

اس محنت نفاں کی جفا میرے لئے ہے
مقصود ہے آنا کہ رہے مجھ پر توجہ
صد شکر کہ آنا تو روایہ میرے لئے ہے
مخصوص یہ انداز جفا میرے لئے ہے

جنت کی ہوس ہوتو میں کافر کہ پریشان اس شوخ کی خوشبوئے قبا میرے لئے ہے

دام گیسو میں ترے اک دل ناشاد بھی ہے اسے مرے بھولنے والے مجھے کچھ یاد بھی ہے
کیسے کہدوں اسے بیگناہ افقت کہ وہ شوخ ظلم کرتا ہے مگر مانع فریاد بھی ہے
لطف ظاہر پہ کہیں اس کے نہ جانا حسرت کہ وہ عیار جفا جو ستم ایک باد بھی ہے

تری محفل سے ہم آئے مگر باحال نہ آئے تماشا کا میاب آیا تمنا بے قرار آئی
یہ کیا اندھیرے آئے دشمن اہل وفا تجھ سے ہوس نے کام جاں پایا محبت تیرا آئی

دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا کچھ بھی عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا
اک نظر بھی تری کافی تھی پئے راحت بجا کچھ بھی دشوار نہ تھا مجھ کو شک کیا کرنا
عاشقو حسن جفا کار کا رشک ہو ہے گنا تم خبردار، خبردار نہ ایسا کرنا
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرت ان سے لی کر بھی نہ اظہار تمنا کرنا

جان پر غم نے بھی الزام لگایا نہ انھیں یاس کو خوبی تقدیر سے منسوب کیا
سخت محروم ادب ہے دل حسرت اگر بے وفائی سے ترے جور کو منسوب کیا

نظر پھرنے کی اس پہ دل جین کا چھینا محبت کا یہ بھی ہے کوئی قرینا
وہ کیا قدر جانیں دل عاشقاں کی نہ عالم نہ فاصل نہ دانا نہ بینا
وہیں سے یہ آنسو رواں ہیں جو دل میں تمنا کا پوشیدہ ہے اک خرینا
یہ کیا قہر ہے ہم پر یارب کرے مئے گزر جائے سداں کا یوں ہی ہمینا
بہار آئی سب شادمان ہلی محکم یہ دن کیسے کاشیں گے بے جام و مینا

پانی ہے جگہ یا کئی دامن نظریں خوشبوئے حیا نے تری چادر نے نکل کر
کیا چیز تھی ساقی وہ پس پردہ مینا جو سخن پری بن محنتی ساغر سے نکل کر

چاہت ہی چاہت ہی نہیں آگے نزدیک کچھ میری حقیقت ہی نہیں آگے نزدیک
کچھ قدر تو کرتے مرے اظہار وفا کی شاید یہ محبت ہی نہیں آگے نزدیک
یوں غیر سے بے باک اشارے سر محفل کیا یہ مری ذلت ہی نہیں آگے نزدیک
دعشاق پر کچھ حد بھی مقرر ہے ستم کی یا اس کی نہایت ہی نہیں آگے نزدیک
اگلی سی نہ راتیں ہیں نہ گھٹائیں ہیں باتیں کیا اب میں وہ حسرت ہی نہیں آگے نزدیک

کچھ ایسی دور بھی تو نہیں منزل مراد لیکن یہ جبکہ چھوٹ چلیں کارواں سے ہم
اے یاد یار دیکھ کہ باوصفت رنج ہجر سرور ہیں تری خلش ناواں سے ہم
بے تابیوں سے چھپ نہ سکا حال آرزو آخر نے نہ اس نگہ بد نگماں سے ہم
یا یوں بھی تو کرتے نہیں تم زورہ ناز تنگ آ گئے ہیں مشکش استیاں سے ہم
ہے انتہائے یاس بھی اک البدائے شوق بھر آ گئے دیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

سبے چھتے ہیں چھپیں مجھ سے تو بردانہ کریں سیر گلشن وہ کریں شوق سے تہنا نہ کریں
اب تو آتا ہے ہی جی میں کہ اے عوج جفا کچھ بھی ہو جائے مگر تری عینا نہ کریں
میں ہوں مجبور تو مجبور تھی پریش ہے ضرور وہ میجا ہیں تو بیمار گو اچھا نہ کریں
درد دل اور نہ بڑھ جائے تسلی سے کہیں آپ اس کام کا زہنا را را دہ نہ کریں
شکوہ جو رتقا ضائع ہو م عرض وفا تم جو مل جاؤ کہیں ہم کو تو کیا کیا کریں
نور جاں کے لئے کیوں ہو کسی کا مل جلنا ہم تری صورت زیبا کا تماشا نہ کریں
حال نکل جائے گا بیتابی دہکا حسرت بار بار آپ انھیں شوق سے دیکھا نہ کریں

شوق جب حد سے گزر چکا تو ہوتا ہے یہی
دل وحشی کا کسی طرح تعاضا تو ملے

ور نہ ہم اور کرم یار کی پروا نہ کریں
کیا کریں اس کو جو آمادہ سودا نہ کریں

سنت رنجر کر دیا ہسم کو
مجھ سے بگڑے ہیں کہ تو نے یہ کیس
دل نے مجھ پر کر دیا ہسم کو
سب میں مشہور کر دیا ہسم کو
تم نے مغرور کر دیا ہسم کو
سزا بسر کر دیا ہسم کو

آج پھر اُس نے کیا وعدہ فرما دیکھو
حالِ دل سے تمہیں آگاہ کئے دیتے ہیں

وصل کی بات کا بن بن کے بجز نا بکھو
اب کبھی ہم کو خبر کیا تھی نہ لہنا دیکھو

رکھئے نہ مجھ پر ترک محبت کی تہمتیں
بیگانہ ادب کئے دیتی ہے کیا کروں

جس کا خیال تک بھی نہیں ہے رواجھے
اُس محونا زکی نگہ اشتبا مجھے

دل اور تہیہ ترک خیال یار کرے
تفس میں ہو دل لیل شہیدِ فرقت گل

کے یقین ہو کون اس پر اعتبار کرے
خزاں نے جو نہ کیا تھا وہ اب بہار کرے

ہجومِ شوق سے کہدو کہ اختصار کرے
شبِصال ہے کوتاہ ناز یارِ دراز

نہ میں شمار کر اوں نہ دل شمار کرے
فروں میں حد سے ترے جو بے حساب کداع

اُن کو جو شغلِ ناز سے فرصت نہ ہو سکی
خاموشیوں کا راز محبت وہ پا گئے

ہم نے یہ کہد یا کہ محبت نہ ہو سکی
گو ہم سے عرض حال کی جرات نہ ہو سکی

ہر بات میں اک شان ہے ساختہ پن کی
تصویر ہے تقریر تری حسن سخن کی

بڑھ جائے گی عزت گل و نسرين توں کی لائی ہے چین میں انھیں تقدیر چین کی

شکوہ غم ترے حضور کیا
در و دل کو تری تنہا نے
یہ بھی اک پھیرے کہ قدرت نے
اپ نے کیا کیا کہ حسرت سے
ہم نے بے شک بڑا قصور کیا
خوب سرمایہ سرور کیا
تم کو خود ہیں ہمیں غیور کیا
دلے حسن کا غرور کیا

سہ کار تھے، باصفا ہو گئے ہم
نہ جانا کہ شوق اور بھڑکے گا میرا
جب اُن سے ادب نے نہ کچھ منہ سے لگا
دم واپس آئے پرستش کو ناحق
ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم
وہ سمجھے کہ اس سے جدا ہو گئے ہم
تو اک پیکر التجا ہو گئے ہم
بس اب جاؤ غم سے خفا ہو گئے ہم

حسرت کشاں درد ہیں لب تشنگان عاشقی
منظور دلدار رہا لطف نہان دیراں
وہ ہم کہاں وہ دل کہاں البتہ تباہ کر
سیراب غم کردے کہیں پر مغاں عاشقی
مقصود رملو اتی رہی شان میان عاشقی
باقی ہے اک سوز نہاں اب تک نشان عاشقی

سعی احباب کو ناحق ہے رہائی کا خیال
رہ گیا جل کے تری بزم میں پروانہ جورات
اور ہی کچھ ہے تنہا ترے زندانی کی
کھینچ کھینچ شکل مری سوختہ سامانی کی

دے دے کے مفت جان شہیدانِ عشق نے
شوقِ نقائے یار نے راہ مراد میں
اس ناز میں کو شاید قاتل بنا دیا
سختی کو رشکِ نرمی منزل بنا دیا

سبے شوخی ہے اک ہیں سے جیا
اے فریب نگاہ یار یہ کیسا

اب وہ طے بھی ہیں تو یوں کہ کبھی
گلشنِ حسنِ یار کی حسرت
ہم سے کچھ واسطہ نہ تھا گویا
جانِ فراقِ کس قدر ہے آبِ وہا

آئی جان کی یاد مراد دل ٹھہر گیا
تیرنگہ یار کا مشکل ہے سامنا
دو عوی غمِ فراق کا باطل ٹھہر گیا
میرا ہی تھا جگر کہ مقابل ٹھہر گیا
یعنی میں التفات کے قابل ٹھہر گیا
حسرت وہ بادشاہ میں شامل ٹھہر گیا

مہے محو خواب ہوں اہلِ ظاہر
نہ سمجھا سوا حسن کے اور کوئی
گزر بھی گیا کاروانِ محبت
بیانِ تمنا، زبانِ محبت
ترا ناز ہے حکمرانِ محبت

چشمِ رنگین یار کو ہے پسند
صاف اقرار ہے محبت کا
سرخِ اشک عاشقان کی بہار
آپ کا التفات سے انکار
کون ہے رہ سکے گا جو ہشیار

لطف کی ان سے التجا نہ کریں
مل رہے گا جوان سے ملنا ہے
ہم نے ایسا کبھی کیا نہ کریں
اب کو شہِ منہ دعا نہ کریں
کیا کریں عاشقی میں کیا نہ کریں
لوگ میرے لئے دعا نہ کریں

باقی نہیں اک تار بھی دامن میں جو حسرت
اب اہل جنوں فکرِ گریباں میں لگے ہیں

نامرادوں کو شاد کام کرو کرم اپنا کبھی تو عمامہ کرو
 کار عافیت ہے ناتمام سو تم قتل کر کے اُسے تمام کرو
 عاشق، ہجر سے بہو بیزار غم جاناں کا احرام کرو
 پوچھتے ہیں وہ جان نثاروں کو تم بھی حسرت اٹھو سلام کرو

لاکھ اس شوق جفا کار سے پرہیز کرو شوق پھر بھی یہی کہتا ہے سب بھگن کرو
 فرق لائے نہ جگر سوزی مہیا میں بھاب منچو تم کو قسم ہے جو کچھ آمیز کرو

بجا ہے دل زار کی ماصوری کہاں تک اٹھائے کوئی رنج دوری
 وہ تہید ہی سے اڑا لیں گے مطلب کہیں شوق نے کی نہ جو بات پوری
 تمنا نے کی خوب نظر ارہ بازی مزہ دے گئی حسن کی بے شعوری

نظر اُس رخ پہ ہے لوب کے خلاف دل ہے اس فیصلے میں سب کے خلاف
 آج پر کیا وہ روز کرتے ہیں بے رنجی وعدہ ہے شے کے خلاف
 حسن جاناں کے عہد میں حسرت شوق ٹھیرا ہے ماو جب کے خلاف

چھپے گی تری دوستداری کہاں تک کرے گا دل انکار یاری کہاں تک
 کہیں رک بھی اے چشم خونبار آتش کہاں تک تری اشکباری کہاں تک
 کرے گی فقروں سے اے شاہ خریں بغافل تری شہریاری کہاں تک
 ہمیں حال دل عرض کرنے نہ دے گی بھلا ان سے بے اختیار کہاں تک
 تنہا کو اس حد پر رہنے نہ دے گی ترے حسن کی بے قراری کہاں تک
 کرو سیر دنیا کے حیرت بھی حسرت خرد مند یا وہوشیاری کہاں تک

آج قوم لب ساغرے بھڑائے میرا
سُن کے انکار مرا ہجر میں کیا کیا حسرت
ساقیا تجھ کو مری سستی یہاں کی قسم
ساغرے نے دلوائی لب جاناں کی قسم

سمجھنے کے اس دریا سجدے لاکھوں
اک بار چلے جاؤ دکھا کر تھلک اپنی
ہم عاشق بے خود ہیں گنہ گار کہاں ہیں
ہم جلوہٴ بہم کے طلب گار کہاں ہیں
عشق اُن سے یہ کہتا ہے توجہ نہیں تم کو
عقدے مرنے تک پہل ہیں دشوار کہاں ہیں

عشق اب ہے نہ عاشقی کی ہوس
غمچہ شوق ہے نسرودہ یاس
ہم ہیں اور دل سے بدلی کی ہوس
مٹ چکی سب شگفتگی کی ہوس
رہ نہ جائے ترے کفایت سے
کہیں جی ہی میں اپنے جی کی ہوس
عشق ہر خیز رام حسن ربا
پر نہ چھوٹی برابری کی ہوس
ہم بھی حاضر ہیں بندگی کے لئے
آپ کو ہوجھ صا جی کی ہوس

حسن جاناں سے یہ کہتا ہوا شہر عشق
فکر کو نین سے بیگانہ ہوا تو حسرت
دور پہنچا ہے مرنے نام سے افسانہ ترا
غلب غمرا غم جاناں سے یارانہ ترا

شوق کہاں آرزوئے شوق ہے
درجہ ترے عشق فنوں کا رکا
جس سے جہاں مست مئے ذوق ہے
حسن کے رتبے سے بھی فوق ہے

وفا تجھ سے اسے بے وفا چاہتا ہوں
تری آرزو ہے اگر جرم کوئی
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
تو اس جرم کی میں نمر چاہتا ہوں

گیسوئے دوست کی خوشبو جو دو عالم کی
آہ وہ نکمت برباد کہ برباد نہیں

بنے وہ رونق محفل جس انجن میں ہے
 رہے بہار چین ہو کے جس چین میں ہے
 زبے نصیب جو ہو میرے حال کو قہر نصیب
 وہ اتری جو زری زلفا پر شکں میں ہے
 ادب کہے یہ تھا تھا کہ تھے شوق کی بات
 سنے نہ کوئی مے دل میں یاد میں ہے
 جو فیض عشق یہی ہے تو کیا عجب حسرت
 کہ اکیلا نہ کچھ شیخ و برہن میں ہے

کہ نہ انکے ہر دم حال ہے کب تھا خوشی کب تھا
 جو کبھی اٹھا بھی اٹھا ہے تو اسی وقت گرا
 اثر قافل پارے شربت تار اجر میں فضا
 ہوئیں سوز غم کی یہ شریں کہ ان کے ہر دم
 پر عجیب و گریہ کے کئے حسن کا اجرا
 کہ اثر سے قوت عشق کے میں گرا تھا چرخ اٹھا
 میں ہر نہ بادہ رستہ ہو کہ ہوا جو یکے سے گزر
 اپنے خیر مقدم دھرے میں تو دھرے سے گزر
 کوئی عشق بازی کا شغل نہیں تھیں بے عمل مبتلا
 گرا ب کیا ہے یہ حوصلہ تو خوشی سے ناز تھا
 یہ نہر کہاں یہ جزا ہوئی جتنا خواہش مٹی
 پئے قتل حسرت طبعی خود آروہ جان اٹھا

تو ہی یاد بے اختیار آ رہی ہے

تنا کی فصل بہار آ رہی ہے

اس نے ہم سے سنی نہ شوق کی بات

ہنس کے پوچھا یہ کس زبان میں ہے

حسن تیرا بہ امتزاج و ف

اک نمونہ تھا بے مثالی کا
 ب حسرت کی بے سواہی کا

بہر باں ہو کے پاس کچھ نہ کرو

بے تاب نظر آیا بدنام نظر آیا

عاشق جو نظر آیا ناکام نظر آیا
 پہلے سے بھی وہ بڑھ کر خود کا م نظر آیا

لے آہ دل عاشق دیکھیں تری تاثیر میں

سکھا دی ہیں نرالی شرفیاں کچھ لطف جاننے

مے دست تنا کی شرارت بڑھی جاتی ہے

بھال یا زمین ہر دم ترقی ہوتی ہے
دل چیران کی جس سے سادہ دیت ہوتی ہے

پھینا بیت دست ثرق نے مجھے غنہ ہے
گویا کہ اپنے دل پر مجھے اختیار ہے
شاید جہاں سے منتر کے دیرا چلا گیا
یاں ہاں جہی تو چشم جنوں اٹھیا ہے

کرتا ہے دل نواور بھی آگاہ ہوس
تیرا یہ بے جی یہ اذا اجتناب کی
کچھ ان کہ قدر شوق نہیں دور نہ آرزو
میدوار تھی کرم بے سبب کی

قیمت سے کہ بہ پیانہ جاں ہے ساقی
کون کہتا ہے کہ یہ رخ گراں ہے ساقی
تو نے رکھ دی تھی جہاں چھینچ ہم کو توں
روح مستی اسی جانب گراں ہے ساقی
مکتب کی نہ سنی ہے : سے گاحہ آہستہ
کہ وہ سے خوار تر از مرتبہ داں ہے ساقی

حسرت وہ سن رہے ہیں جو اہل وفا کا حال
اں میں بھی کچھ غریب تری داستان کے ہیں

شوق کو جرم سے بری نہ کیا
تم نے کچھ پاس دلبری نہ کیا
خام تھی اپنی بندگی کہ انھیں
ہاں بندہ پروری نہ کیا
زہد کو مروت کو حق نے اسے
سر فراز قلندر ی نہ کیا
عشق صادق نے حسن کا لے
نہ سنا ذکر برتری نہ کیا
شکوہ بخ اُن سے کیوں اُن سے حسرت
احترام ستم گری نہ کیا

جگر مراد آبادی

ہم انہی پر پڑے ہونے اختیار آجی گیا
 اے یہ حسن تصور کا قریب رہنے کو
 یاق ہی دے دی جگر نے کج پائے یار پر
 دل کچھو ان صحرے کے گرد ان تو سیار آجی گیا
 میا یہ کچھو، جیسے وہ جان بھائی گیا
 عمر بھری بے قراری کو قرار آجی گیا

عشق
 لیا اسی کو کہتے ہیں ربط و قبط من و تو
 رنگ و بو کے پردے ہیں کون بھونٹ نکلا
 عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ محبت نہیں ہتی
 تو جگر جو رسوا ہے قریب آہ رسوا رہ
 شوق نارسا اپنا ناز کا سیلاب ان کا
 چھپ کا چھپانے سے کیا کہیں شایان کا
 ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشہ نقاب ان کا
 نام تو ذکر رسوا خانوں خواب ان کا

ہجوم تجسلی سے معذور ہو کر
 مجھی میں رہے، مجھ سے مستور ہو کر
 ترے حسن مفرد سے نسبتیں ہیں
 نظر رہ گئی شعاع طور ہو کر
 بہت پس پٹیلے بہت دو ہو کر
 کہیں ہم نہ رہ جائیں مغرور ہو کر

اب ان کا کیا بھروسہ وہ آئیں یا نہ آئیں
 اس سے بھی شوخ تر ہیں اس شوخ کی ادائیں
 ان حسن برق و اش کے دل بوخت وہی ہیں
 عاشق، خواب سستی، ازاں خواب، لیکس
 اک جام کو خری تو پینا ہے اور ساقی!
 آلودہ خاک ہی میں لینے دے اگر ناصح
 اشعار بن کے نکلیں جو سینہ بھر سے
 آئے غم محبت تھم کو گلے نکالیں
 کر جائیں کام اپنا، لیکن نظر نہ آئیں
 شعلوں سے بھی جو صلیں، امن کو بھی کاش
 وہ بھی ترے کرشمے، بھی تری ادائیں
 اب بہت شوق کہنے لایا بالکل لڑکھائی
 داس اگر جھنگ دون جلوے کہاں پائیں
 سب، حسن یار کی عین بسا خندہ ادائیں

کرم کو شیاں ہیں، ستم کاریاں ہیں بس، اک دل کی خاطر تیاریاں ہیں
 نہ بے ہوشیاں اب نہ کشیاں ہیں صحت کی، تھنہا فصل سکاریاں ہیں
 تجلی سے کہہ دو، ذرا ہاتھ روکے بہت عام اب دل کی بیماریاں ہیں

نیاز و ناز کے چھڑے سناے جاتے ہیں، سو آن میں اور وہ ہم میں سناے جاتے ہیں
 یہ ناز میں تو دیکھو کہ دل کو تڑپا کر نظر اٹاتے تھیں، سکر آئے جاتے ہیں
 میں اپنی آنکھ سے کہ میری آہ میں بھی تری نگاہ تھے انداز پائے جاتے ہیں

ملتی ہے عمر اب عشق کے مے خانے میں، اے اجل تو بھی سما جا مے پیانے میں
 ہم کہیں آتے ہیں اجڑا تے بہکانے میں اسی میخانے کی منی اسی مے خانے میں

ا کہ تجھ بن اس طرح لے دوست گھبراتا ہیں جیسے بریلے میں کسی نسلے کی کمی پاتا ہوں
 میری ہستی شوق پیہم میری فطرت اضطراب کوئی منزل ہو نگر گدرا جلاتا ہوں میں
 میری خاطر اب وہ تکلیف تجلی کیوں کریں اپنی گرد شوق میں خود ہی جھپاتا ہوں میں
 دیکھنا اس عشق کی یہ طرفہ کاری دیکھنا وہ جفا کرتے ہیں مجھ پر اور شر ماتا ہوں میں
 ایک دل ہے اور طوفان حوادث، لے جگو ایک شیشہ ہے کہ ہر تھیرے مھراتا ہوں میں

الہی ایک دعا ہے، اگر قبول نہ ہو بہت غریب یہ دل ہے کبھی طول نہ ہو
 تجھے بھی شاق نہ ہو شوق بھی طول نہ ہو نظر قبول ہوئی ہے، اثر قبول نہ ہو
 کوئی گناہ نہیں شوق دید و ذوق نظر منکر جو فرصت نظارگی کو طول نہ ہو

مجھے دے رہے ہیں تسلیاں، وہ ہر ایک تازہ پیام سے
 کبھی آکے منظر عام پر، کبھی ہٹ کے منظر عام سے

تری چشم مست کو کیا کہوں، کہ نظرِ نظر ہے فوں فوں
 یہ تمام جوشش، یہ سب جنوں، اسی ایک گردشِ عالم سے
 یہ کتابِ دل کی ہیں آیتیں، میں بتاؤں کیا، جو ہیں سبتیں
 مرے سجدہ ہائے دوام کو، ترے نقشِ ہائے خروام سے
 وہیں چشمِ حور، پھٹک اگئی، ابھی پانی نہ تھی کہ بہک گئی
 وہ کبھی یک بہ یک جو پھلک گئی، کبھی رندست کے جام سے

ہلاکے آنکھ نہ محروم تازہ رہنے دے
 میں اپنی جان تو قربان کر چکوں تجھ پر
 تجھے سے تیغِ ادا کو جدا نہ کر قاتل
 یہ تیرا زہن ہے تو شوق سے چلائے جا
 بجھانہ آتشِ پہاں کرم کے پھینٹوں سے
 تجھے قسم جو مجھے پاکِ زرت نے دے
 یہ چشمِ مست، ابھی نیم باز رہنے دے
 ابھی یہ منظرِ راز و نیاز رہنے دے
 خیالِ خاطرِ اہلِ نیاز رہنے دے
 دل جگر کو مجسم نگہا رہنے دے

مجھے ہلاک فریبِ مجاز رہنے دے
 میں رازِ عشق کو بیگ نہ پہاں رکھوں
 یہ بات کیا، کہ حقیقتِ وی مجاز وہی
 یہ خانقاہ نہیں پی بھی جا، اے زاہد
 گذرتی ہے جو دلِ محنت پر نہ پوچھ جگر
 نہ چھپرہ اونچا امتیاز رہنے دے
 مگر جو مصلحتِ حسنِ ماز رہنے دے
 مجاز ہے تو پھر اس کو مجاز رہنے دے
 یہ منکدہ ہے، یہاں احتراز رہنے دے
 یہ خاصِ رازِ محبت ہے راز رہنے دے

حال بھی، ماورائے حال بھی ہے
 دل کے ہر اضطرابِ نازک میں
 چھائے جاتے ہیں دردِ دل بن کر
 خن کے ہر جمال میں پہاں
 عشق، ممکن بھی ہے، محال بھی ہے
 شانِ بے تاباںِ جمال بھی ہے
 اُس پہ تاکیدِ ضبطِ حال بھی ہے
 میری رعنائیِ خیمال بھی ہے

تصور کیجئے اسوں اک حسن شعور نہ کی
جاگ تباہی تلخ کو حاجت نہیں ملوگی

کسے سے مقابل جس کو جو نہ تم نکلیں
میں شکستگی ہی اسے شکستگی سے

علم کی بھی ہو تو عرض مٹا نہ کیجئے
کیا کیجئے ، پھر تیری تسنا نہ کیجئے

دلانی خیال کو در سوا نہ کیجئے
ہر نہ ہے بے خود اس عورت نگاہ

دہن کو سی بھی جو بیٹے نظر کو کیا کرتے
کبھی ادھی نہ ہوتی ، اگر قصا کرتے

یہ کیا مجال کہ ہم ترک التجا کرتے
غماز عشق یہاں ہے نفس نفس جاری

کچھ اوجھ سے بھی تقاضائے نظر ہوتا
تو وہ تالے ہی نہ کر جن میں اثر ہوتا ہے

میں گنگو گار جنوں میں نے یہ مانا ، لیکن
کون دیکھے اسے میرا بے حشر ہے دل

کہ جیسے اسباب نازک سے کچھ ارشاد ہوتا
ساتا جا رہا ہے جس کو عقبا یاد ہوتا ہے

تصور میں ہے کچھ ایسا اتری تصویر کا عالم
کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی

ذوبے ہیں ہم جہاں پر ابھریں گے پھر ہیں سے
ظاہر تو ہر جگہ ہے ثابت نہیں نہیں سے

یہ راز من رہے ہیں ملک موج نوش سے
خون و قاتل یسبل جرم نگاہ قاتل

مانا کہ چشم شوق بہت بے حجاب ہے
دل ماننا نہیں کہ نظر کا میاں ہے

لے حسن اپنی حوصلہ افزائیاں تو دیکھ
وہ لاکھ سامنے ہوں مگر اس کا کیا علاج

سجدہ وہی سجدہ ہے کہ جوشنگ میں ہے
اوس اس پر یہ پردہ ہے کہ پردہ ہی نہیں ہے

زاہد مگر اس رمز سے آگاہ نہیں ہے
جس رنگ میں دیکھو اُسے وہ پردہ نہیں ہے

جہ سے کوئی بوجھ ترے لئے نہ کرے، اسی
برخیزے نیا عبودہ نئی آن، نئی آستازان
نہ دیکھو کیا بستی ہے، کہ ممکن ہو نہیں سکتا
یہ مریکہ نگہ شوئی بھی تو کیا پہنچ سکیں جاہ

یہ کیا کیا کہ خطا کر کے عشق، لا محدود
جمالِ حسن کی ہلکی سی ہلر دڑا کر
نفسِ نفس کو سہ جگہ دیا تو سنے
اُس ایک درد و پھر زلزلہ بنادیا تو سنے
نہرا سکون ہوا آگاہ گدا، یا تو سنے
خوشامدہ دردِ محبت، زہے دردِ دل کہ جسے

وہ کافر آستنا ناک آستنا یوں بھی ہے اور یوں بھی
انارکلیا آستنا آستنا یوں بھی ہے اور یوں بھی
بغیب کیا؟ اگر رسم و عادیوں بھی ہے اور یوں بھی
کہ حسن و عشق کا ہر مسئلہ یوں بھی ہے اور یوں بھی
لگا دے آگ، اور برقِ تجلی، اُدیکھتی کیسا ہے
نگاہ، شوق، ظالم، نارسائیوں بھی ہے اور یوں بھی
الہی کس طرح عقل و جنوں کو ایک جا کر لیں
کہ منشاے نگاہِ عشوہ زایوں بھی ہے اور یوں بھی

ترے جمالِ حقیقت کی تاب ہی نہ ہوئی
ہم اپنی رندی طاعت پہ خاکِ باز گریا
قبولِ حضرتِ سلطانِ جوتی ہوئی نہ ہوئی
اس اہتمام یہ بھی شمعِ عاشقی نہ ہوئی
گئے ہو جب آئے یہاں صبح و شام نئی ہوئی
صبحا یہ ان سے ہمارا پیام کہہ دینا

آئے دباں پہ لا محبتِ حال ہے
تم سے مجھے عزیز، تمہارا خیال ہے

۴۲۴
دل تھا دے خیال سے پہلے چین چین اب بھی روشِ اردش ہے مگر پاؤں پاؤں

ایمان و کفر اور نہ دنیا و دین رہے اس عشق کی تلافیٰ مافاست دیکھنا
اس شہری چشمِ یار کی معجز بیانیال
اے عشق! شاد باش کہ تہا ہنس رہے ہر اک کو ہے گماں کہ غلط بھی ہے
رونے کی حسرتیں ہیں جب کہ نہ ہنس رہے

عشق کا راز جنوں عشق کی حد ہی ہے
دستاںِ غم ہستی کو مکمل کرتے
دل گیا ہے تو گریبان نہ جانے پائے
ایک بھی عشق کا عنوان نہ جانے پائے
حسن سرگرم نوازش ہے مگر غمِ دل
رائگاں عشق کا احسان نہ جانے پائے

یہ عشق نہیں آساں، اتنا ہی سمجھ لیجئے
ہم عشق تجسم ہیں لبِ تشہ و مستقی
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جا رہے
دریا سے طلب کیسی؟ دریا کو رلاتا ہے
بندہ جائے سو موتی ہے وہ جائے تو دانا ہے
آنسو تو بہت لے ہیں آنکھوں میں جگر لکین

ادا جو آئے، وہ بے عیب بے قصور آئے
الہی، جذبِ محبت کی بخش ہے تقصیر
خدا وہ دن زکریاؑ آپ کو غور آئے
وہ آج دستِ بد دل سخت تا صبر آئے
کہیں جو راہِ طلب میں مقامِ طور آئے
مری طرف سے بھی لے کاہِ دانِ شوقِ سلام

کریے نہ کام جو لبس کا نالہ خوئیں
نہ غنچے فیندے سے چوکیں نہ رنگِ دبو آئے

دل دھڑکتے ہی پھر گئی وہ نظر
اُن کے پہلائے بھی نہ پہلا دل
لب تک آئی نہ تھی کہ بات سچی
رائگاں سچی التفات گئی

مرگ عاشق تو کچھ نہیں لیکن ^{۴۲۵} ایک میحانفس کو بات گئی

نقابِ رُفے نادیدہ کا از خود دور ہو جانا
محبت کیا ہے؟ تاثرِ محبت کس کو کہتے ہیں
مبارک اپنے ہاتھوں حسن کو مجبور ہو جانا
ترا مجبور کر دینا، مرا مجبور ہو جانا

بہارِ لالہ و گل، اشقیٰ برق و شر ہو کر
بھرم کھونا کہیں ہے دلِ ابنِ عشقِ معتبر ہو کر
وہ آئے سامنے، لیکن تجا بات نظر ہو کر
گزر جا، ہاں گزر جا جس سے بھی بے خبر ہو کر
جواب اندو حجابِ جلوہ اندازِ جلوہ کیا کہنے
کہاں جاتی ہے دل کو نگاہِ نازِ بے پروا
مرے پہلو میں رہ جا لذتِ دردِ جگر ہو کر

دل کو کسی کا تالے فرماں بنائے
درماں کو دردِ درد کو درماں بنائے
دشواری حیات کو آسان بنائے
جس طمع چاہیے، مجھے حیرن بنائے
آباد اگر نہ دل ہو، تو برباد کیجیے
گلشنِ نہ بن سکے، تو بیا بان بنائے

پھر عشقِ جنوں پیشہ، یوں سلسلہ جنیاں ہے
مدحتی ترے ہونٹوں کے رنگینی و رعنائی
راہیں بھی گر زراں ہیں، منزل بھی گر زراں ہے
اک موجِ تبسم میں کلِ رازِ گلستاں ہے
اشد تجھے رکھے محفوظِ حوادث سے
لے کفرِ اترے دم تک آرائشِ ایمان ہے

ہر ذرے کے پیکر میں اک لوحِ وفا دانی
ہستی جسے کہتے ہیں اک سادہ حقیقت ہے
اپنی ہی سی گلِ دنیا عاشق نے بنا ڈالی
رنگین نگاہوں نے رنگین بنا ڈالی

نظرِ صیاد کی کیا؟ برق بھی ہو تو لرز اٹھے
تماشا دیدنی ہے دیکھ لیں اہل نظر اگر
ابھی آیا نہیں تنکوں کو جانِ آسان ہونا
مرے ہمراہ منزل کا بھی گرد کا دان ہونا

سنا ہر حرف لٹے ہیں جلوہ حسنِ صورت کے
کبھی تم بھی جگرا آواز کوئے بتاں ہوں

چھوڑا نہ راز کوئی ابھانِ خراب کا
رب کہہ گیا میں خواب میں نہا بہ خراب کا
بگڑا ہو چہ رنگ جہانِ زراب کا
بھڑوں نظر میں حسنِ کسی کے نہا بہ خراب کا

عشق کیا چیز ہے؟ اک حشرِ رز آغوشِ خیال
سن کیا ہے خواب ہے اک چشمِ شاشی کا

اثر ہے جس میں کہ ہر موج کا رفرما کا
وہ ایک قطرہ ہے حاصلِ تمام دیا کا

زنجبیلی الم میں دیکھا ہے جن کو اکثر
آساں نہیں گزرنا صحرائے بے خودی
اے دل! وہی تو جلوے سرائے نظر ہیں
ہشیار ہاں تکیوں پرستے یہ پر خطر ہیں

سمجھائے کون؟ بلبلِ غفلتِ شعار کو
عصیاں کی بھی نہ ہوئی تخیلِ محمہ سے کہ
مہرِ کار باہوں آتشِ عصیاں ہر اک است
مہرِ دہ کر لیا ہے چین تک بہار کو
کیا نہ دکھاؤں رحمت پروردگار کو
پھیلا رہا ہوں رحمت پروردگار کو

سیکھ رہا ہوں کہ باقی نہ رہی قید سکاں
غیر از دوست نہ تھا ہستی عاشق کا وجود
آج اک موج جہاں لے گئی نے خلتے کو
کم نگاہی نے دیا طول اس افسانے کو

گوشِ شاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ
سن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی سا رہے

ان کی نگاہِ عطف سے اور کشفِ از دلبری
میری نگاہِ شوق ہے اور داتا عاشقی

شوق سے ہے ہر رگ جاں جست میں لے اڑے گی بٹے پیرا بن کہاں

عشق ہی سہی مری عشق ہی حاصل میرا
اور آجائے نہ زندانی دشت کوئی
ہی منزل ہے یہی جادو منزل میرا
ہے جنوں غیر بہت شور سلاسل میرا
داستان ان کی اداؤں کی ہے گزین گزین
اس میں کچھ نہ تنا بھی ہے شامل میرا

مستی میں فروغ رخ جانان نہیں دیکھا
زاہد نے مرا حاصل ایماں نہیں دیکھا
سختے ہیں بہار آئی گلستان نہیں دیکھا
رخ پر تیری زلفوں کو ریشاں نہیں دیکھا
فتنوں نے چراگوشہ داماں نہیں دیکھا
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستان نہیں دیکھا
کچھ ہوش جو آیا لوگ ریاں نہیں دیکھا
کیا کیا ہوا ہنگام جنوں یہ نہیں معلوم

رخ رنگین یہ موجیں ہیں قسم ہائے پہنا کی
حقیقت کھول دیا میں جنوں کے راز پہنا کی
شعاعیں کیا ہیں رنگت بھڑائی گلستاں کی
قسم دے دی ہے لیکن قسم نے چاک گریباں کی

پیش جو شوق میں تھی وصل میں بھی ہے وہی مجھ کو
جنم میں بھی وہی اک آگ ہے جو تھی نشیمین میں
مری دشت پر بحث آرائیاں اچھی نہیں ناصح !
بہت سے باندہ رکھے ہیں گریباں میں نے دامن میں

عشوؤں کی ہے نہ اس ننگہ فتنہ زاکہی ہے
ستا نہ کر رہا ہوں وہ عافیتی کوٹھے
ساری خطا مرے دل غور رش ادا کی ہے
کچھ ابتدا کی ہے نہ خیر انتہا کی ہے
جہنم رگ بہار میں موج فنا کی ہے
کھلتے ہی پھول بارغ میں پژمردہ ہو چلے

ہم خستگانِ راہ کو راحت کہاں نصیب
آواز کاں میں ایسی بانگِ دہاکی ہے
ڈویا ہوا سکوت میں ہے جوشِ آرزو
اب تو یہی زبانِ مرثیہ ہاکی ہے
لطفِ بہانِ یار کا مشکل ہے امتیاز
زحمت چڑھی ہوئی ستم بر ملائی ہے

جلوہ زکین اُتر آیا نگاہِ شوق میں
ہم لطافتِ جسم کی اسے سیم تن دیکھا کئے
بیل و گل میں جو گزری ہم کو اس کے کیا غرض
ہم کو گلشن میں فسط زنگ جس دیکھا کئے
دوڑتے پھرتے تھے جلوہ ان کے بوجِ نور
دور سے ہم راہِ شمعِ انجمن دیکھا کئے

ہر اک جگہ سی برقِ نگاہِ دوڑ گئی
غرض یہ ہے کہ کسی چیز کو قرار نہ ہو
یہ دیکھنا ہوں ترے زیرِ ب جستم کو
کہ بحرِ حسن کی اک موج بے قرار نہ ہو
ذرا سے پردہ محفل کی کیا حقیقت تھی
خبا رقیس کہیں خود ہی پردہ دار نہ ہو

مستی سے ترا جلوہ خودِ محض تماشا ہے
آشفۃِ مزاجوں کا یہ کیفِ نغمہ دیکھا
ماں و ادایِ امین کے معلوم ہیں سب قصے
موسیٰ نے فقط اپنا اک ذوق نظر دیکھا

سوارِ جلا ہے تو یہ سوارِ بنا ہے
ہم سوختہ جانوں کا شمع بھی جلا ہے
سننا ہوں بڑے غور سے افسانہِ ہستی
کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ مزل واد ہے

یہ بھی فریب ہے کچھ دردِ عاشقی کے
ہم مر کے کیا کریں گے کیا کو لیا ہے جی کے

ترے جلوؤں کے آگے بہت شرح و بیان کھی
زبان بے نگہ رکھ دی نگاہ بے زبان کھی
مٹی جاتی تھی بیلِ جلوہ گلہائے زنجیں پر
چھپا کر گس نے ان بردوں میں برقِ آبی کھی
نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا نے و اعظا داد لھا
ہزاروں بن گئے کیسے جیس میں نے جہاں کھی

نفس کی یاد میں یہ اضطرابِ دل مہا زادِ کدہ میں نے لکھ کر کیا ایک شاخِ آشیاں بچھائی

موجِ نسیم صبح کے قربانِ بابائے
کیا مستیِ رازِ عشق میں تیرے جوشِ بہار سے
آن پہ لولہ رنقِ سنہرے لہجے
پر شاخِ گل ہے لاق میں سناغر کے ہونے
رنگِ رنگ میں روڑی پھرتی ہے کشتِ شمشاد

نہ زینہ نہ یہ ساغر نہ یہ پیمانہ بستے
پرتوِ رخ کے کرتے تھے سہرا گزشتہ
جانِ نہ پھانسی گرسہر ہمتا نہ پہننے
دور سے بدخاکِ ستا لے وہ صحنہ صابنے
چاہے وہ شمع بنے یا ہے وہ پروانہ بنے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی نیکانہ بنے

گم کر دیا ہے دیدے یوں سرسبز جگہ
ہیں کہ جگہ سے کا جسے راز ہو سیم
مٹی ہے اب انھیں کے کچھ اپنی خبر مجھے
ان عزم میں کوئی نہ کیا نظر مجھے
مستِ شباب وہ ہیں میں پر شاخِ عشق ہوں
جب اصل اس بیاڑ و حقیقت کی ایک ہے
نیری خبر انہیں ہے نہ انکی خبر مجھے
بھڑکوں پھر رہے ہیں ادھر سے ادھر مجھے

سرکِ شوق کا وہ ایک قطرہ ناچیز
بہت لطیف اشائے تجھے چشمِ ساقی کے
اچھانا تھا کہ اک بحر بے کنار ہوا
نہ میں ہوا کبھی نہ خود نہ ہوشیار ہوا
لئے پھری کچھ شوقِ ساسے عالم میں
مری نگاہوں نے جھک جھک کر لائے مجھے

ذوقِ سرستی کو محرومے جانانِ کر دیا
کچھ نہ ہم سے ہو سکا اس اضطرابِ عشق میں
کفر کو اس طرح چمکایا کہ ایمان کر دیا
امن کے دامن کو ستر دینا گریباں کر دیا

شورش دل جو وہ ہوتی تھی بتو آج
 نہیں معلوم دہزدہ ایک ہے یا دور کی آج
 فصل گل جوش ہو اطلعت زینا بہار
 عرض دیدار پر یک چوہہ مستور ہے آج
 نہیں معلوم بیان دار و رس ہے کہ نہیں
 غون میں گرجی ہنگامہ حضور ہے آج
 جس سے گل چوکے دل بیابان کا آفتاب
 اسی شعلہ کو جریجھا لڑ سحر ہے آج

آنکھوں میں تیری نرم تماشا لئے ہوئے
 جنت میں بھی ہوں جنت دنیا لئے ہوئے
 پاس اب میں جوش تنہا لئے ہوئے
 میں بھی ہوں اک حباب مٹنے پائے ہوئے
 ہے آرزو کہ آئے حیات ہزار بار
 فقہ طرازی قدر عسائے ہوئے
 فوری حسن اور تجلی سے یہ مگر نہ
 میں خاک اور ذوق تماشا لئے ہوئے
 افتادگان عشق نے سراب تو رکھ دیا
 انھیں گئے بھی تو نقش کت پائے ہوئے
 جوش جنوں میں چھوٹ گیا آستان یار
 روتے ہیں منہ پر دامن صحرائے ہوئے

بے محابا ہو اگر حق تو وہ بات کہاں
 چھپ کے جس شان سے ہوتا ہے نمایاں کوئی
 کیا کرے زاہد بیچارہ اسے کیا معلوم
 رحم کرتا ہے بر اندازہ عصیاں کوئی

پردہ حرام میں آخر کون ہے اکے ہوا
 لے خوشا در سے کہ نزدیکی بھی یاد دہی ہے
 حسرت ناکام میری کام سے فاعل نہیں
 اک طریق جستجو یہ درد ہجوری بھی ہے
 میں تو ان مجوہوں پر بھی برآید ہو
 اس کے جلوے کی آواک شان ستوری بھی ہے
 میری محرومی کے اندر سے یہ کیسی ہے خدا
 قرب کی راہوں میں میری آہ اکہ موری بھی ہے

لذت سجدہ ہائے شوق نہ پوچھ
 دیکھ رعنائی حقیقت کو
 ہائے وہ اتصال ناز و نیا د
 عشق نے بھر دیا ہے رنگ مجاز

آہوں نے میری خرم ہستی جلادیا
نیرنگی جمال کے قربان جانیئے
کیا منہ دکھاؤں گا تری برق نظر کو میں
حیراں ہوں کچھ دیکھ کے اپنی نظر کو میں

پیرے مذاق شوق کا اس میں ہر رنگ
اس جو بخار حسن سے سیراب ہے فضا
میں خود کو دکھتا ہوں کہ نقہ یہ یار کو
رو کو نہ اپنی نغمہ شمس ستار کو
یہ اور نے اڑی مرے مشت خبار کو
تھی بونے دوست مریح نسیم سحر کے ساتھ

نہ کچھ فنا کی خبر ہے دے بقا معلوم
ہجوم شوق میں کیا کہوں میں کیا کہوں
بس ایک بے خبری ہے سو وہ بھی کیا معلوم
مجھے تو خود بھی نہیں ایسا مدعا معلوم
وگر نہ عشوہ طرازی نقش پا معلوم
جسین شوق کی شوریدگی تو کیا کہیئے

ہم ایک بار جلوہ جانا نہ دیکھتے
گر نہ وہ جھوم جھوم کے زندان مست کا
پھر کعبہ دیکھتے نہ صنم خانہ دیکھتے
پھر پائے ہم یہ سجدہ اشکرانہ دیکھتے
تم بھاڑ کر قوسینہ پروانہ دیکھتے
اک شعلہ اور شمع سے بڑھ کر ہے نص میں

شاید کہ پیام آیا پھر وادی سنا سے
اسرار حقیقت کو اک اک سے پوچھا ہے
شعلے سے لپکتے ہیں کچھ کسوٹینا سے
ہر نقہ رنگیں سے ہر شاہد زیبا سے
لہریں سی جو اٹھی ہیں کچھ چشم تنہا سے
سوحن کروں پیدا ایک آیت آفتاب سے
وہ عشق کی غلطی سے شاید نہیں واقف ہیں
وہ رہ کے چمکتی ہے وہ برق نسیم بھی

دہریں سے عشق نے بھی شوریں اڑائی ہیں
کنشش نہ جام نگارین کی پوچھ لے باقی
جہاں سے تونے لے خندہ ہائے زیر لبی
جھلک رہا ہے مرا آب رنگ تشہ لہری

بدلت ہوئی کہ چشمِ تحمیر کو ہے ملکوت
سارا حصولِ عشق کی آنا کامیوں میں ہے
اب جنیشِ نظر میں کوئی داستان نہیں
جو عمرِ رائیگاں ہے وہی رائیگاں نہیں
لیکن ہنوز ختمِ میری داستان نہیں
مجھ کو دماغِ صمیمت رو جانیاں نہیں
فطرتِ سارہی ہے اندل سے اسی طرح
اب اس نگاہِ ناز سے ربطِ لطیفیت ہے

بکرا فیضِ بخشیاں ہیں رخِ بے نقاب کی
طاقت کہاں شاہدہ بے حجاب کی
فروں میں روحِ دورِ محی آفتاب کی
مجھ کو تو پھونک دیگی تجلیِ نقاب کی
مستوں نے اور راہِ نکالی تو اب کی
تھی ہر عمل میں دعویٰ ہستی کی معصیت

یہ عشق نے دیکھا ہے یہ عقل سے پہنا ہے
ہے عشق کی شورش سے رعنائی و زبانی
قطرہ میں سمندر ہے ذرہ میں سیلاب ہے
جو خون اچھلتا ہے وہ رنگِ گلستاں ہے
حس نے مجھے دیکھا ہے وہ دیدِ حیران ہے
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے
آسمانِ تراداسن ہاتھوں میں مرے آیا

نیزنگ تماشا وہ جلوہ تپتا ہے
لے پردہ شیشِ ضد ہے کیا چشمِ متکا کو
آنکھوں سے اگر دیکھو پروانِ نظر آتا ہے
تو دفترِ گل میں بھی رسوا نظر آتا ہے
پھر داغِ کوئی دل میں تازہ نظر آتا ہے

جانِ نشاطِ حسن کی دنیا کہیں جسے
اس جلوہ گاہِ حسن میں چھایا ہے ہر طرف
جنت ہے ایک خونِ تما نہیں جسے
ایسا حجابِ چشمِ تماشا کہیں جسے
برقِ فضا کے والدی سینا کہیں جسے
میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے
ایسا سکوت ہے کہ تقاضا کہیں جسے
میری نقانِ درد پہ اس سدا و ناز کو

سرستیدوں میں شیشے کے گاہے میں
اتنا اچھال دیں کہ ثریا کہیں جسے
اصغر نہ کہ ناگہمی شکست کا پیر
راز حیات ساغر دینا کہیں جسے

خسکی نے کر دیا اسکو رگِ جان سے قریب
جستجوِ ظالم کہے جاتی تھی منزل دور ہے

فریب دام کہ رنگ و بو مٹا ڈالے
یہ اہتمام ہے اور ایک مشت پر کے لئے
حقیقت ایک ہے صد ہا لباسِ عیش میں
نظر بھی چاہیے کچھ حسن نہ گذر کے لئے
بہائے دروہ و درد و غم کی لذت ہے
وہ ننگ عشق ہے جو آہ ہوا کے لئے
بنوں کے سن میں ابھی شان ہے خانی کی
ہزار عذر ہیں اک لذت نظر کے لئے

پھیرتی ہو کس رنگ و بون سے نگاہِ شوق کو
خود بہت باکیف تیری جلوہ گاہِ ناز ہے

اقبال

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام بھی
بے خطر کو دیرِ آتش نرود میں عشق
عقل ہے عورتا شائے لب بامِ اُبھی
عذر پر ہنسی کہتا ہے بگڑ کر ساقی
سے ترے دل میں ہی کاوشِ انجامِ اُبھی
خبرِ اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھر کتا ہے تہ دامِ اُبھی

پردہ چہرے سے اٹھا انجنِ آرائی کر
چشمِ مہر و نہ وانجم کو تماشا کی کر
تو جو بجلی ہے تو یہ چٹک نہاں کیسی
بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر
نفسِ گرم کی تاثیر ہے انعامِ حیات
تیرے سینے میں اگر ہے تو میحالی کر
اس گلستان میں انہیں صدمے گزرتا اچھا
ناز بھی کر تو بہ اندازِ رعنائی کر

دل ہی جائے گی کبھی منزل میں اقبال کوئی دن اوسا بھی باد یہ چٹائی کر

رہ دام بھی غزل آستانا رہے طائرانِ جن تو کیا
جو فضاں دلوں میں تڑپ رہی تھی نوائے زیرِ پایا
ترا جلوہ کچھ بھی تسلی دل تا صبور نہ کر سکے
وہی گریہ سحرِ می رہا وہی آہ نیم شبی

نہ آتے ہیں اس میں تکرار کیا تھی
تہا رہے پیامی نے سب داز کھولا
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تارا
تامل تو تھا ان کو آتے میں قاصد
کھینچے خود بخود جانب طور موسیٰ
ہائیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
خطا اس میں بندگی مرکار کیا تھی
تری آنکھ مستی میں ہمشیر کیا تھی
نگرہ بتا ملز انکار کیا تھی
کشش تیری اے شوق دیدار کیا تھی
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

لاؤں وہ تینکے کہیں آشیانے کے لئے
جمع کر خرم تو پہلے دانہ دانہ چن کے لئے
بجلیاں بیتاب ہوں جن کو جلانے کے لئے
آہی بکھے گی کوئی بجلی جلانے کے لئے

علاج درد میں بھی درد کی لذت پرتا ہوں
نہ پوچھو مجھ سے لذتِ خاناں برباد رہے
ہنیں بیگانگی اچھی رفیق راہِ منزل کے
جو تھے چھاؤں میں کائناتِ نوک سے غائب
نہیں سیکڑوں میں نے بنا کر بھونک اے
ٹھہر جائے شدر ہم بھی تو آخر ٹھٹھے والے ہیں

وہ میکش ہوں فروغِ مئے سے خود گلزارِ جن
چمن زارِ حبت میں خموشی ہوت ہے بلبل
ہو اے گل فراقِ ساقی ناہرِ بان لکے
یہاں کی زندگی پابندی رسمِ فغان لکے

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ستم جو کہ ہو و مدد بے حساسی کوئی بات، صبر آرزو چاہتا ہوں
کوئی آدم کا جہاں ہوں لہ اہل محفل چراغ سو ہوں بجیا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہدی بڑا بے ادب ہوں سننا چاہتا ہوں

مری نگاہ میں وہ رندی نہیں ساتی جو ہوشیاری و رندی میں امتیاز کے
کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بیگوتا ہے جو بے عمل پر بھی رہتا ہے بے نیاز کے

واعظ کمال ترک سے متی ہیاں مراد دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقی بھی چھوڑ دے
واعظ ثبوت لائے جوئے کے جوازیں اقبال کو یہ ضد ہے کہ پس بھی چھوڑ دے

میرے مشہر میں سبیل کے جوہر لیکن نیستان تیرا ہے فناک
ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے جس نے سینے میں نقد ہر کے چاک
کامل وہی ہے رندی کے فن میں مستی ہے جس کی بے منت ناک

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا میں ہی تو ایک لڑ تھا سیعہ کائنات میں

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر ہوش و خرد سرکار کرب و غم شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر
باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں کار جہاں راز ہے اب مرا انتظار کر
روز حساب جب مابیشل ہو ذکر عمل آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

گدائے میکہ کی شان بے نیازی دیکھ پہنچ کے چشمہ حیاں پر توڑتا ہے سب

میں فو نیاز ہوں مجھ سے حجابے راوی کہ دل سے بڑھ کے ہے میری نکاح دے نکاح

ملوثی سمجھ کے شان کرکھی نے چن لئے قہرے جوتھے مرے عرق انفکاک

فراق گورکھپوری

جرجھوئی بھی نہیں یا د بھی نہیں آتیں تری ٹھکانے کیوں وہ بہ نیش آتیں

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تنہا بھی نہیں
ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ نہیں
بہر بانی کو محبت نہیں کہنے لے دوست
آج غفلت بھی ان آنکھوں میں پہلے سے
لیکن اس ترک محبت کا بیڑا سا بھی نہیں
اور ہم بھول گئے ہوں تھے ایسا بھی نہیں
ہائے اب مجھ سے کچھ رنجش یہاں بھی نہیں
اور دل بھر نصیب آج شکیبا بھی نہیں

وہ ماجراے عشق بھی خواب و خیال ہے
مگر بھی اٹھیں ملا درود یار بھی مگر
تیری نگاہ سے جو ہوا تھایاں کبھی
کم ہو سکی نہ وحشت دندانیاں کبھی

جہتیں قیدیں گزریں مگر اب تک صیاد
کیا کہیں وہ ترے اقرار کو اقرار سے تھے
ہم اسیرانِ قفس تازہ گرفتار سے ہیں
کیا کریں یہ ترے انکار کہ انکار سے ہیں

تجھ کو اے موجِ صبا شوخی بہم کی قسم
زندگی تیرے تغافل نے بنا دی شکل
اس طرح پھیر کر ہر گل کو گلستاں کر دے
اب اے اے مگر یاد کچھ آساں کرے

جنھیں ہے ناز بہت اپنے طرف پر ساتی
تیری نگاہ ہے انداز ان کے پاسے لئے

نہ ازم نہم نہ پائشیں ہیں کس کے دامن کی
چراغ ویرود حرم بھی ہیں جھلملائے ہوئے
خواب دور نہ کر اب خواب حالوں کو
ہماری خاک سے دامن ذرا بچائے ہوئے
خیر ہر ہنر کہ سر حشر بھی نہیں چو کے
تری نگاہ کرم کے قریب کھائے ہوئے

بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم
جوتیرے یہر میں گزری وہ رات بات ہوئی
دیار دل میں یہ پوچھائیاں نہیں تیں
حرم عشق میں دن ہی ہوا نہ رات ہوئی

ابھی تو طبعیں سودہ نشیمن ہیں
گلہ کچھ اور ابھی رنگ و بو کے جاں بھاؤ
یہ عشق ہی کو خبر ہونہ حسن ہی جانے
کسی سے عالم مستی میں اس طرح کھل جاؤ
نہ پوچھ حسن کی باتوں میں کتنا ہے سلجھاؤ
ہماری دکھ بھری لے میں ہے کس قدر ٹھنڈاؤ
ترب کو ہم نے بنایا سکون بے پایاں

تجہ بھی کام محبت کے بہت نازک ہیں
دل وہی کار گم شیشہ گراں ہے کہ جتنا
منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں
وہی انداز جہان گذراں ہے کہ جتنا
دیکھ سکے کی انگ بات مگر حسن ترا
دولت دیدہ صاحب نظران ہے کہ جتنا

ہزار بار زمانہ ادھر سے گذرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہنڈ دھڑکھا

اپنے مقام پر رہیں عشق کی بے نیازیاں
گو در خلد بھی کھلے دل نے کہا کہ کون جائے
عالم حسن و عشق کی کون وہ بات ہے جسے
بھولیں اگر تو یاد آئے یا دکریں تو بھول جائے
گو ہمہ تن وہ جبر ہے کہتی ہیں مشیتیں
ہم سے بھی کچھ نہ بن رہے عشق جو اپنی خند لے
کشتی دل بچا ہے اتنا مگر رہے خیال
ڈوبے اگر تو پار ہو پار لگے تو ڈوب جائے

کئی نہ کی ترے وحشی نے خاک اڑانے میں
غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دلچسپ دوست
جنوں کا نام اچھلتا رہا زمانے میں
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

لنگاہ یا خبر تھی نہ ترے وعدوں کی
جو تو نے یاد دلایا تو مجھ کو یاد آیا

وہ شوخ کسی صورت اپنا بھی نہیں ہوتا
اور یہ بھی نہیں ممکن سمجھیں اسے لنگاہ

حسن اور عشق میں پیمان وفا ہوتا ہے
ذرسے ذرسے سے تلاطم سا پتا ہوتا ہے

کہہ کئی کیا ننگہ نماز تری ہم جس کو
ایسے دیوانے تھا دنیا میں لنگاہ کی کہیں
بات کی بات قسانے کا قسانہ سمجھے
لوگ اپنا جسے سمجھے نہ تمہارا سمجھے

کچھ بڑھ کئی وحشت اور مری زنداں سے نہ پائی پاتے ہی
کچھ حسرت صحرابھی ہے ، کچھ رنج در و دیوار بھی ہے
امید نہ دے پیش بھی کر، دے اور فریب حسن کوئی
مادیوں کا خرش بد جانا آسان بھی ہے دشوار بھی ہے
دن رات شگوفے کھلتے ہیں دن رات بہاریں شتی ہوں
تدبیر جنوں ، تقدیر چین ، ایام کی کچھ رفت بھی ہے
اک تارنگاہ کی جنبش سے شہ عشق کو دیتی ہے کیا کیا
وہ آنکھ جو مائل صلح بھی ہے کس مادہ پیکار بھی ہے
رہ رہ کے غلش بھی ہوتی ہے کچھ کشمکش دل بھی کم ہے
ستے ہیں فراق وہ تیر نظر دل میں بھی ہے دل کے پار بھی ہے

آج تو حسن و محبت ہو گئے تھے جس کے لاکر
 تو نے وہ عالم نگاہ ناز کا دیجھا نہیں
 لے اڑی تجھے کو نگاہ شوق کیا جانتے ہوں
 تیری صورت پر بھی اب تیرا لگا ہوا نہیں

نہ پوچھئے نہ غصہ ہستی کی وسعت تو تنگی
 جو چل پڑے تو بیابان جس کے تو زنداں ہے
 بہت قریب کہیں مسکرا رہا ہے کوئی
 رگ جنوں ہے، ارگ گل ہے یا رگ طبل ہے

یہ بزم عام بھی اسے دوست! بزم عام نہیں
 نکا ہیں اٹھتی ہیں سبکں کسی کسی کے لئے

ماٹھے پر ترے صبح چمن کھیل رہی ہے
 آنکھوں میں محبت کی کرن کھیل رہی ہے
 ناگن کوئی بل کھاتی ہے سہم کہ ہوا سے
 وہ زلف شکن زیر شکن کھیل رہی ہے
 پیراہن خوش وضع سے آتی ہے لپٹ سی
 ملبوس میں خوشبوئے بدن کھیل رہی ہے
 اس پیکر رنگین میں رہے شوخی نہاں
 بجلی نہ داماں چمن کھیل رہی ہے
 باتوں میں فراق اس کی معطر ہے نہایت
 ہر لفظ میں خوشبوئے دہن کھیل رہی ہے

دیکھ لیتے ہیں سبھی کچھ ترے شائقِ جال
 انھیں دیدار نہ ہو حسرت دیدار تو ہے

— ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
 تو نے تو خیر بے وفائی کی

چپ ہو گئے تیرے رونے والے
 دنیا کا خیال آگیا ہے

جوشِ ملیح آبادی

محلِ عشق میں فنا و نشِ دوہاں آیا اے گدا خوابِ بیدار کہ سلطان آیا
لے گئی! ناز سے کھل آبادہ سر جوشِ اہل کہ بھگارِ جن و مشاہدِ مستان آیا
فاطرِ جمع سے ہشیار کہ برہم ہو گئی زلف کشتیِ دل سے خمدار کہ طوفاں آیا
کچ کلاہی کا سرورِ بگ مبارک لے جوش بے پیام شکن طرہ جاناں آیا

گر زربا ہے ادھر سے تو مسکراتا جا چراغِ مجلسِ روحانیاں جلاتا جا
نگاہِ حیرت سے آفتابِ عالم پاک حقیرِ خاک کے زروں کو جگمگاتا جا
ملا کے فحش سے نظرِ عزتِ جنوں کی قسم چراغِ محفلِ عقلِ خرد بجھاتا جا
اسیر کر کے سیدہ کاکلوں کے حلقے میں کند عقلِ تنگ مایہ سے جھپٹاتا جا
اٹھا کے عارضِ گلگوں سے دو گھڑی نقا نظر سے ارض و سما کا حجاب اٹھاتا جا
مزاجِ پوچھ کے اے شاہِ عارضِ نکاحل گدائے راہ کی بھی آبرو بڑھاتا جا

چلائے سوئے حرمِ دل سے ساز کرتا جا طوافِ کعبہ حسنِ محباز کرتا جا
لے جو وقت تو لے رہرورہ اکسیر حقیرِ خاک سے بھی ساز باز کرتا جا

ادھر بھی بادِ صبا! آ بہار کی سوگند شمیمِ طرہ گلیوے یار کی سوگند
سکھا جمال کو ایفائے عہد کا دستور جھائے طولِ شبِ انتظار کی سوگند
ٹہر ٹہر کے منادِ استانِ عشوہ و ناز نزاکتِ دلِ امیدوار کی سوگند
نادے جوش کو بھی لہنائے لعلِ نگاہ خروشِ آمدِ فصلِ بہار کی سوگند

سخن فروشیاں نہ کر جہاں حسن و عشق میں
 کہ بیاں ہر ایک خال میں ہیں لاکھ نکتہ داناں
 وہ زیبِ نجس ہو اڑ سکئی بولتے نہیں
 معاشران بزم کیا ہوئیں وہ گلِ فشانیاں
 شبابِ رفتہ کے قدم کی چاپِ کُسن رہا ہوں میں
 مدیم! ہندِ شوق کی سارے چاکھانیاں

اللہ رے سنُ دوست کی آئینہ داریاں اہل نظر کو نقش بہ دیوار کر دیا
 مجھ کو وہ بخشے تھے دو عالم کی تمیں میرے غرورِ عشق نے انکار کر دیا

پہچان گیا سیلاب ہے اس کے سینے میں امانوں کا
 دیکھا جو سینے کو میرے جی چھوٹ گیا طوفانوں کا
 یہ کس کی حیات افروزِ نظر نے چھیر دیا ہے عالم کو
 ہر خاک کے ادنیٰ ذرے میں منکامہ لاکھوں جانور کا
 دنیا نے فسانوں کو بخشی افسردہ حقایق کی تلخی
 اور ہم نے حقایق کے نقشے میں رنگ بھرا افسانہ

مرا پیرہن نہیں چاک ابھی، مجھے رحم کھا کے سنگھابھی دے
 یہ ہنک جنوں کی بھری ہوئی ہے جو تیری زلفِ دراز میں
 یہ دغا کا رنگ شکستہ ہے، مرا حسرتوں کا یہ خون ہے
 یہ گلاب کی سی جو سرخیاں ہیں ترے تبسمِ ناز میں

اے شرق مجھے مراد نہ کر، شورش کے لئے اسباب نہیں
 امید کہ اجڑے گلشن میں اک بھول بھی اب شاداب نہیں
 اب دل کا سینہ کیا پتھر سے، طوفان کی ہوائیں نہاں ہیں
 ابہ بھر کے کشتی کیا کھیلے، موجوں میں کوئی کج داب نہیں

سید وحید الدین احمد بخود دہلوی

رق کا گرنا سنا، صیاد کا کہنا سنو
 چار سمکھوں کا اجڑنا، داتا ہوتا نہیں
 ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے یہ اس کے عشق کا
 مر گیا ہوں اور مرنے کا گماں ہوتا نہیں

جاٹے ہی ان کے گویا کچھ بھی تھا چمن میں
 جوش بہا رگل کو پا مال کر گئے ہیں

وعدے کا ذکر وصل بجا ادا وفا کا قول
 یہ سب فریب ہیں دل شیدا کے واسطے
 لے قبضہ کر یہ خاک میں مل جائے کاش تو
 آنکھیں ترس گئیں مری دریا کے واسطے
 وحشت یہ کہہ رہی ہے دل داغدار کی
 اس باغ کی بہار ہے صحرائے واسطے

نشانی ہم نے رکھ چھوڑی ہے اک انگلی بہاراں کی
 بہار آئی تھی میں ڈال لی دھجی گریباں کی

دردِ دل میں کمی نہ ہو جائے
 دوستی دشمنی نہ ہو جائے
 اپنی خوئے و فاسے ڈرتا ہوں
 عاشقی سب دگی نہ ہو جائے
 بیٹھا ہے ہمیشہ رندوں میں
 کہیں زاہد ولی نہ ہو جائے

مرزا حنیف علی خاں آرزو لکھنوی

ہم نے رورے رات کافی ہے آنسوؤں پر یہ رنگ تب آیا

چل گیا اس نگاہ کا جادو کہہ گئے دل کی بات کیا کہیے

۸ آرزو لکھنوی

جو سینے میں دل ہے تو بار محبت اٹھیا نہ اٹھے اٹھانا پڑے گا

رہنے دوستی تم اپنی دکھ جھیل چکے دل ٹوٹ گیا
اب ہاتھ ملے سے ہوتا ہے کیا جب ہاتھ سے ناوک چھوٹ گیا

لطف بہار کچھ نہیں گز رہی بہار دل کیا اجر دے گا کہ زمانہ اجر گیا

۹ ہادی پھلی شہری

درد سا اٹھ کے نہ رہ جائے کہیں دل کے قریب
میری کشتی نہ کہیں غرق ہو ساحل کے قریب

معین احسن جذبی

فیضِ غم بے سبب نہیں جذبی خلشِ دل بڑھاتا ہاں میں

سوال شوقی پر کچھ اُن کو اجنبی ہے جواب یہ تو نہیں ہے مگر جواب ہے

مرنے کی تمنا کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا، اب خواہش دنیا کون کرے
جب شستی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے
جو آگ لگائی تھی تم نے، اس کو تو بجھایا آشکوں نے
جو آشکوں نے بھڑکائی ہے، اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

مرزا یگانہ لکھنؤی

سمجھتے کیا تھے، مگر سنتے تھے تراؤ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو بھر سنا دیا
کروں تو کس سے کروں دردِ مار کا گم
کہ جھکے کے دل دوست میں سمانے لگی
بلکا تار ہا کس کس کو ڈوبنے والا
خدا تھے اتنے مگر کوئی آڑے نہ گیا

دل بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھنڈی کامیاب
وہ آسو کیا پائے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا

دھواں صاحبِ نظر آیا سوا دُنزل کا
نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواںِ دل کا
کبھی تو مچ میں آئے گا تیرا دیوانہ
اشارہ چاہئے ہے جنبشِ سدا کا

ازل سے اپنا سفینہ رواں رکھ دھاری پر
ہوا ہنوز نہ گرداب کا ذمہ سہاوی کا
جواب حسن طلب کے دلوں سے بن نہ پڑا
حیائے گڑبگڑے جب نام آگیا دل کا

ترپ کے آبلہ یا اٹھ کھڑے ہوئے آخر
تلاش یار میں جب کوئی کارواں نکلا

جس نے مردہ منزل سنا کے چونکایا
نکل چلا تھا دیے پاؤں کا رواں اپنا

نہ بخیر پھر بلا دی نسیم بہارتے
پیر بہ آب سے تراویں ہو گیا
کیا جانے آج خواب میں کیا دکھایا سنے
کیوں چننے ہی آپ کے بیگانہ ہو گیا

دل آگاہ نے جب راہ یہ لانا چاہا
ناگماں جھج ستم گارنے کڑوٹ بدلی
جذبہ شوق نے جب عشق کی صورت بدلی
پھر مٹائے نہ مٹا لاکھ مٹانا چاہا

وحشیو! کیوں نگدل ہو فصل گل آنے تو دو
غنجہ غنجہ میں بہار صد گریباں دیکھنا

یہ دل بے مدعا بیگانہ امید و بیم
عشق کا حسن طلب اک معنی بے لفظ ہے
غرق ہو کر آپ اپنا ناخدا ہو جائے گا
ننگی بندھ جائیگی مطلب دا ہو جائے گا

اہل دل مست ہوئے پھیل گئی بے وفا
بیرہن چاک ہو اجب ترے دیوانے کا

انحرایوں کے ساتھ کہیں دم نکل نہ جائے
آساں نہیں ہے رنج اٹھانا خمار کا

۴۴۷
دیکھو تو اپنے وحشیوں کی جانہ میاں اللہ رحمت حسن پیر ہن تار تار کا

خواب کیا فہمی آواز باز گشت آئی
امید و بیم نے مارا مجھے دور ہے پر
قفس میں نالہ جاں کاہ کا مہر نہ ملا
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا
گناہگار ازل کو نیا بہانہ ملا

بسی ہے نہکت آوارہ کن زک زماغوں میں
دکھائی جلوہ موہوم نے کیا برق زقاری
مبارک ہستی برباد پر خسرو ہو جانا
پلک چھبکاتے ہی حد نظر سے دور ہو جانا
پٹ کر شمع سے آخر سر پا نور ہو جانا

عالم شوق میں اسیر ہوئے باہرک سے
ہول ہی و ساقی استقامت کا دم کل نہ جائے
جل بے آمد آمد فصل بہار دیکھ کر
صبح کو تیری آنکھ میں کیف خمار دیکھ کر
محو طلسم بندی نقش و نگار دیکھ کر
سو جھا پھر آنکھ سے نہ کچھ فنرل یاد دیکھ کر

نگاہ شوق سے کیا کیا گلوں کا دل دکھاتا ہے
زمانے کی ہوا بدلی نگاہ آشت بندلی
ساد ازنگ و بواڑ جائے یا مال نظر موکر
انکھے محفل سے سب بنگانہ شمع سحر ہو کر

خدا جانے اجل کو پہلے کس پر رحم آئے گا
گرفتار قفس پر یا گرفتار شمع پر

دور ہی جاتی ہے گھٹا سوئے چمن بادہ کٹو
پردہ غیب سے ہونے لگی تدبیر بہار

چشم پرخوں نے محسم کر دیا موہوم کو
ورنہ بے تعبیر تھا خواب پریشان بہار

خار و گل دونوں کو اپنے بانگین پر ناز ہے دیکھئے رہتا ہے کس کے ہاتھ میدان بہار
اپنے اپنے رنگ میں اور اپنے اپنے خال میں کوئی حیران خزاں کوئی بیش مان بہار
دیکھ لیتا ہوں چین کو دور سے بیگانہ وار یا اس مجھ سے کیوں کھٹکتا ہے گہمان بہار

یاؤں ٹوٹے ہیں مگر آنکھ ہے نزل کی طر کاں اب تک ہوس بانگ دراز تے ہیں
موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی لے دعا کر چلے اب ترک دعا کرتے ہیں

الٹی ہوا زمانے میں چلتی ہے آج کل فرق آگیا ہے گردش لیل نہاریں
نمزل کی دھن میں آبدی پامل کھڑے تھے خود رجز سے دل نہ رہا اختیار میں

چھوڑ کر جایں کہاں اب اپنے ویرانے کو ہم کون سی جا ہے جہاں حکم خزاں جاری نہیں
صبر کہتا ہے کہ فتنہ رفتہ مٹ جائے کا داغ دل یہ کہتا ہے کہ بجھنے کی یہ چنگاری نہیں

سنتا ہوں آپ خانہ دل میں میں جلوہ گر دیوار درمیاں ہے مگر کچھ خبر نہیں
کعبہ نہیں کہ ساری خدائی کو داخل ہو دل میں سوائے یا کسی کا گزر نہیں

شش جہت میں ہے تیرے جلوہ بے فیض کی ہجوم
کان محبم میں مگر آنکھ گستاخ نہیں

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری مانے میں یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں
دیواریں پھاند پھاند کھدوانے جل ہے خاک اڑ رہی ہے چار طرف قید خانے میں
رہ رہے جیسے کان میں کہتا ہے یہ کوئی ہوں گے نفس میں کل جو ہیں گج آشیانے میں

گلا گھٹنے لگا اب تنگا۔ آیا ہوں گریباں سے جنوں نے واہ کیا پھانسی لگائی میری گردن میں
بہت دست جنوں نے گد گدایا جب تک کیا کرتے آئیں بیڑیاں اور پہنے دوسرے طوق گردن میں

ایسا نہ ہو کہ تھک کے کہیں بیٹھ جائے دل دیر و حرم میں گم نگہ نارسا نہ ہو

حیرت نے شش بہت میں نظر بند کر دیا نامحرم طلسم خندان و ہزار کو
اللہ رے اختیار نہ آ مادہ سحر بسا فکر محال کہہ دل بے اخذت رکھو

اسیڑوں کی یہ خاموشی کسی دن رنگ لائیگی قفس سے چھوٹ کر سر پر اٹھائیں گے گلستان کو
مزاج حسن بدلے آسماں بدلے زمین لے سزائے عشق کیا بدلے گی ذوق ناپیشیاں کو

آ رہی ہے یہ صداکان میں دیوانوں سے کل کی ہے بات کہ آیا دتھے دیوانوں سے
آج ہی کل میں ہے چلنے کو نسیم وحشت تنگ آنے لگے دیوانے گریبانوں سے

بقدر حوصلہ ملتی ہے داو عشق و ہوس مزاج حسن میں کیا اعتدال ہوتا ہے

گم ہوئے پوش و حواس ایسے محیط عشق میں ڈوبنے والوں کو اب نہ پر ہنگام ساحل کا ہے

غبار بن کے پستی ہے دامن دل سے شے یہ بھی وہی دل بستگی بہار میں ہے
دعاے شوق تجا ایک ہاتھ ہے دل پر اور ایک ہاتھ گریباں تار تار میں ہے

دور سے ان کو آج دیکھ لیا دل کو تسکین ہوئی مگر نہ ہوئی

آنکھوں آنکھوں میں بے لیا وعدہ کاؤں کان ایک کو خبر نہ ہوئی

نظارہ رخ لیلیٰ مبارک اے مجنوں نگاہِ خوق نے پردے اٹھائے محل کے

ناخدا کو نہیں اب تک تہ دریا کی خبر ڈوب کر دیکھے تو بیگانہ ساحل ہو جائے

ہنس کے کہتا ہے کہ گھر اپنا قفس کو سمجھو بسن الثا مرا صیاد پڑھا تا ہے مجھے
لب دریا کا ہوا میں نہ تہ دریا کا ناخدا کوں سے گھاٹ اب لئے جاتا ہے مجھے

ہاں وسعت زنجیر تک آزاد ہوں میں ہستی مری مجموعہ اصداد رہے گی
ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

نظام دہرنے کیا کیا نہ کروئیں بدلیں مگر ہم ایک ہی پہلو سے بے قرار ہے

خزاں کے دم سے شاخ و زیت کا جھگڑا چلو یہ خوب ہوا گل رہے نہ خار ہے

دل اپنا جلاتا ہوں کعبہ تو نہیں ڈھاتا اور آگ لگاتے ہو کیوں تہمت بجائے
لے رہی ہوں بے پروا شکل مری آساں کر کیوں آنکھ جراتا ہے گم گشت تہنہ سے
کیوں نہکت آوارہ جاے سے نہ ہو باہر کس دن کو وفا کرتی ہیں سوا سے
حیراں ہیں نظر و لے بیتا بی بی لالے کچھ رنگ تماشا سے چمچہ تو بے تنہا سے

کھیل بے حسن نظر کا شمع کیا پرواز کیا دل بے جیتک دل جھی بیک روشنی محفل میں ہے
باز آساں غلطی کھانے والے آساں آساں بے مرنے کا مزہ دنیا بے بساں میں ہے

